آگ کا دریا
جلد اول
قرۃ العین حیدر
KURF
جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم دانش

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

ناول

آگ کا دریا

از

قرۃ العین حیدر

بشکریہ

اقبال سائبر لائبیری

تعارف،سرورق،ترتیب و پیشکش

محمد علی جنید

www.facebook.com/kurf.ku
www.kurfku.blogspot.com

جامعہ کراچی دارالُتحقیق برائے علم و دانش

Karachi University Research Forum

تعارف

از:محمد علی جنیدؔ:ریسرچ اسکالر،شعبہ سیاسیات،جامعہ کراچی۔

قرۃ العین حیدر کا نام اردو ناول نگاری میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے لکھنوی تہذیب کے ضمن میں انکی تحریریں لکھنو کی اگر چہ یادیں اور تاریخ تو ضرور یاد دلاتی نظر آتی ہیں ، مگر ان میں جو امر انھیں منفرد بناتا محسوس ہوتا ہے وہ انکا سلیس ،آسان اور عام فہم انداذ ہے جس میں لکھنوی ادب و طرز کلام کے برخلاف سلاست،روانی،ربط و ضبط کا پایا جانا ہے،لکھنوی میں نے اس لئے کہا کہ انکی تحریروں میں لکھنو ،اسکے نوابوں انکی تشیعت کی بابت اشارے وہ گفتگو اکثر چھلکتی نظر آتی ہے ،اور خصوصاً آگ کا دریا میں ایسا اکثر نظر آتا ہے،اور خود انکی بھی اہل تشیع حضرات سے وابستگی کا اتا پتا معلوم ہوتا ہے،مگر کہیں بھی وہ عقائیدی تعصب کی خبر لگنے نہیں دیتی ہیں ہاں جدید نسائیت ،لبرل فکر کی طرف انکا جھکاو واضح لگتا ہے۔

اس پیرائے میں انکی بھلے لکھنو سے انسیت رہی ہو مگر انکا طرز کلام جدید دھلوی انداز کا طرزِ کالم نظر آتا ہے،مگر بحر حال وہ مولد کے لحاظ سے یو۔پین و علیگڑھی ہیں اور فکری لحاظ سے لکھنوی۔

انکا تعارف کرانا میں ضروری جانتا ہوں کیونکہ اس سے انکے پس منظر کا اندازہ قایم کرنا آسان محسوس ہوگا،جہاں تک خاندان کا تعلق ہے تو واضح رہے کہ انکا خاندان اردو ادب میں ایک معروف خاندان تھا بلخصوص افسانے اور مختصر کہانی نویسی میں جانا مانا جاتا تھا ۔

حیدر، مرحوم سجاد حیدر یلدرم (۱۸۸۰ تا ۱۹۴۳) کی دختر تھیں ،جنکا شمار برصغیر کے اولیں ،افسانہ اور مختصر کہانی نویسوں میں کیا جاتا ہے،خود سجاد حیدر کی زوجہ اور قرۃ العین کی والدہ محترمہ بھی اول اول بنتِ نظرالباقر اور نظر سجاد ظہیر (۱۸۹۵ تا ۱۹٦۷) کے قلمی نام سے لکھا کرتی تھیں ،اس ضمن میں وہ ناول نگاری میں محمدی بیگم اور ممتاز علی کے زیر تربیت بیان کی جاتی ہیں۔

قرۃالعین حیدر (۱۹۲۷ تا ۲۰۰۷) بمقام علیگڑھ،اتر پردیش (یو ۔پی) میں پیدا ہوئیں اور بمقام نوئڈا انکا ارتحال ہوا،اندر پرستھ ،کالج اور جامعہ الہٰ آباد کو انکے مادر علمی ہونے کا شرف حاصل ہے،انھونے مختصر کہانی نویسی اور ناول نگاری میں اردو ادب میں اپنا لوہا منوایا،انھونے قریباً بارہ کے قریب ناول و ناولٹ تحریر فرمائے جبکہ چار مختصر کہانی کے مجموعے بھی انکے طبع ہوئے انکا سب سے عظیم شاہکار آگ کادریا نامی ناول ہے جو تین جلدوں میں طبع ہوا:

انکی خاص الخاص تحریریں درج ذیل بیان کی جاتی ہیں :

عدد	ادبی کارنامے	سنہ
۱	آگ کا دریا	
۲	میری بھی صنم کہانی	۱۹۴۹
۳	سفینا ئے غمِ دل	۱۹۵۲
۴	پتجھڑ کی آواز	۱۹۶۵
۵	روشنی کی رفتار	۱۹۸۲
۶	مختصر ناول :چائے کا باغ	۱۹۶۵
۷	exploring gender injustice ،دلربا، سیتا ہرن، اگلے جنم موہے بیتیا نا کیجیو: نامی ناولٹ وغیرہ	
۸	خاندنی تاریخوار آب یتی:جہاں دراز ہے،	
۹	۱۸۵۷ کے پس منظر میں شرفا کے خاندانوں کے عورتوں کی حالتِ ذار پر ایک ضخیم دستاویزی ناول بنام :کارِ جہاں دراز ہے	
۱۰	آخری شب کے ہمسفر:جسمیں بنگال اور نکسال بغاوتی نما تحریکِ آزادی کو بیان کرتی منظر کشی عیاں کرتا ناول	
۱۱	چاندنی بیگم :تقسیم کے چالیس سالوں کے نسائی پسِ منظر کو عیاں کرتا ناول	
۱۲	میرے بھی صنم خانے :اولیں ناول	
۱۳	انھونے کم عمری میں بچوں کے ادب کے ضمن میں بی چوہیا نام ایک کہانی بھی رقم بند فرمائی تھی	

انھیں انکی خدمات کے ضمن میں جن اعزازات سے نوازا گیا ان میں خاص الخاص درج ذیل ہیں :

عدد	ایوارڈ	سنہ
۱	جنپتھ ایوارڈ برائے آخری شب کا ہمسفر	۱۹۸۹
۲	ستھیا اکیڈمی ایوارڈ	۱۹۶۷
۳	سویت :نہرو ایوارڈ:	۱۹۶۹

۴	غالب ایوارڈ	۱۹۸۵
۵	ستھیا اکیڈمی ایوارڈ:برائے :پتجھڑ کی آواز:ضمن :مختصر مجموعہ کہانی نویسی	۱۹٦۷
٦	اردو اکیڈمی:بہادر شاہ ظفر ایوارڈ	۲۰۰۰
۷	بھارتی حکومتی:پدما شری ایوارڈ	۱۹۸۴
۸	بھارت کے تیسرے سب سے بڑے سول اعزاز:پدما بھوشن	۲۰۰۵

انکی پیشہ وارانہ خدمات ادب،تعلیم اور صحافت تک محیط نظر آتی ہیں :

	خدمات	سنہ
	انتظامی ایڈیٹر :رسالہ :امپرنٹ [1] :بمبئی	۱۹٦۸..۱۹٦۴
	رکن مجلس ایڈیٹوریل :السچریٹیٹ ویکلی آف انڈیا[2]	۱۹۷۵..۱۹٦۸
	تعلیم:	
	جزوقتی مہمان لیکچرار[3]: جامعات:جامعہ کیلیفورنا،جامعہ شکاگو،جامعہ وسکونسن ،اور جامعہ ایریزونا	
	دورہ جاتی پروفیسر [4]برائے شعبہ اردو،جامعہ علیگڑھ ،بھارت	
	پروفیسر ایمرٹس [5] :خان عبدالغفار چییر :جامعہ ملیہ،نئی دھلی	
	بین الاقوامی تحریری پروگرام:ریزیڈنٹس[6]	۱۹۷۹

انھونے اگر چہ اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان ہجرت کی تھی اور اسکے لئے دلایل بھی دئے تھے جیسا کے آگ کا دریا میں انھونے آخری صفحات میں اس امر کی تصویر کشی بھی کی ہے ،اور وہاں پر رہ جانے والوں کی مالی و سماجی حالتِ زار پر بھی روشنی ڈالی ہے مگر لگتا ہے پاکستان مین چلتی تعصبانہ ،لسانیت،و صوبائیت ،ذہنی

[1] Imprint.
[2] Illustrated weekly of India.
[3] Visiting Lecturer
[4] Visiting professor
[5] Professor Emeritus.
[6] Resident.

صـــورتحال و جمود کے ســـبب انھونے واپس بھارت جانے کو ترجیع دی،کچھ انک دلی وابستگی بھی اجداد کی سرزمیں سے تھی۔

کچھ عرصہ انگلستان میں بھی رہایش پزیر رہھیں جیسا کہ انکا کردار روپا بھی انگلستان کی فضـاوں میں بسلسلہ تعلیم اور فکری غذا کے لئے سـرگرداں نظر آتی ہے ،کچھ انکی طبیعت کی تیزی،انا پرستی،یا اصول پسندی کی روش کے سبب ان میں خاص حریت نمایاں رہی ہے جســکا ایک اثر روپا کے کردار میں نظر آتا ہے جو چار اہم کرداروں میں ســـے واحد مگر اہم نسائی کردار ہے جو آگ کا دریا میں نظر آتا ہے۔

یہ ناول ایک دیو مالائی ناول ہے جسکا آغاذ قبل تاریخ چوتھویں یا پانچویں قبل مسیح کے ہندوستان سے ہوتا ،جہاں وہ چندرگپت موریا،اور چانکیہ کا ضمناً تذکرہ کرکے کرداروں کو ارتقائی طور پر تقسیم پاکستان تک چار کرداروں کے ضـمن میں دکھاتی نظر آتی ہیں ،اور یہ چار کردار،کمال الدین،روپا،سیرل صاحب،اور گوتھم کے ہیں اس ناول میں جا بجا ہندو دیومالائی رنگ،ہندوی فسلفہ،واحدۃ الوجود،تصـوف،تاریخ کو اپنے پلاٹ کے ضـمن میں پیش کرکے اپنے کرداروں کا مختلیف وقتوں میں ارتقا کرتا دکھایا گیا ہے یہاں تکہ تقسیم ہوکر ہندوستان، پاکستان و ہندوستان میں منقسم ہوجاتا ہے ہر کوئی اپنی اپنی دنیا میں مست زمانے میں ضم ہوجاتا ہے سوائے ان چار کرداروں کے۔

روپا اور اسکے کرداروں کےضمن میں لگتا ہے روپا کے کردار کی اصل قرۃ العین حیدر ا پنے کسی کزن سے عشق تھا جس سے وہ ذہنی ہم آہنگی کا نا ہوسکی یا انکو غالبا انا کی روپائی فکر، انکی کچھ مجبوریوں کے سبب وہ شـادی نا کرسکیں اور کنواری رہ گئیں مگر ،ہمیں اسکے حقیقی ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بس اتنا ہے کے خاندانی خود نوشـتوں اور کرداروں کی کچھ اصـل پر شـک بھی ہوتا ہے ،ظاہر ہے تخیلی کرداروں کی کچھ نا کچھ اصل موضوعیت کے ضمن میں خالق تحریر کے اذہان میں پس پشت کرداروں کاتعین کرتی رہتی ہے ۔

میں یقین سے تو دعویٰ نہیں کرسکتا نا میں کوئی ادیب یا اردو ادب کا ناقد ہوں اور نا میرا اس قسم کا سرے سے دعویٰ ہے مگر آج جو اردو پاکستانی ادب جسکا چلن یہاں عام ہے وہ تاریخی و دیومالائی ناول ہیں جن میں ایک عجب سا سحر ،جاذبیت،پرسرارئیت

ارتقا ملتا ہے جس کی ایک پوری ادبی فصل یہاں تاریخی و دیومالائی ناول نگاری کے ضـمن میں انوار صـدیقی، قمر اجنالوی، اسـلم راہی، ایم۔ آصـف،ایم۔اے۔راحت جیسـوں کی صورت میں نظر آتی ہے اسکی اصل روح کہیں نا کہیں آگ کا دریا سے اخذ کردہ ہے۔

خود میں نے آگ کا دریا کچھ سال قبل اس تجسس کے ساتھ پڑھا تھا کہ اس میں ایسا آخر کیا ہے کہ اتنی واہ واہ کی جاتی ہے،جبکہ مذکورہ بالا ناول نگاروں کو میں اپنی کم عمری میں پڑھ چکا تھا۔

مگر آگ کے دریا کا تقدم زمانی اور انداز بیان مجھ کو یہ ادراک کرواگیا کہ ان سب کی ممکن ہے کہ اصل حیدر صاحبہ کی ہو ،کرف کے تحت اگر چہ ہم نے جدیدیت،فلسفہ،علم کلام،معاشرتی علوم ،معاشیات و سیاسیات کے میں ۲۰۱٦ میں کئی برقی مطبوعات پیش کیں تھیں ،مگر میں اپنے مزاج ،مذہبیت،اور علمی تحقحقات کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے فروغ میں بھی دلچسپی کو بھی پس پشت نہیں ڈال سکتا تھا ۔

جبھی فکر ساز ادبی کتب و تراجم کو بھی پیش کرنے کا سلسلہ قایم کیا اور ۲۰۱۷ میں قرۃ العین حیدر کی یہ کتاب مذہبی،فکری،اختلاف جدیدیت،الحادیت ،مغربیت کے خلاف ہمارے جہاد کے باوجود نسائیت ،جدید دور کی عورت کی فکر ،ذہنی پرواز،قدامت سے جدیدیت کی طرف سفر اور ماضی سے عشق کو عیاں کرتی ہے جبھی اس ضمن میں ادب کو پڑھنا لازمی ہے ،لکھنے،پڑھنے،بولنے ،تہذیب کے سیکھنے اور تخیل کی پرواز کا اندازہ کرنے کے لئے ادب کا مطالعہ لازماً کرنا چاہئے یہ کوئی مذہبی صحیفہ نہیں ہے جبھی اس سے مذہبی مواد و عقاید کی توقع بھی وابستہ نا کی جائے،اسے ادب ہی کی طرح لیا جائے اور ادب کی طرح پڑھا جائے۔

مجھے کئی اہل علم نے بتایا ہے کہ خود عربی و فارسی قدیم ادب میں بھی عشق و محبت ،رزم و بزم ،فطرت کی تصویر کشی کے ضمن میں ایسی ایسی تحریریں ملتی ہیں جنکو شاید کوئی مذہبی پیرائے میں انھیں فحاشی و عریانی،اور جزبات کو برانگیختہ کرنےوالا گردانے ، مگر انکا ادبی مقام مسل ہے اور علما بھی اکثر صرف و نحو،اشعار ونثر کے ضمن میں ان سے دلایل لیتے ہیں ،امرا و لقیس یا لیلی و مجنوں ،یا سبعہ معلقات میں بھی ڈھونڈنے کو بہت کچھ مل جاتا ہے۔

متبنی کا کلام بھی ایسے اشارے دے جاتا ہے باقی،حافظ،خیام،رومی سے بھی یہ سب ڈھونڈنھے سے مل جائیگا بس فکر و نظر کا اختلاف ان میں اپنا اپنا مطلوب ڈھونڈھنتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کی یہ تحریر تین جلدوں میں پیش کی جارہی ہے ،اور میں دقیق و مشکل ،بے کیف فلسفیانہ فکر کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی ذہنی سکون کے لئے ایک ذہنی دوا و طریقہ گردانتا ہوں ۔

اس تحریر سے خیر مصنفہ کی نسائیت سے وابستگی کے ساتھ ساتھ اجداد و اکابر کی فکر سے عشق و وابستگی بھی چھلکتی نظر آتی ہے ،اس میں جو آواگون کے تحت چار کردار دکھائے گئے ہیں، انھیں تخیل کی پرواز تک ہی محدود کرکے مذہبی عقائید کی فکر و نقد سے دور رکھیں تو بہتر ہوگا۔

اور بستر پر دراز خود کو بس گنگا جمنا کے دیس میں ملاح کے چلتے چپووں کے زیر سایہ کشتی پر دراز دیکھیں اور پانی کی چھینٹوں سے دامن بچائیں رکھیں اور اسکی چاشنی و شیرنی کے ساتھ ساتھ ہلکا ہلکا غم اسکے کرداروں کی صورت میں محسوس کریں۔

قرۃ العین حیدر کو سب پیار سے عینی آپا کہتے تھے،وہ ۲۰۰۷ مین بمقام نوئیڈا بعارضہ مرض جگر انتقال فرماگئیں اور انھیں جامعہ ملیہ دھلی کے قبرستان میں سپرد خاک فر مایا گیا:

ذیل کے کچھ نمونے انکے اس شاہکار آگ کا دریا کے کرداروں کے مختصر پہلووں کے ساتھ ساتھ انکے طرز کلام کی عکاسی کرتے نظر آئینگے :

جلد اول: آغاز:

گوتم نیلمبر نے چلتے چلتے پیچھے ٹھٹھک کر دیکھا، راستے کی دھول بارش کی وجہ

سے کم ہوگئی تھی، گو کہ اس کے اپنے پاؤں مٹی سے اٹے ہوئے تھے..برسات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرد کے رنگ کے دکھلائی پڑ رہے تھے، اسوک کے نارنجی اور سرخ پھول گہری ہریالی میں تیزی سے جھلملاتے تھے اور ہیرے کے ایسی جگمگاتی پانی کی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں..ندی کے پار پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائے گی..گوتم کو خیال آیا گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں..اور برگد کے نیچے کسی من چلے ملاحنے زور زور سے ساون الاپنا شروع کر دیا تھا، آگے جھرمٹ میں ایک اکیلا مور پر پھیلائے کھڑا تھا،شراوستی یہاں سے پورے پچیس کوس دور تھا اور گوتم نیلمبر کو ندی تیر کر پر کرنی تھی گھاٹ پر تین لڑکیاں ایک طرف بیٹھی باتیں کر رہی تھیں، ان کے ہنسنے کی آوازیں یہاں تک آرہی تھیں۔لڑکیاں کتنی باتونی ہوتی ہیں، گوتم نے سوچا، انہیں بھلا کونسے مسئلے حل کرنے ہیں، اس کا دل چاہا کہ نظر بھر کر انہیں دیکھ لے.... خصوصا اس کیسری ساڑھی والی کو جس نے بالوں میں چمپا کا پھول اڑس رکھا تھا..اسکے ساتھ نچلی سیڑھی پر جو لڑکی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی..اسکے گھنگھریالے بال تھے اور کتابی چہرہ اور جڑی ہوئی سیاہ بھنویں.قریب پہنچکر گوتم نے ان دونوں کو لحظہ بھر کے لیے دھیان سے دیکھا اور پھر جلدی سے نظریں جھکا لیں گھاٹ کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے تیزی سے چھلانگ لگا دی اور دوسرے کنارے کی طرف تیرنے میں مصروف ہو گیا

لڑکیوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا کوئی ودیارتی تھا جان پڑتا ہے، ان میں سے ایک نے کہا..ملاح اپنی اپنی ڈونگیوں میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا انتظار کرتے رہے، کشتیاں جو برگد کے سائے میں بندھی تھیں ان میں چولہے روشن کیے جا چکے

تھے اور رات کا کھانا بننا شروع ہو چکا تھا
ٹپ سے بارش کا ایک قطرہ چمپا کے بالوں پر آن گر گرا، اس نے ندی کی اور
دیکھا جدھر وہ اجنبی طالب علم لہروں کے خلاف ہاتھ پاؤں مارتا کسی انجانی سمت جا
رہا تھا

ایک جگہ لکھتی ہیں کہ :

لیکن گوتم اپنے گرو کا نہایت فرمانبردار اور عقیدت مند چیلا تھا اور گرو کے
احکام کی تعمیل کرنا اس کا ایمان تھا لہٰذا جب کبھی وہ شراوتی کے ناچ گھر یا قمارخانے
کی عالی شان عمارت کے سامنے سے گزرتا تو اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا کرتا

دوسری جگہ رقمطراز ہیں کہ :اور بدھا کے طرف اشارہ دیتی ہیں؛

سارے ملک میں مختلف حیثیتوں کی حکومتیں موجود تھیں..جنوب کے راجہ بھوج
کہلاتے تھے...شمال کے وراٹ اور مغرب کے سوراٹ لیکن سامراجیہ کی داغ بیل
مگدھ میں پڑنی شروع ہو چکی تھی..یہاں کے بادشاہ مدتوں سے سمراٹ کہلا رہے
تھے..جس عالمگیر قومیت اور شہنشاہی کے تصور کا ذکر نجی شاستروں میں کیا جا رہا تھا
..اس کو قائم کرنے کے لیے کوئی ایکرٹ بادشاہ جو کہ سارے ملک کا بادشاہ ہو ابھی
تک پیدا نہیں ہوا تھا..چکرورتی بادشاہ....جس کی مملکت کے ساتھ رتھ کا پہیہ بغیر کسی
رکاوٹ کے چلتا رہے
اور شاکیہ منی نے کہا تھا...میں شہنشاہ ہوں اے سیلا...میں نے اچھائی کے رتھ
کا چکر چلایا ہے....

<u>بعد ازاں وہ ایران کی تاریخی حقیقت و قدامت کا حال بیان کرتی ہیں :</u>

ایرانی سلطنت بہت زبردست تھی... اتنی زبردست کے ایک لمحے کے لیے بھی اسے احاطہ تصور میں نہ لایا جا سکتا تھا... اس سامراج میں مصر اور بابل اور شام اور ایشیائے کوچک اور یونان کے شہر اور جزیرے اور سپت سندھو کے اترا پتھ صوبے سبھی شامل تھے اور سریوش کے بعد دارا نے کہا تھا.. میں دارایوش ہوں.. شہنشاہ.. شاہوں کا شاہ.. ملکوں کا بادشاہ جن میں بھانت بھانت کے انسان بستے ہیں... اس وسیع و عریض زمین کا حاکم... گشتاسپ اک بیٹا.. ایرانی... ایرانی کا بیٹا.. آریہ... آریہ گھرانے کا فرزند... اور اس کے جہازوں کے بیڑے مقدس سندھو کی لہروں پہ تیرتے تھے...

اور دارایوش اول کے بیٹے ارتخشیر نے اترا پتھ کی ان مقبوضات کے متعلق فخریہ اعلان کیا تھا... یہ علاقے جہاں دیو پوجے جاتے تھے.. اہورمزدہ کی خواہش کے مطابق میں نے ان م دیوں کے مندروں کی بنیادیں ہلا دیں...

<u>اب اچانک سے تاریخی جست لگا کر وہ کمال الدین کے کردار کے ساتھ چمپا کو دکھاتی نظر آتی ہیں ؛</u>

''جانتی ہوں مگر پھر یہ تلوار کیوں باندھتے ہو۔۔یہ بڑی خوفناک چیز ہے۔''

''چمپا رانی اسے مردوں کا زیور کہتے ہیں۔ اس کے اور پگڑی کے بغیر لباس مکمل نہیں ہوتا۔ تم اودھ والوں نے افسوس کہ چتوڑ اور قنوج اور مالوے اور بندھیل کھنڈ کے راجپوت نہیں دیکھے۔ دیکھے ہیں کبھی! ایک مرا یار ہے اودے سنگھ راٹھور۔ قنوج کا راجپوت ہے۔ کیا بانکا آدمی ہے۔ آج کل جانے کہاں ہوگا۔ سنا تھا گوالیر کے کرت سنگھ کی فوج میں ہے۔ پتا نہیں شاید مالوے میں کہیں لڑ بھڑ رہا ہوگا۔'' کمال الدین چند لمحوں کے لیے اپنے میدان جنگ کے ساتھیوں کی یاد میں ڈوب گیا۔ ''تم پورب والوں کا اس کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں کہ بس گائیں بجائیں گے، پوجا پاٹ میں لگے رہیں گے۔ ارے لڑکی زندگی کا اصل لطف تو میدان جنگ میں آتا ہے۔''

''ابھی تو تم کہتے تھے کہ مارنا مرنا خالی افغانوں کا کام ہے۔ تم کو یتا لکھتے ہو۔''

وہ جھنجھلا گیا: ''تم عورتوں سے بحث کون کرے۔'' اس نے امر بیل کا ایک پتا اور توڑا۔

''دیکھو'' لڑکی گھاٹ پر سے اٹھی اور اپنے سیاہ لمبے بالوں میں سے پانی جھٹک کر ان کا جوڑا بناتے ہوئے بولی، ''جنگ کی باتیں مت کیا کرو۔ میں جب تم کو دیکھتی ہوں اور یہ تلوار دیکھتی ہوں تو مجھے بڑا وہم آتا ہے۔''

وہم۔۔وہ کیا چیز ہے؟''

کمال الدین کے کردار کو گنگا جمنا کی سرزمین میں عربی مولد سے دور یوں بیان کرتی ہیں :

ابوالمنصور کمال الدین، جو پہلی دفعہ بہرائچ آیا تھا، سالار مسعود کی زیارت گاہ کی دیوار سے لگ کر درخت کے سائے میں بیٹھ گیا اور اچنبھے سے عورتوں کی ایک ٹولی کو دیکھنے لگا جو ہاتھوں میں پیتل کی تھالیاں سنبھالے سامنے مزار پر چڑھاوا چڑھانے کے لیے آرہی تھیں۔ یہ ہندو عورتیں تھیں۔

اور گونالندہ اور وکرم شیلا اور اجین اور امراوتی کے عظیم الشان بین الاقوامی دارالعلوم اب اجڑ چکے تھے اور شراوستی کے پرانے آشرم سنسان پڑے تھے اور ان پوتھی پتروں کو سمجھنے والا اب کوئی نہ تھا جو عجیب وغریب زبانوں میں لکھے گئے تھے اور عجیب وغریب باتیں ان میں لکھی تھیں، ناقابل فہم فلسفے اور عقل سے بالاتر الہیات۔

سرل کے کردار کے متعلق کچھ ایسے تصویر کشی کرتی ہیں کہ :

جب سرل ہاورڈ ایشلے نے کوئنز کالج کیمبرج سے بی۔اے کیا اس وقت اس کی عمر صرف بیس سال کی تھی، اس کا باپ ایک بہت مفلوک الحال پادری تھا اور سرل بڑی مشکلوں سے اپنے قصبے کے زمیندار کی مدد حاصل کر کے کیمبرج تک پہنچ پایا تھا۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد لندن آ کر اس نے مڈل ٹمپل میں داخلہ لیا۔ یہاں پڑوس میں فلیٹ اسٹریٹ تھی جس کے قہوہ خانوں میں لکھنے والے اور اخبار نویس جمع ہو کر دنیا جہاں کی باتیں کیا کرتے۔ اکثر سرل بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کی محفلوں میں شریک ہوتا تھیں ایک روز ایک شراب خانے میں سرل کی ملاقات پیٹر جیکسن سے ہوئی جو ہندوستان میں تجارت کرتا تھا اور ان دنوں وطن آیا ہوا تھا، وہ اسے موٹی آواز میں تفصیل سے بتاتا رہا کہ بنگال میں اسے نیل کی کاشت میں کتنے ہزار پاؤنڈ کا نفع ہوا۔ نیٹو کس قدر بے وقوف ہوتے ہیں۔ ان کے امراء کتنے دولت مند ہیں۔ کلکتہ کس قدر دلچسپ شہر ہے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ ہندوستان چلو۔ تم سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہو، اگر عقل سے کام لیا تو چار روز

پھر اس دور کے انگریزوں کو ہندوستانیوں پر یوں تبصرہ کرتا دکھاتی ہیں :

پیٹر جیکسن نے سرل کو فیض آباد اور لکھنؤ کی الف لیلوی داستانیں سنانا شروع کیں، پھر میسور والوں کا اور ارکاٹ کا تذکرہ کیا۔ بمبئی پہنچتے پہنچتے سرل پچھلے دو سو سال کے واقعات سے واقف اور ہندوستان کی پوری تاریخ کا ماہر ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کی بربریت۔ ایک سرخ زبان والی مورتی کو پوجتے ہیں۔ بیواؤں کو آگ میں زندہ جلاتے ہیں۔ ننگے پھر گھومتے ہیں۔ گائے اور بندر اور سانپ کو خدا سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کے مظالم۔ عورتوں کو پردے میں گھونٹ کر رکھتے ہیں۔ پندرہ پندرہ شادیاں کرتے ہیں۔ غرضیکہ پیٹر جیکسن نے جو کچھ اسے بتایا وہ خاصا پریشان کن تھا مگر بہر حال حقائق سے کون چشم پوشی کر سکتا ہے اور یہ سب تاریخی حقائق تھے جن پر پیٹر جیکسن نے روشنی ڈالی تھی۔ یہ طے شدہ بات تھی کہ نیٹو بلحاظ نسل کمتر تھے۔ ایشیائی سارے اور ہندوستانی بالخصوص گھٹیا درجے کے انسان تھے۔ عثمانی ترکوں سے بھی بدتر کیونکہ عثمانی ترک کم از کم سفید فام تو تھے۔ ''نیٹو چونکہ نسلاً گھٹیا ہیں۔ لہٰذا ان کے دماغ بھی بے حد پست ہیں۔ بنگال میں ایک رائل ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی گئی ہے جو کھود کھود کر جانے کس زمانے کی بکواس نکال رہی ہے۔ سنسکرت اور فارسی اور ڈھاکا۔ مردہ زبانیں جن میں جادو ٹونے کے نسخے لکھے ہیں۔ اس پر ہمارے چند محققوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ہندوستانی بھی ایک زمانے میں مہذب تھے۔'' پیٹر نے بات ختم کی۔

کئی سال گزر گئے۔ سرل اب کلکتے کی اعلیٰ سوسائٹی میں رل مل چکا تھا اور اسی اسٹائل سے رہتا تھا جو اس سوسائٹی کی خاصیت تھی۔ اس کے پالکی بردار ہر وقت سرخ وردی میں ملبوس رہتے۔ سونٹا بردار چاندی کے موٹھ کی چھڑیاں لے کر چلتے۔ رات کو مشعلچی اس کی فٹینس کے آگے آگے دوڑتے۔ خانساماں اور خدمت گار اس کے مطبخ اور کھانے کے کمرے کے نگراں تھے۔ حقہ بردار اس کا پیچوان بھرتا تھا۔ دفتر میں اس کا کلرک یوریشین تھا جس کا نام رالف تھا۔ سرل کو اس کی موجودگی میں بڑی بے آرامی سی محسوس ہوتی۔ رالف، بلیک ٹاؤن کا باسی، بڑی وفاداری سے سرل کی خوشامد میں لگا رہتا۔ دفتر کے انتظام کے لیے بنگالی سرکار موجود تھا اور ان گنت ہرکارے اور پیادے اور چپراسی۔ ایک تن تنہا سرل ایشلے اور اس کے ذاتی عملے میں چالیس پچاس آدمی شامل تھے۔ ان کے علاوہ اس کا مالی تھا اور گراس کٹ اور سائیس اور چابک سوار اور بہشتی دربان، چوکیدار، پھر اس کا بجرہ تھا جس کے مانجھی اس کے ملازم تھے۔ درزی، دھوبی اور نائی ان سب سے علیحدہ۔ اس سلطنت کا، جو اس کی سفید رنگ کی کوٹھی میں قائم تھی، سرل ایشلے بلا شرکت غیرے مالک و مختار تھا، وہ چاہتا تو ان سب کو الٹا لٹکا کر پٹوا سکتا تھا اور ایسا اس نے اکثر کیا، وہی سرل جو کچھ عرصہ قبل کیمبرج کی گلیوں میں ولیم بلیک کی کتابیں لیے مشق سخن کرتا پھرتا تھا اور کسی پب میں جا کر چند پنس کے آلو کھاتا تھا، جو مڈل ٹمپل کے پھاٹک سے نکل کر دریا کے کنارے ڈون اور گرے کی نظموں پر سر دھنتا سنسان سڑکوں پہ ٹہلا کرتا اور رات کو کسی طالب علم ساتھی کے یہاں جا کر سو رہتا تھا۔

ذیل میں تقسی سے قبل کے لکھنو کے ضمن میں وہ بھیا صاحب کا کردار پیش کرتی ہیں

یہ بھیا صاحب ہیں جن پر ہمیں عینی آپا کے محبوب کا شک ہوتا ہے ،اب وہ خود کو روپا کے روپ میں ظاہر کرتی ہیں یا پھر آپا جی کہ یہ وہ خود جانتی ہیں مگر روپا یا چمپا کا کردار انکے اصول و انا پر منطبق بیٹھتا ہے:

بھیا صاحب جو میرے چچا زاد بھائی تھے میرے بہنوئی بھی ہو سکتے تھے۔ بچپن سے میں یہی سنتا چلا آیا تھا۔ بھیا صاحب جب جوان ہو کر لکھ پڑھ کر بڑے آدمی بن جائیں گے تب اپی کو بیاہ کر لے جائیں گے۔ میرا کوئی سگا بھائی نہ تھا۔ میں بچپن سے بھیا صاحب پر عاشق تھا، وہ میرے ہیرو تھے میرے لیے گیری کوپر اور اشوک کمار سے اونچا درجہ رکھتے تھے۔ بھیا صاحب نے مجھے سینئر کیمبرج کے امتحان کے لئے مار مار کر ریاضی پڑھائی تھی۔ ان کی دل سے اتری ہوئی نائیاں میں بڑے چاؤ سے خود پہن لیتا تھا۔ بھیا صاحب جو کتابیں پڑھتے وہی میں پڑھتا۔ ان کو بیٹی ڈیوس سے نفرت تھی۔ میں نے بھی بیٹی ڈیوس کے فلم دیکھنے سے توبہ کر لی۔ پہلے وہ فارورڈ بلاک میں تھے۔ مجھے نیتا جی کا فلسفہ سمجھایا کرتے۔ میں بھی ان کے ساتھ جلسے جلوسوں سے واپس آکر رات کو سوتے میں انقلاب زندہ باد کے نعرے لگایا کرتا، پھر جب بھیا صاحب نے مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھنا شروع کیا میں نے اس کا اہتمام کیا کہ ان کی پڑھائی میں خلل نہ ہو، ان کے کمرے

بھیا صاحب چچا ابا مرحوم کی اکلوتی اولاد تھے۔ ہمارے آبائی قصبے کلیان پور میں، جو گھاگھرا کے کنارے آباد تھا، تالاب کے کنارے ایک پھونس کا بنگلہ تھا جس میں چچا ابا کبھی کبھی آکر رہا کرتے تھے، بھیا صاحب بھی یورپ سے لوٹ کر جب قصبے پہلی بار گئے تو اس بنگلے میں جا کر رہے۔ یہ بنگلہ چھوٹی بارہ دری کہلاتا تھا اور اس کے برآمدے میں بیٹھ کر بھیا صاحب موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرتے۔ خاندان کو ان سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ بھی اپنے مرحوم بابا کی طرح نام پیدا کریں گے۔ بڑے آدمی کہلائیں گے۔

اب چمپا کلی جو ماضی کی ہندو تھی حال میں مسلم گھرانے کی چشم و چراغ بن کر نمودار ہوتی ہے کی طرف اشارہ کرتی ہیں :

چمپا احمد نے بینسنٹ کالج کے کلاس روم کے دریچے میں آ کر نیچے نظر ڈالی ۔ لو چل رہی تھی ۔ دور سڑک پر ایک بگولہ اڑتا ہوا جا رہا تھا ۔ سارے میں املتاس کے زرد پتے تیرتے پھر رہے تھے ۔ نیچے کالج کا وسیع' بے رونق میدان گرمی کی سہ پہر میں پڑا تپتا تھا ۔ جانے بارش کب ہوگی' چمپا نے سوچا ۔ سفید کھادی کی ساریاں پہنے لڑکیوں کی ایک ٹولی کالج کی دوسری عمارت کی طرف جا رہی تھی ۔ کلاس روم کے ڈائس کے اوپر سے مسز اینی بیسنٹ کی بڑی روغنی تصویر مسکرا رہی تھی ۔ یہ مسکراہٹ بھی چمپا کو بہت اداس معلوم ہوئی ۔ گھنٹہ بجا اور لڑکیاں برابر کے کمرے سے نکل کر باہر آئی ۔ لیلا بھارگوا کے ہمراہ اس نے زینہ طے کرنا شروع کیا ۔ قریب کے ایک برآمدے میں ہائی سکول کے امتحان کا کوئی پرچہ کیا جا رہا تھا ۔ چھتری سنبھال کر وہ اور لیلا سڑک پر نکل آئی ۔ ابھی انہیں کسی پروفیسر سے ملنے یونیورسٹی جانا تھا ۔ تانگے پر بیٹھ کر وہ یونیورسٹی کی طرف روانہ ہوئیں ۔

یہ چمپا کی زندگی کا معمول تھا ۔ بسنت کالج' یونیورسٹی' گھر

جس سال چمپا کیمبرج پہنچی طلعت اور نرملا وہاں سے جا چکی تھیں ۔ (میں ہمیشہ ٹمبرسٹ جانا چاہتی ہوں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آتی ۔ سرل' اب کے ویک اینڈ پر ضرور ٹمبرسٹ چلیں گے' بے چاری نرملا کو دیکھئے) اب وہ اونچے طبقے کی برطانوی لڑکیوں کے لہجے میں گفتگو کرتی ۔ کیمبرج کی بدو ماغی بھی اس نے پوری طرح اوڑھ لی ۔ کچھ طور طریقے اس نے ادیبوں کے گروہ میں رہ کر لندن میں سیکھ لیے تھے ۔ اس کے علاوہ رکھ رکھاؤ' سلیقہ' نفاست' بردباری' ایک خاص سطح کا دھیما دھیما مزاج ۔ رات کو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ دفعتاً سوچی : چمپا احمد کہاں رہ گئی! چمپا احمد جو ایک دیو مالا' ایک حکایت میں تبدیل ہو چکی ہے ۔ وہ بسنت کالج بنارس والی لڑکی کہاں گئی' یادو لڑکی

جس کو عامر رضا نے گلفشاں کے سائیڈ روم میں ترکاری بناتے دیکھا تھا ۔ عامر رضا کا خیال اب اسے بہت مضحکہ خیز لگتا ۔ وہ فلم اسٹاروں کے حلیے والا ڈیلو میٹ جس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ شام کو کون سا سوٹ پہن کر اور

مذکورہ بالا حوالہ بیان کرتا ہے کے اب سارے کردار لنڈن میں پڑھائی و فکر کے جھمیلوں میں سر پھنسالیتے ہیں ۔یہیں پر میرے تعارف کا اختتام ہوتا ہے۔

انتساب

زہرا حیدر کے نام

میں دیوتاؤں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دریا

ایک طاقتور مٹیالا دیوتا ہے، تندمزاج اور غصیلہ

اپنے موسموں اور اپنے غیض وغضب کا مالک

تباہ کن..

وہ ان چیزوں کی یاد دلاتا رہتا ہے جنہیں انسان بھول جانا چاہتے ہیں

وہ منتظر ہے اور دیکھتا ہے اور منتظر ہے

دریا ہمارے اندر ہے.. سمندر نے ہمیں گھیرا رکھا ہے

خاتمہ کہاں ہے.......... بے آواز چیخوں کا

خزاں میں خاموشی سے مرجھاتے پھولوں کا

جو چپ چاپ اپنی پنکھڑیاں گراتے ہیں

جہاز کے بہتے ہوئے شکستہ ٹکڑوں کا خاتمہ کہاں ہے.....

خاتمہ کہیں نہیں ہے.. صرف اضافہ ہے

مزید دنوں اور گھنٹوں کا گھسٹتا ہوا تسلسل

ہم نے کرب کے لمحوں کو ڈھونڈ نکالا

سوال یہ نہیں کہ یہ کرب غلط فہمی کا نتیجہ تھا....

یا غلط چیزوں کی تمنا کا..... یا غلط چیزوں کے خوف کا

یہ لمحے مستقل ہیں.... جس طرح وقت مستقل ہے

ہم اس بات کو بہ نسبت اپنے کرب کے دوسروں کے کرب میں
بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں
کیونکہ ہمارا اپنا ماضی کرم کی دھاراوں میں چھپا ہے
لیکن دوسروں کی ازیت ایک غیر مشروط تجربہ ہے
جو کبھی فرسودہ نہیں ہوتا
لوگ بدل جاتے ہیں.. مسکراتے بھی ہیں مگر کرب موجود رہتا ہے
لاشوں اور خس وخاشاک کو اپنی موجودگی میں بہاتے ہوئے دریا کی مانند
وقت جو تباہ کن ہے قائم بھی رکھتا ہے
میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا کرشن کا یہی مطلب تھا
کہ مستقبل ایک مدھم گیت ہے
اور نا کے واسطے جو ابھی پچھتانے کے لے پیدا نہیں ہوئے
پچھتاوے کا گل سرخ
جو ایک ایسی کاتب کے پیلے اوراق میں رکھا ہے
جو کبھی کھولی نہیں گئی
آگے بڑھو مسافروں ماضی سے بھاگ کر
تم مختلف النواع زندگیاں یا کسی قسم کے مستقبل کی طرف
رواں نہیں ہو
آگے بڑھو. تم جو سمجھتے ہو کہ سفر میں ہو
تم وہ نہیں جنہوں نے بندرگاہ کو پیچھے ہٹتے دیکھا

یا جو دوسرے ساحل پر اترو گے

اس لمحے کہ.. دونوں کناروں کے درمیان وقت معطل ہے

مستقبل اور ماضی پر یکساں دھیان کرو

یہ لمحہ کرم یا نہ کرم کا نہیں.. جانو

کہ موت کے سمے انسان کا دماغ وجود کے جس نقطے پر

بھی مرکوز ہو.. [اور موت کا سمے ہر لحظ ہے]

وہ محض ایک کرم ہے

جو دوسروں کی زندگیوں میں بارآور ہو گا

کرم کے پھل کا خیال نہ کرو آگے چلو

اور مسافروں اور ملاحو..

تم جو گھاٹ پر اترو گے اور

تم جن کے جسم سمندر کے فیصلے سہیں گے

یا جو کچھ بھی تم پر بیتے گی یہ تمہاری منزل ہے

کرشن نے ارجن سے میدان جنگ میں کہا..

الوداع نہیں بلکہ آگے بڑھو.

مسافرو.......

[ٹی..ایس..ایلیٹ]

گوتم نیلمبر نے چلتے چلتے پیچھے ٹھٹھک کر دیکھا، راستے کی دھول بارش کی وجہ

سے کم ہوگئی تھی، گو کہ اس کے اپنے پاوں مٹی سے اٹے ہوئے تھے.. برسات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرد کے رنگ کے دکھلائی پڑ رہے تھے، اسوک کے نارنجی اور سرخ پھول گہری ہریالی میں تیزی سے جھلملاتے تھے اور ہیرے کے ایسی جگمگاتی پانی کی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں..ندی کے پار پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائے گی..گوتم کو خیال آیا گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں..اور برگد کے نیچے کسی من چلے ملاحنے زورزور سے ساون الاپنا شروع کر دیا تھا، آ کے جھرمٹ میں ایک اکیلا مور پر پھیلائے کھڑا تھا، شراوتی یہاں سے پورے پچیس کوس دور تھا اور گوتم نیلمبر کو ندی تیر کر پر کرنی تھی گھاٹ پر تین لڑکیاں ایک طرف بیٹھی باتیں کر رہی تھیں، ان کے ہنسنے کی آوازیں یہاں تک آ رہی تھیں،لڑکیاں کتنی باتونی ہو تی ہیں، گوتم نے سوچا، انہیں بھلا کونسے مسئلے حل کرنے ہیں، اس کا دل چاہا کہ نظر بھر کر انہیں دیکھ لے....خصوصا اس کیسری ساڑھی والی کو جس نے بالوں میں چمپا کا پھول اڑس رکھا تھا..اسکے ساتھ نچلی سیڑھی پر جو لڑکی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی ..اسکے گھنگھریالے بال تھے اور کتابی چہرہ اور جڑی ہوئی سیاہ بھنویں.قریب پہنچکر گوتم نے ان دونوں کو لحظہ بھر کے لیے دھیان سے دیکھا اور پھر جلدی سے نظریں جھکالیں گھاٹ کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے تیزی سے چھلانگ لگادی اور دوسرے کنارے کی طرف تیرنے میں مصروف ہو گیا

لڑکیوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا کوئی و دیارتی تھا جان پڑتا ہے، ان میں سے ایک نے کہا..ملاح اپنی اپنی ڈونگیوں میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا انتظار کرتے رہے، کشتیاں جو برگد کے سائے میں بندھی تھیں ان میں چولہے روشن کیے جا چکے

تھے اور رات کا کھانا بننا شروع ہو چکا تھا

ٹپ سے بارش کا ایک قطرہ چمپا کے بالوں پر آن کر گرا، اس نے ندی کی اور دیکھا جدھر وہ اجنبی طالب علم نہروں کے خلاف ہاتھ پاوں مارتا کسی انجانی سمت جا رہا تھا

بڑی کٹھن زندگی ان بے چاروں کی ہوتی ہوگی۔ نرملا کو اپنے بھائی کا خیال آ گیا۔ جو کہ اس طرح کی ان گنت ندیاں چٹیل میدان اور دشوار گزار پہاڑیاں عبور کر کے بہت دور تکشلا گیا ہوا تھا اور ابھی تک نہیں لوٹا تھا

جب یہ لوگ اتنا پڑھ جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔۔تیسری لڑکی نے بے دھیانی میں پوچھا۔۔اس لڑکی کا نام سروجنی تھا

ہوتا کیا ہے جھک مارتے ہیں۔۔۔کسی نئے دھرم کا اوشکار کر لیتے ہیں یے کسی نئے فلسفے کا پرچار شروع کر دیتے ہیں۔۔نرملا نے جل کر جواب دیا۔۔اس کا اکلوتا بھائی تکشلا میں ریاضی اور صرف و نحو سے سر کھپانے کی بجائے یہاں ہوتا تو کیا چمپک اس سے بیاہنے کر لیتی

باہمن بچارے بھی کیا کریں، پڑھیں نہیں تو کہاں جائیں پڑھا تو نا کے بھاگیے میں لکھا ہے سروجنی نے منہ لٹکا کر کہا

ندی کے وسط میں پہنچا۔ تو بارش کی دوسری بوند گوتم کے سر پر آن گری برسات کی وجہ سے سرجو کا پاٹ بے حد چوڑا ہو گیا تھا سون ندی کے پاٹ سے بھی زیادہ جسے پاٹلی پیر جاتے ہوئے گوتم نے ایک مرتبہ پیر کر عبور کیا تھا، اس نے پیرتے ء پیرتے پلٹ کت ایک بار دیکھا، گھاٹ پر لڑکیاں اب تک بیٹھی تھیں اور وہ بھی مو

جو دتھی جس کے بالوں میں چمپ کا پھول تھا ان لوگوں کو مینہ میں بھیگنے کا بھی ڈر نہیں ..گوتم نے دل میں کہا اور پھر جلدی جلدی لہروں کا مقابلہ کرنے میں منہمک ہو گیا سامنے دوسرے کنارے پر دریائی گھاس اور نیلے پھولوں کی گھنی بیلیں پانی کی سطح پر جھک آئی تھیں برگد کے سائے تاریک ہو چلے تھے سارس اور مور سمٹے سمٹائے اداس کھڑے تھے، چار پانچ آدمی انگوچھے کندھے پر ڈالے جلدی جلدی گاوں کی اور قدم بڑھا رہے تھے کنارے پہ پہنچ کر گوتم نے اپنے کپڑے نچوڑے اور ناتراشیدہ پتھروں سے بنے ہوئے مندر میں گیا جس کے ایک کونے میں وہ اپنا زادِ راہ چنڈی دیوی کو سونپ کر ایودھیا گیا تھا، ایک چھوٹی سی پوٹلی میں اس کے موقلم تھے اور سفید ریشم کے چند ٹکڑے، اس کا کمبل تھا، ایک سفید رنگ کی دھوتی اور چمڑے کے چپل ..اس نے بے پروائی سے اپنی پوٹلی اٹھائی ..پیر صفا کر کے چپل پہنے اور مندر سے باہر نکل آیا چاروں اوڑ بڑا سناٹا تھا اور مندر کے آنگن میں تنہا اسے بڑا ڈر لگتا تھا .کیسی خوفناک بات ہے ..فی شکل برہما جب شکل میں ظاہر ہوتا تو سا سے گھبراہٹ کیوں ہوتی ہے؟ کیا انسان کو دوسرے کے وجود پر اعتماد نہیں؟ گوتم نیلمبر نے خوف کے جزبے کا اکثر تجزیہ کرنا چاہا تھا، زندگی کا خوف .موت کا خوف ..زندہ رہنے کا خوف ..رگوید میں لکھا تاھ کہا بتدا میں خودی تھی جو کہ پرش کی شکل میں ظاہر ہوئی .اس نے چاروں اور دیکھا اور سوائے اپنے اسے کوئی نظر نہ آیا .اس نے کہا کہ یہ میں ہوں ..چنانچہ وہ اپنے آپ کو میں سمجھنے لگا ..اسے ڈر لگتا تھا چونکہ وہ تنہا تھا اسلیے جو اکیلا ہوتا ہے اس سے ڈر لگتا ہے .پھر اسنے سوچا کہ میرے سوا کوئی موجود نہیں پھر مجھے کاہے کا ڈر ہے ..؟لہذا اس نے خوفزدہ ہونا چھوڑ دیا مگر

اسے مسرت حاصل نہ تھی

کیونکہ تنہائی میں اداسی ہوتی ہے

اور اداسی سے ڈر لگتا ہے .. مجھے اپنے روح کی تنہائی سے ڈرنا نہیں چاہیئے. گوتم نے اپنے آپ سے کہا.

مندر بہت پرانا تھا، آس پاس گوتم کو کوئی پروہت یا پجاری بھی نظر نہیں آیا تھا جس سے وہ پوچھتا کہ شراوستی جانے کے لیے کونسا راستہ اختیار کرے ۔ یہاں سے کھیت ختم ہوتے تھے اور آگے شیشم کے گھنے جنگل تھے اور ڈھاک کے جھنڈ اور بیڑ اور ان گنت ندی نالے اور ان سب کو عبور کر کے اسے اپنے آشرم واپس پہنچنا تھا ہمندر کی سیڑھیاں اتر کر وہ گاوں کی سمت بڑھا. سرجو کے پار ایودھیا کی روشنیاں جگنووں کی ایسی جھلملا رہی تھیں. بارش کی دھند میں سرا منظر نیلا اور اودھا سا دکھائی دیتا تھا. جس میں نارنجی رنگ کی دھاریاں ایسی پھیل گئی تھیں. گوتم نے آبادی میں پہنچ کر دو تین دروزاوں پر دستک دی. رات کے کھانے کے لیے اسے صرف دال درکار تھی. ایک لپے پتے کچے مکان کے دوار پر روشنی جل رہی تھی ......ادھیڑ عمر کا گرہست اس روشنی میں بیٹھا کچھ پڑ رہا تھا.. برآمدے کے باہر گھپ اندھیرا تھا ...گوتم کی آواز سن کر وہ اسے شاکیہ منو کا کوئی بھشکو سمجھا.. پھر وہ چراغ اٹھا کر باہر لایا ..اور اس کے اجالے میں اسے گوتم کے سفید کپڑے نظر آئے

آجکل یہاں شاکیہ منی کے بھکشوں کی ایک ٹولی آئی ہوئی ہے میں سمجھا کہ تم انہی میں سے ہو اس نے رسان سے کہا.... جیسے یہ ہوا چلی ہے لڑکے تو لڑکے لڑکیاں بھی گھر بار چھوڑ کر جنگل بسا رہی ہیں

مجھے تھوڑی سی دال دے دو

گرہست نے چراغ برآمدے کی منڈیر پر رکھا اور اپنی بی بی کو آواز دی اس کے بعد پھر سے باتون کا سلسلہ چل نکلا۔۔رکمنی۔۔ایک برہمن برہمچاری ہمرے دوارے پر آئے ہیں۔۔

پھر وہ گوتم سے مخاطب ہوا۔۔سامنے نگر میں ایک بٹیا ہیں۔۔رانی رینوکا ایسی روپ وان۔۔کل میری بی بی جب ہاٹ کے لیے نگر گئی تو راج نواس کی داسیوں سے سنا کہ وہ بٹیا بھی کسی وہیار میں جانے والی ہیں.......یہ اندھیر دیکھو....اتنے میں اس کی بی بی آٹا دال لے آئی...جو گوتم نے اپنی چادر پھیل کر اس سے لے لیا اور اسے دعا دی گرہنی نے جھک کر اسے پرنام کیا اور اندر چلی گئی اس کا میاں کوش دلی سے ہنستا رہا۔۔اچھی ہوا چلی ہے۔۔میں تو کہتا ہوں کہ ماں باپ۔۔اب اپنی لڑکیوں کی شادی بیاہ کی فکر سے بھی نش چنت ہو گئے۔۔اس نے اپنی بات جاری رکھی

اناج کی پوٹلی باندھنے کے بعد گوتم ذرا کی ذرا برآمدے کے کھمبے سے ٹکا۔۔یہ گرہست بڑا خوش مزاج معلوم ہوتا تھا گوتم کا جی چاہا کہ کچھ دیر رک کر اس سے بات چیت کرے مگر اس کا مطلب تھا کہ وہ عیش و آسائش کی طرف راغب ہو رہا ہے...چنانچہ اس نے فوراً اس خیال کو دل سے نکال کر پھینکا۔۔گو یہ جان کر اسے خوشی ہوئی کہ بودھ طالب علموں کا گروہ ادھر آیا ہوا ہے۔۔اگر کہیں مل گئے تو رات اچھی گزر جائے گی اسے بودھ طالب علموں اور فلسفیوں سے بحث مباحثہ کرنا اچھا لگتا تھا

وہ لوگ کدھر گئے ہیں۔۔؟اس نے گرہست سے پوچھا۔۔یہ تو مجھے پتا نہیں

..باہمن تم اندر کیوں نہیں آجاتے..آؤ بیٹھو.تمہاری سیوا تو میرا دھرم ہے

نہیں اب میں چل ہی دوں..گوتم نے جواب دیا...وہ اپنی اس عزت وتکریم کا عادی تھا.چلتے پھرتے ہر سے اس کا ادب کیا جاتا.سڑک پر سے گزر رہا ہوتا تو راہ گیر اس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے..بڑے بڑے شہزادے اس کی خاطریں کرتے .غریب کسان اسے آنکھوں پر بٹھلاتے..محض اس لیے کہ وہ طالب علم تھا اور علم کا محافظ

گرہست نے چراغ منڈیر پر سے اٹھایا اور اندر جا کر پھر پڑھنے میں مصروف ہوگیا گوتم چند لمحوں تک اندھیرے میں کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا.اندر بچے کھیل رہے تھے..گرہست کی بیوی سانولی دبلی سی لڑکی جس نے اسے آٹا لا کر دیا تھا.چولہے کے آگے بیٹھی تھی..دروازے کی چوکھٹ پر پیاری مینا کا پنجرہ لٹک رہا تھا..کس قدر پرسکون منظر تھا،اس سے بھی اسے ڈر لگا..گریہا اگنی کے مدھم اجالے میں جگمگاتی ہوئی لڑکی ،جو کہ اس معمولی صاف ستھرے کچے مکان کی مالکن تھی..برآمدے پر جھکے ہوئے کیلے کے ٹھنڈے پتے..پروں میں چونچ دے کر سوتی ہوئی مینا..گریہہ اگنی یونہی جلتی رہتی ہے اور ایک دن چتا کے شعلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور چتا کی آگ کے انگاروں سے ایک اور گھر کے چولہے کی بنیاد پڑتی ہے،یہی آگ ون پوستھ گھر سے لے کر نکلتا ہے..یہ سارے دور ہر انسان پر گزرتے ہیں..اس پر بھی گزریں گے..مناظر کا ے ہوتے ہیں..وہ کبھی سمجھ ہی نہ پایا..شراوستی میں اس کا سہ منزلہ مکان تھا جس کے برآمدے کے چوبی کھمبوں پر رنگین نقش و نگار بنے ہوئے تھے ..اس سڑک پر اس کا مکان سب سے اونچا تھا..اس کا باپ بہت دولت مند

آدمی تھا..اور اس کی بہن کا بیاہ حکومت کے ایک اعلی عہدے دار سے ہوا تھا یہ اس کی تعلیم کا آخری سال تھا..فارغ التحصیل ہونیکے بعد اب ساری دنیا اس کے قدموں میں بکھری پڑی ہوگی وقت اس کا اپنا تھا.فراخ دلی ء کے ساتھ وہ فلسفوں کو پرکھتا اور سوچتا.مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ کیا تھا کہ وہ چیزوں سے خوفزدہ تھا..بارش میں بھیگتی لڑکیاں جو کہ اس پار گھاٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں...برگد کا یہ جنگل جس میں نارنجی رنگ کا لباس پہنے بھکشوؤں کی ٹولی کہیں گھوم رہی ہوگی اس ادھیڑ عمر کے گرہست کی بیوی جس کا نام رکمنی تھا یہ سب چیزیں کیوں تھیں

آبادی سے لوٹ کر وہ مندر کی طرف واپس آیا.آنگن میں پہنچ کر اس نے زمین میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر چولہا بنایا..اور مٹی کی ہانڈی میں چاول ابلنے کے لیے چڑھا دیے

کچی پکی دال بھات کھانے کے بعد وہ مندر کی دیوار سے پیٹھ ٹکا کر بیٹھ گیا ..سامنے دریا پر تاریکی گہری ہو چکی تھی..چاند بہت مدھم تھا اور کہیں بادلوں میں چھپا ہوا تھا..ہوا میں تازہ پھولوں کی مہک تھی.سرا جنگل اندھیرے میں سائیں سائیں کر رہا تھا..صبح سویرے اٹھ کر اسے اپنا سفر جاری رکھنا ہے..اس نے سوچا..اسی وقت دفعتا اسے پیروں کی آہٹ اور کسی کی مدھم ہنسی سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی چند لمحے منتظر رہنے کے بعد وہ سرک کر فرش پر لیٹ گیا...پیچے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر مندر کی دیوار پر سے کسی نے جھانکا..اندھیرے میں گوتم کو اس کی صورت نظر نہیں آئی

تم کون ہو بھائی؟...نیچے سے کسی نے پوچھا

میں ہوں..گوتم نے لیٹے لیٹے جواب دیا

تمہارا کیا نام ہے؟

میں کا کوئی نام نہیں ہوتا؟

تفریق کے لیے نام ضروری ہے....

شراوستی کے جن پنڈتوں کے ہاں پیدا ہوا وہاں کے پنڈتوں سے پوچھ کر میرا نام گوتم رکھا گیا تھا

بھائی گوتم نیچے آ جاو

تم خود اوپر کیوں نہیں آتے

اونچائی اور نیچائی محض ذہنوں کے فرق سے ہوتی ہے

ہوں..........

تمہیں کیا معلوم جسے تم اونچائی سمجھ رہے ہو وہ پاتال سے بھی گہری ہو

بھائی....اسی طرح دیوار سے نیچے جھانکے بغیر سوال کیا، کیا تم بھگوت ہو؟

نہیں مگر تم مندر سے نیچے نہیں اترو گے

نیچے سانپ ہونگے اور کیڑے مکوڑے ..اور کیڑوں مکوڑوں سے دوستی کرنا ابھی میں نے شروع نہیں کیا...اتنا کہہ کر گوتم دل میں ہنسا.....ممکن ہے کہ یہ آواز اسی جین سنیاسی کی ہو..پاٹلی پتر کے شاہی خاندان نے جین عالموں کو بہت سر چڑھا رکھا تھا..اور باضابطہ ان کے سدھانت کا مطالعہ کرتے تھے میں یہاں پتھر کے فرش پر لیٹا ہوں...تم بھی یہیں آ جاو..اس نے با آواز بلند پھر کہا.....سوفسطائی...شک پرست..دہریے..منطقی..جنگلوں جنگلوں بحثیں کرتے مل جاتے تھے.....یہ بھی ان

میں سے کوئی دل جلا ہے.....گوتم نے سوچا....ان گنت منطقی گنگا کی وادی میں گھو متے پھرتے تھے ..ماہرین کلام روایتی مذہب پر حملہ کرتے .....آرا ءاور راشیاء کی ضیافت کو ثابت کرنے میں مصروف رہتے...ان میں سے بہت سے مابعد الطبیعاتی نظریات کے حامل تھے ..اکثر مادہ پرست تھے..جین اور بودھ فلسفی بیک وقت یوگی بھی تھے اور سوفسطائی بھی ..انہی گھنے گھنے جنگلوں میں بڑے بڑے بادشاہ اور شہزادے جٹائے بڑھائے سادھوں کی سی زندگی گزار رہے تھے ..اور پچھلی صدی میں کپل وستی کے شہزادے نے بھی جنگل کا راستہ اختیار کر کے ملک کی اس روایت کو نبھایا تھا...ان کی آمد کے وقت باسٹھ مدرسہ ہائے فکر اپنی مختلف شاخوں سمیت پہلے سے موجود تھے ..خیالات کی اس سلطنت میں انہوں نے بھی ..جو شاکیہ منی سدھاوتے کہلائے.....فلسفے کی ایک اور نوآبادی قائم ،کر دی تھی

باسٹھ مختلف نظریات ......اور زندگی ایک ہے ....انسان تنہا ہے ...گوتم نے آنکھیں بند کرلیں اور اسی طرح لیٹا رہا......

تم کون ہو بھائی ....کچھ دیر کے بعد گھبا رکر اس نے دوبارہ آواز دی..اب یہ سوال میں تم سے کرتا ہوں ....گوتم اگر تم اپنی اصلیت مجھ سے چھپانا چاہتے ہو تو مجھے کوئی آپتی نہیں.....

نام آوازوں کی ایک سسشٹی ہے بھائی گوتم...اور ہری شنکر کی آواز پر میں چونک اٹھتا ہوں..کیونکہ یہی میرا نام ہے...

بھائی ہری شنکر کیا تم کرشن واسودیو کے بھگت ہو؟

نہیں میں اس سے اتر پچھم کی اور سے آرہا ہوں.. جہاں شیوا کی ارادھنا کی

جاتی ہے ..گوتم میں نے کاشیرا کی برف میں بڑی بڑی خوبصورت جگہیں دیکھی ہیں..بعض دفعہ خیال آتا ہے کہ زندہ رہنا بڑی نعمت ہے

میں نے زیادہ سیاحت نہیں کی مجھے اس کا بڑا دکھ ہے

صرف اسی کا دکھ ہے تم نے دکھ کے فلسفے پر کتنا غور کیا ہے بھائی گوتم ؟

آجکل میں اسی پر غور کر رہا ہوں

جہاں میں پڑھتا تھا وہاں ہم لوگ فلسفہ اور ساہیتہ کی بجائے گنت ودیا اور قانون اور طبیعات پر زیادہ دھیان دیا کرتا تھے ...لیکن رنج سے میرا بڑا گہرا سمبندھ ہے گوتم نیلمبر

کیا تم اجینی سے آ رہے ہو.....

نہیں.....اس سے بھی بہت آگے سے

تکشلا ؟

ہاں.......

میرا وہاں جانے کو بہت جی چاہتا ہے.تم نے اپنی تعلیم ختم کر لی ؟

ہاں پھر میں بہت بڑے سفر پر نکل گیا.اپار سمندر کے کنارے میں نے دوارکا کے درشن کیے....میں متھرا گیا...برھم ورتھ میں استھا کے کھنڈر میں نے دیکھے..گوتم میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وقت بہت خوفناک چیز ہے...کیا تم کبھی وقت کے خوف سے لرزے ہو

ہاں گوتم نے آنکھیں بند کیے ہوئے جواب دیا،اندھیرے مندر کے برآمدے پر جھکے ہوئے پیپل کے پتے سرخ نظر آ رہے تھے

کیا تم بودھ ہو

ہاں تمہیں کیسے معلوم ہوا

شام جب میں بھیک مانگنے کے لیے گاوں میں گیا تھا تو ایک گرہست نے مجھے بتلایا تھا کہ تم لوگوں کی ایک ٹولی ادھر آئی ہوئی ہے

تم......بھی.....ہو؟

میں نے اپنے زہن کا دروازہ ابھی کھلا رکھ چھوڑا ہے

اور دل کا......؟ دل اور زہن کا کیا سمبندھ؟

میں تم کو ایک بات بتلاوں.....؟ اتنا کہتے کہتے دوسرا نوجوان منڈیر کود کر مندر کے برآمدے میں آ گیا. بحث کے جوش میں اس نے اپنے کھڑاووے اتر کر ایک طرف پھینک دیے اور چنڈی کے سامنے سے دیا روشن کرکے اس کی روشنی میں گوتم کو دیکھنے لگا، گوتم اٹھ کر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا..اس نے بھی دلچسپی سے نووارد کو دیکھا جو کہ بہت دور سے آ رہا تھا

تم یہاں کہیں آس پاس میں کاشی واشی میں پڑھتے ہو..؟ دوسرے لڑکے نے گوتم کے قریب پاوں پھیلا کر بیٹھتے ہوئے پوچھا

میں شراوستی میں پڑھتا ہوں، کاشی کی پاٹ شالہ تو خالی مہا پنڈت تیار کرتی ہے

.

اور تم کیا بننا چاہتے ہو؟

یہی تو سمجھ میں نہیں آتا..

تمہاری زندگی کا مقصد کیا ہے گوتم نیلمبر..

تم بھی اس اندھیارے میں سے نمودار ہو کر مجھ سے یہی سوال کرنے آئے ہو ..؟ گوتم نے چڑ کر کہا.اب ہوا میں خنکی آ چلی تھی..جنگل کی بھیگی ہوئی ہوا..جو سو جر پر سے بہتی ہوئی آ رہی تھی..اس کی جھونکوں میں چراغ کی لو جھلملا اٹھی..گوتم نے اپنے نئے ساتھی کو غور سے دیکھا..اس کا ذہین اور خوبصورت چہرہ گوتم کو مانوس سا نظر آیا ..گہری سایہ جڑی ہوئی بھنوئیں..کتابی چہرہ اور گھنگھریالے بال..یہ شکل میں نے پہلے کہاں دیکھی ہے؟ ابھی ابھی دیکھی ہے..گوتم نے ہڑ بڑا کر سوچا.اگر یہ گھنگھریالے بال منڈوا دے تو شاید کچھ مختلف معلوم ہو..ورنہ یہ تو جانا پہچانا سا چہرہ ہے

تم نے اپنا سر نہیں گھٹوایا...کیسے بھکشو ہو.گوتم نے ذرا بشاشت سے سوال کیا

میں نے بھی اپنے ذہن کا دروازہ ابھی کھلا رکھ چھوڑا ہے

اور تمہارا سنگھ؟

میرا سنگھ اور میں دو مختلف چیزیں ہیں...میں آزاد ہوں.اور مزید آزادی کی تلاش میں مصروف

تم کہاں کے رہنے والے ہو؟

نوجوان نے دریا کی سمت اشارہ کیا اس پار کا

اچھا..گوتم ذرا چونک کر اٹھ بیٹھا

تمہیں اتنا اچنبھا کاہے کے لیے ہوا؟ ہم سب کو کہیں نہ کہیں تو پیدا ہونا ہی ہے .ممکن تھا کہ میں میمنس میں پیدا ہوا ہوتا اور تم یا وادیپ میں؟.....ہری شنکر نے تبسم کے ساتھ گوتم کو دیکھا

تم یہیں کے رہنے والے ہو اور اب بھکشو بنے اجنبیوں کی طرح گھوم رہے ہو
ہم سب ایک دوسرے کے لیے ازلی اور ابدی اجنبی ہیں

گوتم خاموش ہو گیا۔۔ہری شنکر۔۔اس نے اپنے دل میں کہا۔تم بحث میں مجھے ہرا نہیں سکو گے۔شاکیہ منی بھی آخر اسی کوشل دیس کی رہنے والے تھے۔وہ شراوستی میں آ کر برسوں رہے۔انہیں پروان نری حاصل کیے ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی، مگر سارا ملک ایک نئے نارنگی رنگ میں رنگتا جا رہا تھا۔۔۔اس کی تیوری پر بل آ گئے ۔۔اس نارنجی ساری والی لڑکی کی یاد اس کے ذہن میں کوندی اور اسے بڑی کوفت ہوئی ۔۔جب سے یہ ہوا چلی ہے لڑکیاں بھی گھر بار تج کر جنگل بسا رہی ہیں ۔۔تمہیں ویدوں پر یقین نہیں رہا جو تم نے یہ حلیہ بنایا ہے؟ اس نے زرا جھنجھلا کر کہا۔بھکشو کا فلسفہ اور تمہاری ساری پری بھاشا اپنشدوں مے موجود ہے۔شاکیہ منی شروع سے آخر تک کپل کے نظریوں سے متاثر تھے۔۔خود بدھ کا لفظ وید سے نکلا ہے۔۔کوئی چیز خیالات کی دنیا میں نش کول اور غیر متعلق نہیں ہے۔تم کا پریوگ کیوں کرتے ہو۔۔؟

ہری شنکر چپکا بیٹھا رہا۔۔پھر اس نے زرا مسکرا کر پوچھا۔تم کو لڑکیوں کی کیا فکر ہے۔۔کوئی خاص لڑکی ویہار میں جانے والی ہے۔۔۔۔؟

تم لوگ اس طرح ہنستے کیوں ہو ۔۔دیکھو تمہارے آنند پر کیا بیتی تھی۔۔گوتم نے اور زیادہ چڑ کر کہا

گوتم نیلمبر میں اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔۔ہری شنکر نے ٹانگیں اور پھیلا کر آرام سے لیٹے ہوئے جواب دیا

تم کاہے سے بھاگ رہے ہو۔۔۔گوتم نے غصے میں پوچھا

تم کاہے کی تلاش میں ہو.. ہری شنکر نے کہا.میرے یہاں تو ساری تلاش ختم ہو چکی ہے

اگر میری درسگاہ میں اعلی اخلاق برتنے کا اپدیش نہ دیا جاتا تو میں یہی کھڑاؤوں تمہارے ناک پر لگاتا...

ہری شنکر نے قہقہہ لگایا...اگر مجھے دوستوں کی ضرورت نہ رہی ہوتی تو میں تمہیں اپنا دوست بنالیتا

تم خود پرست ہو

اور تم ذہن کے غرور میں مبتلا ہو

تمہیں ناٹک سے دلچسپی ہے؟ گوتم نے موضوع بدلا

تھی....مختصر جواب ملا

اچھا....مگر الفاظ کا ناٹک تو تم ہر سے کھیلتے ہو..ہری شنکر خاموش رہا..اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے گوتم جوش میں آکر بولتا رہا.تین سو سال ہوئے تمہاری تکشلا میں ایک شخص گزرا ہے جس کا نام پاننی تھا..اس نے الفاظ کے اسرار کی ایک نئی کائنات دریافت کی تھی جب تلاش ختم ہو چکی ہے تو الفاظ کا استعمال کیوں کرتے ہو..الفاظ کو بھی ملتوی کر کے دیکھو

ہری شنکر کروٹ بدل کر کہنیوں کے بل لیٹ گیا..گوتم میں نے پانئی کی آٹھوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہے..میں کاشمیرا کے مدرسوں میں گیا ہوں..جہاں سنسکرت کو مکمل بنایا جارہا ہے..میں نے یاونون کی بولی بھی سیکھی ہے اور پارسیکاون کی بھی ...لیکن اب میں الفاظ ختم کرنا چاہتا ہوں

کیونکہ...ہری شنکر کہتا رہا..زبان...الفاظ وعدے کرتے ہیں جو کہ نبھائے نہیں جاتے..خیالات کا اظہار کرتے ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں..ان کے معنی کی کھوج میں بھاگنا شروع کیا تو بھٹک کر میں کہاں سے کہاں جا نکلا..اسی وجہ سے گوتم سدھارتھ نے کہا تھا کہ...

لیکن گوتم نیلمبر نے ہری شنکر کی بات کاٹی..لیکن اوم کے تین حرفوں اور ساپاسا کے تین سروں کے درمیان ....تو کائنات کا سارا وجود بندھا ہوا ہے ...آواز آکاش کا ایک گن ہے

کہے جاؤ..ہری شنکر بولا

برہسپتی مادہ پرست آکاش کو نہیں مانتے...تم تو مانتے ہو

مگر تمہارے ہمنام...گوتم.....نے تو کہا تھا کہ اگر آواز ابدی ہے تو زبان سے پہلے ہی لفظ سنائی دے جانا چاہیے...کیونکہ آکاش اور ہمارے کانوں کے درمیان کوئی روک نہیں ہے..ہری شنکر نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا

لفظ بھی ابدی ہے...گوتم نے جواب دیا.حرف م ہمیشہ سے موجود ہے یا حرف ن اس کو جب بھی ادا کیا گیا ہوگا اس کی آواز یہی رہی ہوگی..جیمنی کہتا ہے کہ آواز اس کے لیے ابدی ہے کہ سننے کے بعد دماغ کو یاد رہتی ہے اور بیک وقت ہر جگہ موجود ہے اور کبھی ختم نہیں کی جاسکتی

اور اسی لیے ویدوں کو..... کیونکہ وہ الفاظ ہیں ....کبھی رد نہیں کیا جاسکتا ؟...ہری شنکر نے نظریں اٹھا کر پوچھا

تم کیسے فلسفی ہو جو کہ الفاظ پر یقین نہیں رکھتے...گوتم نے جھنجھلا کر جواب دیا

.. پانِنی تمہارے تکشلا کے استاد کہا تھا اپنے یا دوسروں کے خیالات کے مظاہر صرف الفاظ ہی ہو سکتے ہیں.. ان کی ماہیت کا مطالعہ کرنا کس قدر ضروری ہے .. الفاظ کے راستے کے بنا خالص خیال تک کس طرح پہنچ پاؤ گے؟ آواز الفاظ کا پراکرتک گن ہے... اور مادہ ابدی ہے... وید زبان کی شکل میں برہما ہے.. اور مادہ برہما ہے

وقت کو ابدیت سمجھ کر تم لوگوں نے بہت گڑبڑ پھیلا رکھی ہے.. ہری شنکر نے دوبارہ فرش پر لیٹتے ہوئے اظہار خیال کیا

معنی اصل چیز ہے.... گوتم نے جواب دیا... پانِنی کا کہنا ہے کہ سارے الفاظ کا ماحاصل خالص وجود ہے ...ست.. اصلیت اور مختلف چیزوں کے لیے برہما کے الگ الگ نام ہیں ..وہ سامنے سے گزرتا ہوا بھورا سور.... گھاٹ پر بیٹھی ہوئی ایودھیا کی لڑکیاں...تم... ہری شنکر یہ سب مہمان آتما ہیں

تم تعجب ہے اب تک ویدانت سے آگے نہیں بڑھے

انت کے آگے اور کیا ہو سکتا ہے

تم ہی بتاو

پرم آتما اور جیو آتما میں اودیا کی وجہ سے دوئی قائم ہے... لہٰذا لفظ اور غیر لفظ دو برہما ہیں اور لفظ پر دھیان کر کے غیر لفظ کا انکشاف ہو سکتا ہے

وہ غیر لفظ میں خود ہوں... ہری شنکر نے کہا.. گوتم خاموش ہو گیا

علیت کا قانون بجائے خود مکمل ہے... کوئی چیز دوسری چیز کے مانند نہیں ہے .صرف اپنے لمحاتی وجود کے علاوہ کسی شے کا کسی شے سے کوئی تعلق نہیں، سمجھے .. سب وقتی ہے اور مصیبت ہے .. سردکھم دکھم ؛؛؛ ہری شنکر نے کہا.. جسم اور آتما دونوں فانی

ہیں..دونوں کے اکٹھا ہو جانے سے بھی کوئی مستقل وجود پیدا نہیں ہوتا...آتما ابدی نہیں ہے..انسان چراغ کی طرح بجھ جاتا ہے..محض واقعات اور احساسات کا دور تسلسل قائم رہتا ہے...ایک لڑکی تھی...سو رہے ہو بھائی گوتم؟

نہیں کہے جاؤ

ایک لڑکی تھی..اس نے بھی مجھے ابدیت کا قائل کرنا چاہا تھا..وہ بھی ساپا سا میں زمنا و مکان کو محیط کرلیا کرتی تھی....وینا پر وہ صبح صبح بھیرو اور میگھ بجاتی...دوپہری کو جب ساری دنیا سونے کے رنگ میں رنگ جاتی....تب میں اس سے دیپک اور شری راگ سنتا....رات پڑے وہ ہنڈول گاتی..اس لڑکی کو سنگیت کا جنون تھا

تم نے گیت اور الفاظ ملتوی کردیے مگر سر رہیں گے...سر اٹل ہیں....گوتم بولا

کچھ دیر کے بعد ہری شنکر نے پھر کہنا شروع کیا..میں جب اتر کوشل کی سرحد پر پہنچا تو قلم استھان کے پہرے دار نے للکار کر مجھ سے پوچھا تم کہاں سے آرہے ہو؟ میں یہیں سے گیا تھا اور یہیں لوٹ کر آیا ہوں..میں نے جواب دیا اور یہی تم سب کا حشر ہوگا...اتچکر سے بچنے کی کوشش کرو

تم اس کا مطلب سمجھے..پہرے دار نے اپنے ساتھی سے کہا..یہ بھی کوئی فلسفی جان پڑتا ہے اور پھر دونوں کوڑیاں کھیلنے میں مصروف ہو گئے..مگر میں جب ایودھیا میں داخل ہوا تو مجھے پتا چلا کہ سر ابھی باقی ہیں..گوتم زندگی کا پھیلاو بہت زبردست ہے..ملک..بستیاں..نئے نئے لوگ..بھانت بھانت کی بولیاں..میں نے پاٹلی پتر سے لے کر پشکروتی تک سارا راستہ یہی کھڑاووں پہن کر طے کیا ہے..یہاں سے کچھ فاصلے پر گوتمی کے کنارے لکھشناوتی آباد ہے..جسے سری لچھمن نے بسایا تھا

..سنگم پر پریاگ ہے ..پھر کانیا کبج .ہستاپور اور تکشلا ..اس کے آگے سرحد کا شہر پشکروتی..اس لمبی شاہراہ پر میں نے بہت طویل سفر طے کیا.مگر ہنڈول کے سربراہ میرا پیچھا کرتے رہے.تم کئی سال میں تکشلا میں رہا اور انہیں بھلائے رکھا.یہاں لوٹ کر پھر وہ آوازیں میرے کانوں میں آرہی ہیں.تم مجھ سے لفظ اور آواز کی ابدیت کی بات کرتے ہو..مجھ سے پوچھو..مجھےمعلوم ہے یہ سب جگہوں کے سحر کا اثر ہے اصلیت کچھ نہیں..سر دم دھم دھم

سنا ہے وہ پراچین ایودھیا کی رانی رینوکا ایسی خوبصورت ہے

کس کا ذکر کرتے ہو..ہری شنکر نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا

پتا نہیں گوتم نے جواب دیا..پھر وہ بھی آنکھیں بند کر کے فرش پر لیٹ رہا

مقدس سرجو..رگ وید میں بہنے والی ندی.میری ماں.....نہ جانے کب تک اسی طرح بہتی رہے گی..سامنے میرا شہر ہے..ہری شنکر کی خوبصورت مدھم آواز اس کے کانوں میں آتی رہی..خوبصورت..شاندار ایودھیا..کتنے زمانے سے اسی جگہ پر راتوں کو یونہی جگمگا تا رہا ہے..کتنے جگ بیتے جب منو کا بیٹا اس کا پہلا بادشاہ بنا تھا ..اور شیو بھگت بھاگیرت اور ڈگ وجے فاتح عالم..رام چندر ایودھیا..اجکا..برہم کا شہر..جسے کوئی جیت نہیں سکتا.تم نے کبھی اس نگری کے رقاصوں اور سنگیت کاروں کو دیکھا ہے؟یہاں کے ناچوں میں شامل ہوئے ہو؟ راج محل میں بسنت کا تہوار منایا ہے؟ یہیں پر چمپک رہتی ہے اور یہیں پر میرے گھر والے اور میری بہن میرے منتظر ہیں..جس طرح سی کرشن کو اپنی بہن سبھدرا بڑی پیاری تھی ویسے ہی میں اپنی بہن کو عزیز رکھتا تھا.مگر میں نے اس کی محبت کو دوسری محبتوں اور

وفا داریوں کے ساتھ دل سے نکال پھینکا اور پھر اوچن لوٹ آیا......رام نے چودہ برس کے بن واس کے بعد لوٹنے کا وچن دیا تھا..میں بھی آیا ہوں..مگر سدھارتھ نے مجھے وعدوں کے بندھن سے آزاد کر دیا ہے....میری بہن...رام چندر کی بہن شانتا کے جیسی خوبصورت اور معصوم ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اسی ایودھیا میں جس طرح ڈیڑھ ہزار سال قبل شانتا اور سیتا کی جوڑی تھی..ایسے ہی نر ملا اور چمپک چاند اور سورج کی مانند جگمگاتی ہیں....دیکھو الفاظ نے پھر میرے ساتھ غداری کی ہے..اس نے اداسی سے بات ختم کی

گوتم نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا..باہر درختوں پر بارش برسنا شروع ہوگئی تھی..برسات کا موسم ہے..یہ موسم سارے بھکشو وہاروں میں بسر کرتے ہیں ..گوتم کو خیال آیا..اس نے کروٹ بدل کر ہری شنکر سے پوچھا تم شرون کا زمانہ کہاں گزاروگے؟

پتا نہیں

تمہارے باقی دوست کہاں جا رہے ہیں؟

میرے ہم سفر..تمہارا مطلب ہے

ہم سفر ہی کہہ لو

یہ بھی معلوم نہیں

تکششلا تو برہمنوں کی درسگاہ ہے..تم وہاں کیسے پہنچ گئے

میں ...میں تو پکھتاوں کے دیس بھی رہا ہوں..جہاں اتر کے نیلی آنکھوں والے سفید فام ولایتی شیو کی عبادت کرتے ہیں..میں نے ایراوتی [راوی] اور

چندر رہاگ [چناب] کی وادیوں کی سیر کی ہے..میں سندھو کی لہروں پر تیرا ہوں
.. پورب میں دنگا تک گیا ہوں..میں نے برہم پتر اور سندر بن اور چندرا دیپ کی
دلدلوں میں جنگلی دھان اگتے دیکھے ہیں..جہاں سیاہ لباس پہنے لمبے بال ک
ندھوں پر چھٹکائے مرگ نینی لڑکیاں ہرے بانوں کے جھنڈوں میں رہتی ہیں اور
پریوں کی طرح گاتی ہیں..گوتم زندگی کا پھیلاو بہت عظیم ہے..اس وسعت سے
بچتے رہو...کائنات.....اور اس کی وسعت کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟ کہاں جاتی
ہے؟ ہم کہاں پیدا ہوئے؟ کس طرح اور کس وجہ سے زندہ ہیں..اور یہاں سے
کہاں جائیں گے؟.تم جو برہما سے واقف ہو..ذرا بتلاو دکھ یا سکھ کس کے حکم
سے یہاں رہ رہے ہیں؟وقت یا فطرت.....یا..حادثے..یا عناصر کو سمجھا جائے یا
سے پر جوش کہلاتا ہے جو تمہارے نزدیک پرم آتما ہے؟ ہری شنکر نے بات ختم کی

اپنشدوں میں لکھا ہے کہ کائنات آزدای میں پیدا ہوئی ہے، آزادی موجود
رہتی ہے اور آزادی میں سمو جاتی ہے

وہی ابدیت ...ہری شنکر نے رنجیدہ آواز میں کہا...آزادی اور ابدیت خودا
یک قید نہیں؟

بارش تیزی سے شروع ہوگئی..دیا ہوا کے جھونکے سے بجھ چکا تھا..شنکر نے
اینٹوں کا تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ لیا گوتم نے اپنی سفید چدر اوڑھ کر دیوار کی طرف
کروٹ بدل لی..دونوں کچھ دیر تک چپ چاپ اندھیرے میں پلکیں جھپکا کیے
..پھر پروائی کے جھونکوں سے انہیں بھی نیند آ گئی

اس رات گوتم کو عجیب عجیب خواب نظر آئے، منڈی کی کوٹھڑی میں سے نکل کر

چنڈی دیبی اپنے گوری کے روپ میں چھن چھن کرتی باہر آئیں..پھر وہ کیسری ساری والی لڑکی مے تبدیل ہونا شروع ہوئیں..اس کے بعد ان کی شکل پھر مختلف نظر آئی.. پہلے وہ دلہن بنیں..ستی کے روپ میں مہادیو سے ان کا بیاہ ہوا..پھر پل کی پل میں ایک بوڑھی عورت..درگاہ سے بھی زیادہ خوفناک..آلتی پالتی مارے ان کے سرہانے آن بیٹھی..اور زور زور سے رونے لگی میری ماں..میری ماں..گوتم نے لرز کر کہا..لیکن بوڑھی عورت نے دانت نکوس کر جواب دیا..میں تمہاری ماں نہیں ..ارے میں نے تو ویشالی کی...اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ایک پیپل درخت کی شاخ پر سے ٹوٹ کر آنگن میں آن گری اور گوتم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا.شنکر بڑے سکون سے سو رہا تھا.بارش تھم چکی تھی..ندی کے کنارے چنڈال کسی کی لاش مرگھٹ کی سمت لیے جا رہے تھے اور کشتیوں کی روشنی اندھیرے میں اگیا بیتال کی طرح چمک رہی تھیں..اس نے جلدی جلدی منتر پڑھنا شروع کر دیے...بہت دیر کے بعد اسے نیند آئی

منہ اندھیرے جب شنکر کی آنکھ کھلی..اس وقت گوتم چنڈی پاٹھ میں مصروف تھا ..گھاٹ پر برہمن کھنکار رہے تھے آم کا باغ چڑیوں کی چہکار سے گونج اٹھا تھا..گوتم عبادت کے باہر نکلا.تو ہری شنکر اسے دیکھ کر مسکرایا..دفعتا گوتم نے اس کو پوچھا ....ویشالی میں کون رہتا تھا؟

میں ویشالی کی کسی مہیال سے واقف نہیں ہوں..شنکر نے بری سنجیدگی سے سر ہلا کر جواب دیا اور پھر ہنسنے لگا..گوتم کو اس کی بے تکی ہنسی پر بہت غصہ آیا

وہ دونوں مندر کی سیڑھیاں اتر کر جنگل کے راستے پر آ گئے...ندی کے کنارے

بھکشوؤں کا گروہ نہانے کے لیے آیا ہوا تھا

تم اب شراوستی واپس چلے جاتے ہو...شنکر نے پوچھا

ہاں تم نہ چلو گے ..وہاں سے کچھ فاصلے پر کپلا وستی ہے..ادھر پورب میں کوسی نگر ہے..اور گیا.تم ان سب جگہوں کی یاترا کے لیے نہ جاوگے؟

تم اپنا مطلب بیان کرو

میرا مطلب یہ ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلو.تم میرے آشرم میں ٹھہر سکتے ہو ..یا اگر میرے ماں باپ کی عزت بڑھانا چاہو تو شہر کے اندر میرا گھر ہے

میرا ارادہ کاشی جانے کا تھا.مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم میری راہ میں حائل ہوتے ہو..

یہی بات دوسری طرح بھی کہی جاسکتی ہے.تم میرا راستہ کھوٹا کر رہے ہو ..بھائی ہری شنکر ..پگڈنڈی پتلی ہو اور دو راہگیر آمنے سامنے آن کھڑے ہوں تو ان میں سے ایک کو ہٹ جانا چاہیے..ورنہ دونوں کھڈے میں جا گریں گے گوتم نے کہا

پھر میں تمہارے ساتھ شراوستی کیوں چلوں..اس لیے کہ تمہیں میرے مزہب سے دلچسپی ہے یا اس لیے کہ تم ایودھیا کی کماری چمپک کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہو؟

ہری شنکر اگر تم نے شاکیہ منی کے چیلوں کا یہ گیروا پہناوا نہ پہن رکھا ہوتا تو میں تمہاری ٹھکائی کر دیتا..گوتم نے دل میں کہا

وہ دونوں آبادی چھوڑ کر شرواستی کی طرف بڑھنے لگے

آسمان پر سے بادل چھٹ گئے تھے،ہوا میں کچی کلیوں کی مہک اڈ رہی تھی

..کدم کے ایک جھنڈ میں مور پر پھیلائے ناچ رہا تھا..کھیتوں کی منڈیر پر دھانی اور کپاسی ساڑیاں پہنے ہوئے کسن عورتیں ادھر سے ادھر جا رہی تھیں اسوک کے جنگلوں میں جگہ جگہ جو دیواستھان اور دیوگرہ بنے ہوئے تھے گوتم ان پر پھل پھول چڑھاتا راستہ طے کرتا جا رہا تھا شنکر خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ آ رہا تھا

شام پڑے دونوں لڑکے مور پالنے والوں کے ایک گاوں کی فصیل میں داخل ہو گئے، ان گنت مور چاروں اور باغوں میں گھوم رہے تھے چھپروں کے نیچے مور کے پروں کے پنکھے اور مورچھل تیار کیے جا رہے تھے..چوپال میں گانا ہو رہا تھا

گوتم اور ہری شنکر کنوئیں کے من پر بیٹھ گئے.. پل کی پل میں سارے میں خبر پھیل گئی تھی دو ودیارتی گاوں میں مہمان آئے ہیں..ان کی آو بھگت شروع ہوئی ..شنکر آنکھیں بند کیے بیٹھے رہا

ایک لڑکی دو خوبصورت پنکھیاں نزر کرنے کے لیے آئی تھی..گوتم نے لڑکی کے ہاتھ سے پنکھا لے لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا..اس کے پروں پر انگلیاں پھیریں..لڑکی بڑے ادب سے آشیر باد کی منتظر کچھ فاصلے پر کھڑی رہی...یہ پنکھے کہاں کہاں کن کن دور دراز کے شہروں اور ملکوں کو بھیجے جائیں گے..کیسے کیسے لوگ ان کو استعمال کریں گے..وہ سوچ رہا تھا..یہ پنکھیا جو میں چھو رہا ہوں..یہی ایودھیا کے بازار میں جا کر بکے گی اور شاید وہی لڑکی اسے خرید لے گی..پھر اس نے دونوں پنکھیاں واپس کر دئیں..ہمیں عیش و آرام کا حکم نہیں..ہمیں تمہارے یہ خوبصورت پنکھے نہیں چاہئیے..مور کے پروں کو ہم بن میں دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں..اس نے جلدی جلدی کہا..لڑکی نے پنکھیاں اٹھالیں اور پرنام کے لیے جھکی اور شنکر چونکہ بھکشو

کا نارنجی لباس پہنے ہوئے تھا اس نے آگے بڑھ کر شنکر کے پاؤں چھو لیے

تمہارا نام سجاتا تو نہیں...گوتم نے ہنس کر اس سے پوچھا..اور شنکر پر نظر ڈالی وہ اب بھی آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا

نہیں ..میرا نام نند بالا ہے..سجاتا میری بڑی بہن ہے لڑکی نے سادگی سے جواب دیا اور پھر کنوئیں کے من پر سے اتر کر گاؤں کی طرف لوٹ گئی

بھائی گوتم ہر زمانے میں ہر قدم پر تمہیں کوئی نند بالا ملے گی...کوئی سجاتا اور وہ تمہارے پاس آ کر تمہاری پرستش کرنا چاہے گی..اب بھی وقت ہے کہ آنکھیں کھولو ..ہری شنکر نے کہا

صبح سویرے پھر وہ اپنے سفر پر چل نکلے اور دو دن تک چلتے رہے..اب شراوستی زیادہ دور نہیں تھا...شیشم کے جنگلوں کے اختتام پر آبادی شروع ہو گئی تھی..سڑک پر دو رویہ درخت لگے تھے..جن کے پرے امرا کے مکانات تھے..ان مکانوں کے باغوں میں نقلی پہاڑیاں بنی ہوئی تھیں..اور امرود اور انار کے درختوں کے جھنڈ تھے جن پر سبز پروں والے طوطے شور مچا رہے تھے..پالتو مور مرمریں تالابوں کے کنارے کھڑے پانی میں اپنا عکس دیکھتے تھے..جامن کے درختوں میں جھولے پڑے تھے..مکانوں کی دیواروں کی سفیدی ہلکی ہلکی دھوپ میں دور ست جگمگا رہی تھی

برابر کی پگڈنڈی پر سے خانہ بدوشوں کا ایک قافلہ بیلوں پر بیٹھا گاتا بجاتا گزر گیا

چلتے چلتے دفعتاً رک کر شنکر نے گوتم کو مخاطب کیا...بھائی گوتم ویشالی کی امبا پالی

تھی گو چمپک اور سجاتا اور نند بالا سب ایک ہی ہیں .. اپنے ذہن کو انتشار سے محفوظ رکھو .. اور پھر یکلخت شنکر پگڈنڈی پر سے اتر کر واپس شیشم کے جنگلوں کی طرف مڑ گیا گوتم اسے آوازیں دیتا رہ گیا لیکن وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا

۲.................................

شراوستی کا خوبصورت شہر راپتی کے جنوبی کنارے دور دور تک پھیلا ہوا تھا .. اس کے اتر میں ذرا فاصلے پر ہماوت کے گلابی اور نیلے پہاڑ ایستادہ تھے اور دیودار کے گھنے جنگلوں اور آس پاس ترائی کے نرکلوں میں باگھ اور بگھیلے گھومتے تھے

پہاڑوں کا یہ سلسلہ بہت اوپر سے آ رہا تھا جا ہمن مان سرود کی جھیل تھی .. جس کی شفاف لہروں پر دنیا کی آتما کا راج ہنس اکیلا تیرتا تھا .. ہماوت کے اونچے پہاڑ ونگا اور کامروپ تک پھیلے تھے ان پہاڑوں کے اس پار اتر میں سونے کی رنگت والی کنچوں کا دیس تھا، وادیوں میں ان گنت روپہلے آبشار اور ٹھنڈے پانی کی ندیاں تھیں .. اور خوشبودار اچوں کے درخت اور دھان کے کھیت اور تاریک خنک جنگلوں میں گروکل بنے ہوئے تھے جہاں ملک کے نوجوان لڑکے .... شہزادے اور مفلس برہمن اور کشتری امیر زادے علم حاصل کرنے میں جٹے تھے

انہیں جنگلوں میں .. پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر جہاں دن میں بھی گھپ اندھیرا رہتا تھا .. ہاتھی پلے تھے .. راجن سال میں ایک بار کھیدا کے لیے وہاں آتے تھے ہاتھی پکڑنے والے ہانکا لگاتے .. درباریوں کا پڑاؤ ہوتا .. جنگل میں منگل لگ جاتا ہاتھیوں کا راستہ تلاش کرنے والا اور سدھانے والوں کا عملہ جنگلوں کے کنارے لکڑی اور بانس کے جھونپڑوں میں رہا کرتا تھا ان کی لڑکیاں مونگے اور فیروزے

کے رو پہلے زیور پہنے بالوں کی مینڈھیاں گوندھے ہاٹ بازار کے لیے جب میدانوں کی طرف آتیں تو شہری لڑکیاں ان کی رنگ برنگی سیاہ .سرخ اور زرد دھاریوں والی پوشاک کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتیں

اتر کوشل کی ریاست میں نگر.. پور اور نگریاں...شہر اور قصبے اور گاوں ان ہرے بھرے میدانوں میں آباد تھے جنگلوں کی افراط تھی .جن کی لکڑی سے خوبصورت مکان بنائے جاتے..اب آبادی بڑھ رہی تھی اور جنگل کٹتے جاتے تھے

شراوستی کا شہر بہت گنجان اور بارونق تھا..دور کے دیشوں سے آئے ہوئے لوگ یہاں رہتے تھے ..الگ الگ محلوں میں کاری گر..سنار..بزاز..آڑھتی اور دوسری پیشہ ور جماعتیں آباد تھیں..ان کی اپنی اپنی منڈلیاں تھیں اپنے قوانین

چوروں تک کی کنڈلی معہ ایک ضابطہ شاستر کے پاس موجود تھی بارہ مہینے چہل پہل رہتی ..ہمیشہ کوئی نہ کوئی تہوار منایا جاتا..ہر شخص اپنے اپنے کام میں منہمک تھا .مصوروں اور سنگ تراشوں کی ٹولیاں نگارخانوں میں مصروف رہتی تھیں ناٹک منڈلی میں صبح سے کھیل شروع ہو جاتا اور دن بھر جاری رہتا..نائک اور نائکائیں زرق برق کپڑے پہنے ،، چہروں پر روغن لگائے مشہور تمثیلیں پیش کرتیں ..چوراہوں پر مداری اپنے کرتب دکھاتے ..بھنگ کی دکانوں پر آوارہ گردوں ..اچکوں اور ٹھگوں کا مجمع رہتا.تہواروں کے موقع پر بنجارے تاڑی پی کر زور زور سے گاتے پھرتے ..دوم نقلیں کرتے ..دیش ناریاں چھن چھن کرتیں اپنی گلیوں میں ٹہلتیں امیر زادیاں سولہ سنگھار کیے تھالوں میں گھی کے چراغ جلائے مندروں کی اور جاتی نظر آتیں .عود اور لوبان کی خوشبو سے فضا بوجھل ہو جاتی

رتھ کار۔۔مٹی کے برتن بنانے والے۔کلاں اور بید کی ٹوکری بننے والے شہر کے باہر رہتے تھے۔۔آبادی سے بالکل الگ تھلگ چنڈالوں کی بستی تھی ان کا پنچم طبقہ چاروں زاتوں سے کم تر تھا۔محض لاشیں اٹھانا اور مردے جلانا ان کی قسمت میں لکھا تھا یہی ان کا پیشہ تھا۔۔وہ صرف مردوں کی اترن پہن سکتے تھے ان کو حکم تھا کہ ٹوٹے پھوٹے برتنوں میں کھانا کھائیں اور محض کانسی کے گہنے استعمال کریں

لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔شراوتی میں کپلاوتی کے شاکیہ منی آن کررہے تھے اورانہوں نے اوران کے حواریوں نے اپنے واعظوں میں بتلایا کہ آدمی پیدائش کی بناء پرنہیں بلکہ عمل کی بناء پر ملیچھ یا اچھوت بنتا ہے اوراب نارنجی لباسوں والے بھکشوں کی ٹولیاں بستی بستی گھوم کر چنڈالوں اوراچھوتوں کو نیک عمل کی تلقین کررہی تھیں

شراوتی کی رونق ہر موسم میں قائم رہتی۔۔گرمیاں آتیں تو امراء اپنے باغوں میں تالابوں کے کنارے جابیٹھتے۔۔یا خنک تہہ خانوں میں آرام کرتے۔۔شام کے سمے بازار میں کھوے سے کھوا چھلتا۔۔بوڑھی عورتیں موتیا اورچنبیلی کے گجرے گھروں کی ڈیوڑھیوں پر لے جاکر بیچتیں۔۔خوبصورت لڑکیاں اونچے مکانوں کے جھروکوں سے نیچے ءجھانکتیں

شہر سے باہر کھلے سبزہ زاروں میں کشتری سورما سندھ اورایران اورعرب کے اصیل گھوڑوں پر سوار ہوا سے باتیں کرتے نظر آتے۔۔گاؤں کی سمت جانے وے لے سایہ دار کچے راستوں پر کسانوں کی بیل گاڑیاں اور بہلیاں چرخ چوں کرتی نرم روی سے چلتیں

۳...

مون برت رکھنے والے برہمنوں کی مانند ..سال بھر گم سم رہنے کے بعد مینڈکوں نے طوفان کے دیوتا سے زندگی کی لہر حاصل کی ہے اور اب کیسے زور زور سے چلا رہے ہیں جس طرح طالب علم اپنے استاد کے الفاظ یک زبان ہو کر دہراتے ہیں اسی طرح ایک مینڈک دوسرے مینڈک کی بولی نقل کرتا ہے سب کے سب تلیا میں لیٹے برساتی راگ الاپنے میں جٹے ہیں

گوتم نے مسکرا کر کتاب بند کر دی اور نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا بارش جھما جھم برسنا شروع ہو گئی تھی مینڈک ٹرا رہے تھے مور جھنکار تے تھے ..پپیہا غل مچا رہا تھا ..ساون کی گھٹائیں جھوم کر اٹھی تھیں رگ وید میں صدیوں پہلے برکھارت کی جیسی منظر کشی کی گئی تھی ...وہ منظر ویسے کا ویسے بالکل اس کے سامنے موجود تھا ..کٹی کے پھونس پر لوکی کی بیل پھیلی تھی اس پر سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر گوتم کے پیروں کو بھگوئے ڈال رہے تھے وہ کٹی کے برآمدے میں بیٹھا ساون کی آوازیں سنتا رہا سازوں کا ایک بہت عظیم اجتماع تھا ..جس پر سرسوتی میگھ راگ بجا رہی تھی امن اور سکون کا راگ .....میگھ؟...اس کا ذکر میں نے ابھی کسی سے سنا ہے؟ ..کیا میں ابھی تک اپنے حافظے پر قابو نہیں پا سکا ..مجھے غیر ضروری باتیں کیوں یاد رہتی ہیں .....اس نے اداسی سے سوچا اور کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی ...اور بارش کی بوندوں کو دیکھنے لگا ..ساون کی پورن ماشی آ گئی تھی اور پڑھائی شروع ہونے والی تھی گوتم نیلمبر اپنے آشرم واپس آ چکا تھا ..آشرم شہر سے دو راسوک کے جنگل میں واقع تھا ..ندی کے کنارے کنارے جھونپڑوں میں طالب علم رہتے تھے ..اس

پارگرو کے کھیت تھے جو کہ سرکار کی طرف سے آشرم کو ملے تھے... بارش تھمتی تھی تو طالب علم ان میں کام کیا کرتے تھے ..خزاں کے مہینے میں تبت کی طرف سے اڑتے ہوئے ہنس آتے اور بسنت کے زمانے میں لوٹ جاتے..طالب علم صبح صبح جب اشنان اور عبادت کے لیے گھاٹ پر جاتے تو انہیں اپنے یہ خاموش رفیق سنیاسیوں کی طرح مراقبے میں ڈوبے ملتے

گوتم اپنے گرو کے پاس جنہیں اچاریہ کا درجہ حاصل تھا..مدتوں سے پڑھ رہا تھا..یہ اس کی تعلیم کا آخری سال تھا..اس دوارن اس نے ناٹک لکھنے اور تصویریں بنانے میں بہت شہرت پائی تھی اپنے آشرم سے باہر دوسری درسگاہوں میں بھی اس کا نام عزت سے لیا جاتا تھا اگر یہ پیدائشی شاعر ہے تو اسے پروہت بنانے کا کیا فائدہ؟ اس کے معلم نے سوچا تھا..مگر گوتم کے پاس یہی راستہ اٹل تھا راج دربار میں پروہت کی مسند اس کی منتظر تھی جس پر اس وقت اس کا باپ بیٹھا تھا...ممکن ہے کہ ایک روز وہ ایکا پروہت کے رتبے تک پہنچ جائے اور اتر کوشل کے علاوہ دوسری ریاستوں کا بھی مشیر بنے وہ بے حد ذہین لڑکا تھا اور اس کے پورو دیس میں علم کی بہت قدر کی جاتی تھی اسے فنون جنگ بھی سیکھنے پڑے تھے اور اگر اسے لکھنے پڑھنے سے زیادہ دلچسپی نہ ہوتی تو تب بھی اس کا کوئی نقصان نہ تھا مغرب کے کورو پنچالوں کے ہاں سیناپتی کو پروہت پر فوقیت حاصل تھی..گوتم اندر پرستھ جا کر فوج میں نوکری کر سکتا تھا.مگر اس نے طے کر رکھا تھا کہ وہ صرف ناٹک لکھا کریگا.فن کے نظریوں پر کتابیں تصنیف کرے گا.تصویریں اور مجسمے بنائے گا..شاعروں نے سماج سے ہمیشہ بغاوت کی ہے.. پر اس کے ساتھ ہی اسے اپنے گرو کا بڑا خیال تھا

.....وہ کبھی کوئی ایسی بات نہ کرے گا جس سے اس کے گرو کو دکھ پہنچے..

گرو چیلے کا یہ سلسلہ صدیوں سے..عالموں کے بادشاہ جنک اور رشی دتاتریہ کے زمانے سے چلا آرہا تھا..اسی آشرم کے آس پاس..ایک ہزار سال قبل...سرجو کی ایک شاخ ملینا ندی کے کنارے ایک مشہور درسگاہ موجود تھی یہ کنج..جہاں گوتم اور اس کے ساتھیوں کے جھونپڑے تھے..یہیں دوسرے لڑکے گھوما کرتے ہونگے

دوسرے لڑکے......دوسری لڑکیاں

برہمچاریہ کی زندگی بسر کر کے لڑکیاں بھی اکثر اعلی تعلیم حاصل کرتیں..رگ وید کی کئی نظمیں اور،،راہبات کے نغمے،،لڑکیوں نے لکھے تھے...شاعرہ اپالا کی نظمیں گوتم نے پڑھی تھیں......لڑکیاں بھی کیسی عجیب ہستیاں ہوتی ہونگی..گوتم کو اکثر خیال آتا

دوسرے برہمن زادوں کی مانند گوتم نیلمبر کی پڑھائی بھی پانچ سال کی عمر سے شروع کر دی گئی تھی..اب وہ پورے چوبیس سال کا ہو چکا تھا..اور اس نے الہیات تمثیل..ادب ..بھوت ودیہ ..علم عناصر ..ریاضی ..صرف ونحو ..منطق ..فلسفہ ..اخلاقیات ..اداکاری..کیمیا..طبیعات....نصاب کے سبھی علوم پڑھائے گئے تھے ..فن سپہ گری کے علاوہ وہ راگ ودیا کا بھی ماہر تھا..اتر پردیش کے رہنے والے اہل زبان سمجھے جاتے تھے..گوتم کو بھی زبان کی صحت کا بہت خیال رہتا

برسوں سے اس کی زندگی اسی دھڑے پر چل رہی تھی..وہ ماں باپ سے الگ آشرم میں رہتا..گرو کے جاگنے سے قبل طلوع آفتاب کے وقت اٹھ بیٹھتا..ندی پر جا کے نہانے کے بعد ..جنگل کے خاموش ترین حصے میں بیٹھ کر عبادت کرتا

..درختوں کے مقدس کنجوں سے ..جو دیویوں اور دیوتاؤں کے نام سے معنون تھے
اس سے سریلے بھجنوں کی آوازیں بلند ہوتیں ..عبادت کے بعد گوتم آبادی میں
جا کر دن بھر کی خوراک کے لیے بھیک حاصل کرتا..پھر لکڑیاں چن کر لاتا اور روگ
کی کٹی کی آگ روشن کی جاتی..آشرم میں روزانہ چاول ابالے جاتے تھے..اور جو کی
روٹی بنتی تھی..شراوتی میں بڑے بڑے قصاب خانے موجود تھے..شہر کی دعوتوں
میں اکثر گائے کا گوشت بھی پکتا تھا..لیکن طالب علم کو گائے کا گوشت کھانے کی
ممانعت تھی لہذا گوتم اور اس کے ساتھی گرو کو کھلانے کے بعد خود بھی اکیلے بیٹھ کر
ساگ پات ہی کھاتے تھے

اس دیس کے رہنے والوں کو صفائی کا جنون تھا..آشرم میں دن میں دس بار
جھاڑو بہاری کی جاتی..پیتل کے برتن جھونپڑوں کے برآمدے میں رکھے جگر جگر
کرتے..بات بے بات پیر دھوئے جاتے..تنکا بھی فرش پر نظر نہ آتا، پھر باغ کی
صفائی کی جاتی..اس ساری مشقت، کے بعد پڑھائی ہوتی..پڑھائی کے بعد یا دخدا
برہمچاریہ کے قوانین کٹھن تھے..گوتم کو شروع سے سکھلایا گیا کہ وہ عطر پھول
استعمال نہیں کرسکتا..سرمہ لگانے..جوتا پہننے..بارش یا دھوپ میں چھتری لے کر چلنے
کی اسے سختی سے ممانعت تھی..دریا پار کرنے کے لیے وہ کشتی استعمال نہیں کرسکتا تھا
..اسے بتالیا گیا تھا کہ طالب علم کو دن بھر کھڑا رہنا چاہیئے..رات بیٹھ کر گزارنی
مستحسن ہے..موٹا جھوٹا پہننا اور روکھا سوکھا کھانا اس کا وطیرہ ہے..لڑکیوں کے
ساتھ عزت سے پیش آنا اس کا فرض ہے..بے ضرورت دوڑ بھاگ نہ مچاو..زبان
نہایت صاف اور شستہ بولو..ایک لفظ بھی غیر فصیح منہ سے نکلنے نہ پائے..لڑکیوں کا

مزاق کبھی نہ اڑانا..عیش وعشرت..راگ رنگ سے تمھیں کوئی سروکار نہ ہونا چاہیئے ..شہر کے سرکاری قمارخانے میں معززین شام کو جمع ہو کر جوا کھیلتے..گوتم جو کہ طالب علم کی حیثیت سے بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالتا تھا..محض خواب میں ہی سکوں کے درشن کرسکتا تھا..چناچہ ایک روز اس نے خواب میں دیکھا کہ قیمتی دوشالہ اوڑھے گھٹنوں کے بل بیٹھا پن پہ پن داوپہ لگا رہا ہے..اور اس کے چاروں اور عجیب عجیب شکلوں کے لوگ جمع ہیں..ایسے لوگ جو کہ اس نے جاگتے میں شراوستی کے بازار میں بھی کبھی نہیں دیکھے تھے

لیکن گوتم اپنے گرو کا نہایت فرمانبردار اور عقیدت مند چیلا تھا اور گرو کے احکام کی تعمیل کرنا اس کا ایمان تھالہٰزا جب کبھی وہ شراوستی کے ناچ گھر یا قمارخانے کی عالی شان عمارت کے سامنے سے گزرتا تو اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا کرتا

ناچ گھر کی سیڑھیوں پر سے اکثر پاتریں گھنگھرو سنبھالے اترتی یا چڑھتی نظر آتیں سبھی طالب علم اسی طرح گور کے تابع تھے بعض مرتبہ وہ گرو کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتے بھیک مانگ کر سب سے پہلے گرو کو لا کر دیتے اور اکثر خود بھوکے رہ جاتے پچھلے وقتوں میں پنچالوں کے علاقے کا ایک طالب علم جو کہ ٹکشلا میں پڑھتا تھا،اپنے استاد کے کھیتوں کو سیلاب سے بچانے کے لیے بند باندھنے کے بجائے خود پانی کی آڑھ میں لیٹ گیا تھا

طالب علم کو حکم تھا کہ وہ ذات و نسل کے غرور اور شہرت اور نیند کی تمنا سے دور رہے،شیخی اور خودنمائی کے جزبات پر قابو پائے دماغ کا سکون اور دل کا صبر وضبط حاصل کرے

ساون کی پورنماشی سے لے کر پوس کی پورنمائشی تک پڑھائی ہوتی تھی طریقہ تعلیم سوال و جواب پر مبنی تھا۔۔ چیلا سوال کرتا گرو اس کا جواب دیتا۔۔پھر درختوں کے سائے میں بیٹھ کر آپس میں بحث ومباحثہ کرتے، بال کی کھال نکالی جاتی

اگر کبھی سیاسی ہنگاموں، جنگوں یا بیرونی حملوں کی وجہ سے پڑھائی ملتوی کرنا پڑتی یا تہواروں کی چھٹیاں ملتیں تو گوتم اکیلا ہی اپنی کٹی میں بیٹھا چراغ جلائے رات رات بھر نظمیں لکھا کرتا ...گیدڑوں کا چلانا پڑھائی کے لیے برا شگن تھا .مرگھٹ میں اور سڑک کے کنارے بیٹھ کر پڑھنا منع تھا

جاڑوں کی راتوں میں نزدیک کے جنگل میں گیدڑ چلاتے ۔ بے چاروں کو سردی لگتی ہے۔.اوڑھنے کے لیے راجن سے کمبل مانگتے ہیں۔۔گوتم کی ماں بچپن میں اس سے کہا کرتی تھی۔۔جب وہ اپنے شاندار مکان کے ایک اندرونی کمرے میں گرم، کپڑوں میں ملفوف ..چھپر کھاٹ پر لیٹا پنچ تنتر کے قصے..چندا ماوں اور ان کی بیوی روہنی اور راہو اور کیتو کی کہانی سنتا تھا..چندا اس کے ماموں تھے..سب بچوں کے ماموں تھے .کیونکہ ماموں کا رتبہ اس عہد میں بڑا تھا..وہ ماں کا بھائی تھا..اور ماں بے حد تکریم ہستی تھی ..جاڑوں کی طویل راتوں میں گیدڑ چلاتے تھے..سارا جنگل چاندنی میں سائیں سائیں کرتا، چندا ماموں اوپر کمرے میں تیرا کرتے..

اسے اپنی ماں یاد آجاتی ..پھر وہ کوشش کر کے دوبارہ صرف ونحو میں منہمک ہو جاتا

طویل چھٹیوں کے زمانے میں گوتم نیلمبر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یا تنہا اپنے موقلم یا رنگوں کی کلیاں لے کر دور دور نکل جاتا..اسی طرح وہ ایودھیا گیا..ایک مرتبہ کوسمبی جا پہنچا.مگدھ میں راج گیر کے کھنڈر اس نے چاندنی رات میں دیکھے اور

بہت اداس ہوا اور وہیں بیٹھ گیا....اس نے بھیم بسیار کے آخری دنوں کے متعلق ایک ناٹک لکھا..یہ ایک واقعہ تھا کہ اب اس کا دل صرف ونحو میں نہیں لگ رہا..وہ چاہتا تھا کہ محض فن کے نظریات پر اور بہت کچھ پڑھے اور لکھے قدم قدم پر جو سوالات ذہن کو الجھاتے ہیں ان کا کوئی حل کھوجے..ہری شنکر جو کہ اسے ایودھیا سے واپسی پر ملا بہت دلچسپ تھا.مگر اس کے معدومیت کے فلسفے سے بھی گوتم کو ڈر لگنے لگا ..قدیم برہمنوں کا فلسفہ تھا..زندگی سے موسیقی سے ..زندہ رہنے کی لگن سے بھرپور لیکن اپنشدوں کی موسیقی نے زندگی کو اور گہرا کردیا تھا..وہ جواب تک بڑے صبر و ضبط اور ذہنی سکون کی زندگی گزار رہا تھا اسے اب سرجو کے گھاٹ پر بیٹھی لڑکی یاد آجاتی جس نے کیسری ساری پہن رکھی تھی...اس کا دل چاہتا کہ ایودھیا واپس جا کر اسے تلاش کرے پتا چلائے کہ وہ کون ہے کیا کرتی ہے؟...شنکر اس کمبخت منحوس بودھ بھکشو سے، جو کہ پل کی پل میں چھلاوے کی طرح غائب ہوگیا تھا اس کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے..؟

اقامتی درسگاہوں میں نئے نئے نظریات کی ہوا وقتاً فوقتاً چلا کرتی تھی اسی طرح اپنشدوں کے مختلف فلسفے وجود میں آئے ...ان کی شرحیں لکھی گئیں مختلف مدارس فکر قائم ہوئے ..بدھ مت تازہ ترین ذہنی رواج تھا گوتم نیلمبر کے مدرسے میں بہت سے لڑکے اسی مسلک کے حامی ہو چکے تھے گوتم کی کٹیا میں شام پڑے دوسرے طالب علم آن بیٹھتے شہر کے مصور..سنگ تراش؛شاعر؛؛لیکھک اور اس طرح کے دوسرے لوگ جن کا تعلق فنون لطیفہ سے تھا اور کلا جن کا پیشہ تھا گوتم کے چھوٹے سے کمرے میں محفل جمتی لپے تلے فرش پر چٹائی بچھائی جاتی..درمیان

میں چراغ جلتا رہتا.رات گئے تک مختلف موضوع زیر بحث لائے جاتے.ادب اور فنون کے نئے اور پرانے نظریوں پر تبادلہ خیالات ہوتا..سنگیت کا مظاہرہ کیا جاتا ..سیاست کا بھی فنون لطیفہ میں شمار کیا جاتا تھا..گوتم کے دوستوں میں سبھاو کے نیتا شامل تھے طالب علم تھے جو کہ سایست پر کتابیں لکھا کرتے تھے..ان محفلوں میں سیاسی موشگافیاں کی جاتیں..ریاست اور عدم ریاست میں کاے فرق ہے؟ راجہ اور پراجا میں کیا تعلق ہونا چاہیے..وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ جائیداد ریاست کو غیر ریاست یا مہاتمابدھ کی سکھ وتی سے ممیز کرتی ہے اور سکھ وتی وہ کیفیت ہے جس میں انسان کا جسم بھی اس کا اپنا نہیں اور ریاست اور ریاست کی حدود سے ماوراء ہوکر انسان یا تو جانور بن جاتی ہے یا خدا..ملکیت...یہ میرا ہے....کے تصوراور دھرم کے احساس سے ریاست بن جاتی ہے اور ملکیت کی اجازت رایست عطا کرتی ہے ملکیت ریاست کا نتیجہ ہے..اس کی وجہ نہیں..لہذا سیاست کے طالب علموں نے طے کیا کہ ریاست اس کیفیت کا نام ہے جہاں دروازے کھلے چھوڑ کر سو سکتے ہوں عورتیں زیور پہن کر مرد کے بغیر رکھوالی کے باہر نکل سکتی ہوں اور ملکیت.فرض اور سزا کی بنیاد پر ریاست قائم ہوتی ہے..مہابھارت میں لکھا تھا کہ ڈنڈ یعنی سزا نہ ہوتو طاقتور کمزور

کو اس طرح کچلیں..جسطرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے..اور مہابھارت کی کتاب..شانتی..میں لکھا تھا کہ انسان خطرناک حد تک حریص اور تشدد پسند ہے..لہذا یہ میرا ہے کا فقرہ بھلا دینا چاہیے..مامتوا..احساس ملکیت سارے جھگڑے کی جڑ ہے::ظلم انسان کی فطرت میں داخل ہے..تہذیب اسے

اخلاق سکھا دیتی ہے اور متمدن بناتی ہے ..ریاست ڈنڈ کے ذریعے انسان کی جبلت کو ضابطے میں لاتی ہے .. بادشاہ ڈنڈ دھر ہے .مگر وہ بھی قانون سے بالاتر نہیں .لہزا منو نے حکم دیا تھا ..کہ نالائق بادشاہ کو بھی ڈنڈ سزا دے سکتا ہے ..ریاست اور سیاسی نظام انسان کے لیے ضروری ہے ..مہابھارت اور منو دونوں کے نزدیک حکومت کو سخت گیر ہونا لازمی تھا ..کیونکہ انسان فطرتا بد تھا .عوام کا فرض تھا کہ وہ اپنے وزن کے لحاظ سے اپنا فرض ادا کریں سپاہی کو محاذ پر مرنا ہوگا ..طالب علم شادی نہیں کرسکتا ..بادشاہ کا کام انصاف کرنا ہے ...یہ تفریق عمرانیات کی بنیاد پر کی گئی تھی .. چنانچہ ریاست ظہور میں آتی ہے ..تو پرجا کے ساتھ لامحالہ ورن آشرم کا بھی ظہور رہوتا ہے ..اگر پرجا اپنے فرائض انجام نہ دے تو ورن آشرم کا خاتمہ ہے

سیاسیات بڑے متضاد نظریے تھے جو کہ گوتم نے پڑھے تھے .جیمنی نے کہا تھا کہ افعال اچھے اے برے انسان کے خود پیدا کردہ ہیں ..ورنہ دنیا کے دکھوں کا سرچشمہ اگر خدا کو قرار دے دیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا ظالم ہے ..لہذا جیمنی نے ثابت کیا کہ دنیا کی اخلاقی قوت کے لیے کسی خدائی نظام کی ضرورت نہیں ..گوتم کے بدھ ساتھی بھی یہی کہتے تھے

سیاسی آزادی کا تصور ان سب کو بہت عزیز تھا ..یہ آزاد انسانوں کا سماج تھا ..یونان ..مصر ..بابل ..نینوا ؛؛ اور ایران کی ہم عصر تہذیبوں کے برعکس اس دیس کا معاشی نظام غلامی کے ادارے پر مبنی نہ تھا .شہنشاہ بھی ابھی تک نمودار نہ ہوئے تھے .ترائی کے حالقوں میں کشتریوں کی جمہوریتیں مہابھارت کے زمانے سے بھی پہلے سے موجود تھیں ..بادشاہ زمین کا مطلق العنان مالک نہ تھا ..اسے الوہی درجہ بھی

حاصل نہ تھا۔۔کرم کی طاقت کے ساتھ کسی خود مختاری کی گنجائش نہیں۔۔کرم نے ہر شئے کو غیر ضروری بنا دیا ہے۔۔۔گوتم کے ایک ہم جماعت نے اپنے ایک مقالے میں لکھا۔۔لہذا خدا بھی پاداش اور مکافات کے قانون کو توڑ نہیں سکتا۔۔اس قسم کے نظریات کی موجودگی میں مطلق العنان حکومت کا قیام ناممکن تھا۔۔۔جمہوریتوں کے زمانے میں کوی نے بادشاہ کو سنگھ مکھیا کی حیثیت سے مخاطب کر کے کہا تھا۔۔تیرے ہاتھ میں راج آیا ہے۔۔اٹھ اور اسی شان سے حکومت کر کے۔۔۔۔تجھ کو عوام نے اپنا بادشہا چنا ہے۔۔۔۔انسانوں کے اندر کی طرح اپنی راہ چل۔۔تو جو گوپا ہے گوالا۔۔۔۔وردنا۔۔اٹھ اور دنیا کے گلے کی رکھوالی کر

سارے ملک میں مختلف حیثیتوں کی حکومتیں موجود تھیں۔۔جنوب کے راجہ بھون کہلاتے تھے۔۔۔شمال کے وراٹ اور مغرب کے سوراٹ لیکن سامراجیہ کی داغ بیل مگدھ میں پڑنی شروع ہو چکی تھی۔۔یہاں کے بادشاہ مدتوں سے سمراٹ کہلا رہے تھے۔۔جس عالمگیر قومیت اور شہنشاہی کے تصور کا ذکر نیتی شاستروں میں کیا جا رہا تھا۔۔اس کو قائم کرنے کے لیے کوئی ایکرٹ بادشاہ جو کہ سارے ملک کا بادشاہ ہو ابھی تک پیدا نہیں ہوا تھا۔۔چکروتی بادشاہ۔۔۔۔جس کی مملکت کے ساتھ رتھ کا پہیہ بغیر کسی رکاوٹ کے چلتا رہے

اور شاکیہ منی نے کہا تھا۔۔۔میں شہنشاہ ہوں اے سیلا۔۔۔میں نے اچھائی کے رتھ کا چکر چلایا ہے۔۔۔۔

۳
....

وشنو گپتا۔۔۔۔گوتم نیلمبر کی کٹی میں ایک شام حسب معمول محفل سجی ہوئی تھی

اکلیش نے جو کہ نیا نیا تکشلا سے لوٹ کر آیا تھا۔ایک نئے نام کا ذکر کیا..وشنو گپتا ..نیتی پر اس کے وچار بھی سننے کے قابل ہیں....تکشلا میں تو اس نے اپنی ذہانت کی دھوم مچا رکھی تھی میں نے سنا ہے کہ وہ آجکل کسم پور کے دربار میں موجود ہے

تم کاے کرتے رہتے ہو...گوتم نے اکلیش سے پوچھا

میں......میں نے ایک نئی مورتی شروع کی ہے..کسی روز شہر آؤ تو دکھلاوں

تم شیلا کاروں کی منڈلی میں شامل ہو گئے ہو؟ کیوں کشتریوں کا نام ڈبوتے ہو..گوتم نے اسے چڑاتے ہوئے کہا

تکشلا سے لوٹ کر بہت دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا.....کوئی جنگ ہی شروع نہیں ہوئی....کیا کرتا...اکلیش نے ہنس کر جواب دیا

جنگ......وملیشور جو کہ ایک کونے میں بیٹھا ایک افیمی سے شاعر سے زبردستی اس کی نظم سن رہا تھا.....کان کھڑے کر کے بولا..تم کو کسم پورے کی تازہ خبریں معلوم ہیں؟

سب اپنی اپنی باتیں چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے...دھن نند جوال مکھی کے منہ پر بیٹھا ہے...وہ کہتا رہا..اتنی بڑی فوج کا خرچہ دیس کو اٹھانا پڑ رہا ہے..پھر جوگیشور نے مڑ کر کہا..یہ شراوستی میں وقائع نویس تھا..دودھ ؛دہی..نمک..کھانڈ ..گھاس..لکڑی..پھل..پھول...ترکاری..بیگار..ڈھور ڈنگر...ہر چیز میں سرکار اپنا حصہ بٹا رہی ہے..تم سمجھتے ہو پرجا چپ رہے گی؟

ملک کے سیاسی حالات پر زور وشور سے گفتگو شروع ہو گئی...گوتم ایک طرف کو خاموش بیٹھا سنتا رہا...عجیب عجیب نام لیے جا رہے تھے...واقعات دہرائے جا

رہتے تھے ..رائیں دی جارہی تھیں..ان سب میں شامل اور سب سے الگ بیٹھا وہ سنتا رہا...خود بھی اپنے تئیں بحث ومباحثہ میں شامل پایا..کبھی وہ جوش میں آ کر زور سے بولتا کبھی ہنستا..کبھی کسی ساتھی سے کسی نکتے پر جھگڑا کرنے لگتا..لیکن ایک گوتم نیلمبر کٹیا سے باہر موجود تھا..جنگلوں میں گھوم رہا تھا سرجو کی لہروں کو عبور کرنے میں مصروف تھا.....

ترائی کے نرکلوں میں گھاس پر سر رکھے لیٹا تھا...جبکہ یہ گوتم نیلمبر اپنے ساتھیوں سے مگدھ کی سیاست پر تبادلہ خیالات کرنے میں منہمک رہا

مگدھ میں ان دنوں نندوں کی حکومت تھی

..جو خدائے دولت کبیر سے بھی زیادہ امیر تھے

مگدھ **ملک** کی ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقتور تھا..ایک زمانہ تاھ جب کو شل بھی عروج پر تھا اجین کے بادشاہ مہاسین نے یہاں کی شہزدای سے شادی کی تھی مہا کوشل اور راور پرسن جیسی ہستیاں یہاں حکومت کرتی تھیں...عہد عتیق میں،، جب ایودھاے اس سارے دیس کی راج دھانی تھی..اس کے سورما شہزادے دور دور دکن اور لنکا تک مہمیں سر کرنے کے لیے جاتے تھے..ایودھیا کے شاہی خاندان کی ایک شاخ نے شرواستی میں اپنا راج قائم کرنے کے بعد شاکیہ اور کاشی کے علاقہ بھی اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا...پھر ایک وقت ایسا آیا جب اتر کوشل کی طاقت کی ٹکر جنوبی مگدھ سے ہوئی

مگدھ والے ہمیشہ سے کوئی نہ کوئی گڑبڑ پھیلاتے آئے تھے.. یہاں کا ایک راجہ جراسندھ جنگ عظیم میں سری کرشن اور ان کے ساتھیوں کے خلاف لڑا تھا

...اور بھیم کے ہاتھوں سے مارا گیا تھا... پرستان کا ایسا شہر گری ورج اس کا پایہ تخت تھا اور وہ راجہ ایسا زور آور تھا... مہا بھارت میں لکھا تھا کہ بھوج ہنس کے اٹھارہ حکمران اس کے رعب سے اتر پچھم بھاگ گئے تھے ...گری ورج کے قلعے میں سینکڑوں بادشاہ اس نے قید کر رکھے تھے جس طرح پہاڑوں کے غار میں شیر ہاتھیوں کو قید کرتے ہیں اور انہیں سری کرشن دیو کے پتر نے آکر آزاد کیا تھا...اسی جراسندھ کے باپ راجہ براہدرتھ نے تخت و تاج اس کے حوالے کر کے غور و فکر کی زندگی گزارنے کے لیے اپنی دونوں رانیوں کے ہمراہ بن کی راہ لی تھی اور بنوں میں جا کر فلسفی سا کیانہ کا چیلا بن گیا تھا یہی وجہ ہے کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ رشیوں کے گھر میں راکھشس جنم لیں گے

مگر جنگ عظیم سے بہت پہلے اسی علاقے کی شمالی ریاست متھلا پوری کی راج دلاری ایودھیا کے شہزادے سے بیاہ کر آئی تھی، کوشل دیس کی اس بہو کا نام سیتا تھا

ویدوں کے عہد سے لے کر اب تک مگدھ پوری طرح سے برہمنوں کے اثر میں کبھی نہ آیا تھا.. یہاں کی آبادی ہمیشہ مخلوط رہی ...ان کی اونچی ذاتوں کو بھی باہر والوں نے کبھی خالص نہ سمجھا تھا...اور مگدھ کے برہمن اور کشتری بھی کوشل دیس والوں کی نظروں میں حقیر تھے پچھلی دونوں صدیوں میں شیش ناگ خاندان کی مگدھ پر حکومت رہی...اس خاندان کے بادشاہ بھیم بسار کے عہد میں شہزادہ مہاویر اور شہزادہ سدھارتھ نے اپنے فلسفوں کا پرچار کیا تھا

زندگی کی ندی پر پل بنانے والا چوبیسواں مہاویر جو ویشالی کے کنڈ گرام میں پیدا ہوا...اہنسا کی تلقین کرتا سارے دیس میں گھوما..اور پھر دو رنگا کے جنگلوں کی

طرف نکل گیا....کپل وستی کے لمبنی گرام میں پیدا ہونے والا سدھارتھ جو کہ گری ورج کی سبز پہاڑیوں پر چلا..نرنجن ندی میں نہایا...پیپل کے درخت کے سائے میں جسے گیان حاصل ہوا.شراوستی اور کاشی کے باغوں میں..جہاں ہرن کلیاں بھرتے تھے..اس نے وعظ کیے اور جوکوسی نگر میں مرا..

بھیم بسیار کے زمانے میں یہ دونوں آئے تھے..اس کی راجدھانی کا نام گری ورج تھا..اس کے چاروں اور سرسبز پہاڑیاں تھیں..اور خوبصورت دریا اور اس کی سرزمین شاداب تھی اور سونا بہا کر لانے والی سون ندی اس میں بہتی تھی

کوشلا دیوی...شراوستی کی شہزادی...مہاراجہ پرسین جیت کی بہن.....بھیم بسیار کی ملکہ نے گری ورج کے اتار میں راج گیر آباد کیا لیکن اس کے بیٹے اجات سترو نے اپنے باپ کو فاقے دے دے کر مار ڈالا..اور گودسنگھاسن پر جا بیٹھا...رانی نے اپنے شوہر کے غم میں رو رو کر جان دے دی..تب شراوستی کے پرسن جیت نے گرج گرج کر کہا.میری لاڈلی بہن مرنے کے لیے مگدھ نہیں بھیجی گئی تھی..اتر کی جمہوریتیں کاشی کوشل کی ساتھی بنیں...اور کوسی نگر اور ویشالی اور شراوستی مگدھ کے مقابلے میں صف آراء ہوئے

تب مگدھ کے وزراء نے ویشالی والوں کے حملوں کو روکنے کی خاطر پاٹلی گرام کی چھوٹی سی بستی کے چاروں اور ایک فصیل بنائی

مگر اجات سترو جیتا اور اپنے ماموں راجہ پرسن جیت کی بیٹی بیاہ کر لے گیا ..اس کے پوتے اودے نے کسم پور آباد کیا پاٹلی گرام...پشپ پور؛؛پاٹلی پتر ..پھولوں کا شہر..پریوں کا شہر...ملک کا سب سے عظیم الشان دارلسلطنت...جہاں

سون ندی کے کنارے کنارے دلیش ناریوں کے نقرئی بجرے تیرا کرتے تھے ..
جہاں پاٹلی کی کلیاں بالوں میں سنوارے سنہری آنکھوں والی سورنا کشتی لڑکیاں مر مریں چبوتروں پر رقص کرتیں

اور گوتم سدھارتھ نے پیش گوئی کی تھی کہا یک وقت آنے والا ہے....جب یہ شہر آگ اور سیلاب اور جنگ کی نذر ہوگا...اودۓ اس شہر کا بانی ایران کے شہر داریوش اول کا ہم عصر تھا جس نے یونان پر قبضہ کیا

گوتم نیلمبر کو ایران سے بہت دلچسپی تھی اکلیش اور جو دوسرے طالب علم تکشلا سے واپس آتے ، گوتم ان سے کرید کرید کر اس انوکھے ملک کے متعلق پوچھتا ... پارسیکاوں کے شہنشاہ جو کہ بہت زبردست اور مطلق العنان تھے ....ان کی راج نیتی کے اصول جانے کیا ہونگے ان کے مذہب

میں اگنی کی پرستش مقدم تھی وہ ویدوں کے سارے خداوں کو پوجتے تھے..ویو کے علاوہ جسے وہ واہیو کہتے تھے ..وہ سورج دیوتا مترا کو مانتے تھے..ان کی زبان سنسکرت کی بہن تھی..سب سے بڑی بات یہ کہ وہ خود بھی آریا تھے۔

مگر دوسرے ملکوں پر وہ حملہ کیوں کرتے ہیں؟۔گوتم نے اداسی کے ساتھ کہا ..انسانوں کیا یک جماعت کو دوسری جماعت پر قابض نہ ہونا چاہیئے..کسی ایک قوم کا دوسری قوم کو تسخیر کرنا..کسی ایک تہذیب کا دوسری تہذیب کی بیخ کنی کرنا غلط ہے ..اخلاقی گناہ ہے...سایست کے نظریے کی بات مت کرو کہ ایک مچھلی دوسری مچھلی کو کھاتی ہے

ایرانیوں نے جب گندھارا دلیس پر حملہ کیا تو وہاں کے راجہ نے بھیم بسیار کے

پاس اپنا سفیر بھیجا تھا بخامنشی شہنشاہیت نے سپت سندھو کے اتر پچھمی علاقوں کو اپنا باج گزار بنائے رکھا..سب سے زیادہ چاندی یہیں سے ایرانی خزانے میں داخل کی جاتی تھی

ایرانی سلطنت بہت زبردست تھی...اتنی زبردست کے ایک لمحے کے لیے بھی اسے احاطہ تصور میں نہ لایا جا سکتا تھا...اس سامراج میں مصر اور بابل اور شام اور ایشیائے کوچک اور یونان کے شہر اور جزیرے اور سپت سندھو کے اتر اپتھ صوبے سبھی شامل تھے اور سر یوش کے بعد دارا نے کہا تھا..میں دارا یوش ہوں..شہنشاہ..شاہوں کا شاہ..ملکوں کا بادشاہ جن میں بھانت بھانت کے انسان بستے ہیں...اس وسیع وعریض زمین کا حاکم...گشتاسپ اک بیٹا...ایرانی...ایرانی کا بیٹا..آریہ...آریہ گھرانے کا فرزند..اور اس کے جہازوں کے بیڑے مقدس سندھو کی لہروں پر تیرتے تھے...

اور دارا یورش اول کے بیٹے ارتخشیر نے اتر اپتھ کی ان مقبوضات کے متعلق فخریہ اعلان کیا تھا....یہ علاقے جہاں دیو پوجے جاتے تھے..اہورمزدہ کی خواہش کے مطابق میں نے ان م دیوں کے مندروں کی بنیادیں ہلا دئیں...

سوس کی کیا خبریں ہیں...تم تو وہاں آئے ہو..وقائع نویس نے اکلیش کو مخاطب کیاتاھ

پچھلے دنوں کچھ تاجر پری سی پولیس سے جان بچا کر تکشلا آئے تھے وہ کہتے تھے کہ ایران میں بہت زبردست لڑائی چھڑی ہے

کہیں اور جنگ چھڑ گئی ہے..؟..وملیشور نے دوسرے کونے سے سر اٹھا کر

سوال کیا

یاونوں نے جب سے ایران کی غلامی سے چھٹا کارہ پایا ہے...ایرانی سلطنت کمزور ہوتی جارہی ہے...تمہیں ایک بات بتادوں...اکلیش نے گوتم کو مخاطب کر کے کہا..وشنو گپتا مجھ سے کہتا تھا کہ ہمارے دیش کو بھی ایک چترانت ریاست کی ضرورت ہے...جس کی دنیا کے چاروں کھونٹ تک وسعت ہو..مضبوط سامراجیہ

مجھے مضبوط سامراجیہ نہیں چاہیے..گوتم نے کہا..

ایرانیوں کی سلطنت ان کے شاہی خاندان کی پھوٹ نے ختم کی..اکلیش اطمینان سے کہتا رہا...پچھلے دنوں اروشیر سوئم قتل ہوا.پھر اس کے بیٹے کو زہر دے دیا گیا...ان کے یہاں اتنی خون کی ندیاں بہی ہیں کہ اس کے بعد تخت پر بٹھانے کے لیے انہیں کوئی بھائی بھتیجا زندہ نہ ملا...اور وہ ایک دور کے عزیز دار کو پکڑ لائے ..پرسی پولیس کے اتجر کہتے تھے کہ دارایوش سوئم بہت بہادر بادشاہ ہے..لیکن اس غریب کو یاونوں کے سیناپتی سکندر نے شکست دی جو کہ دور پچھم سے بڑی بھاری فوج لے کر آیا تھا

گوتم سنتا رہا...بھاری فوجیں.....خون کی ندیاں..شکست..فتح...اکلیش کتنے مزے سے یہ خوفناک واقعات بیان کر رہا تھا

اور اب سارا ایران سکندر کے ہاتھ میں ہے..اکلیش نے بات ختم کی

یعنی پارسیکاوں کی چترانت ریاست کا مالک...اب جس کا تم نے نام لیا ہے ...سکندر ہے.....

گوتم نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ پوچھا..ہاں.....وہی ہے...اکلیش نے

یکلخت ذرا ہچکچا کر جواب دیا..وہ گوتم کے تبسم کے معنی سمجھ گیا تھا.....

بھائی اکلیش تم کھشتری ہو..حکومتیں قائم کرنا اور حکومتیں اکھاڑ کر پھینک دینا تمہارا کام ہے..میں تمہیں کیا سمجھا سکتا ہوں....گوتم نے کچھ دیر کے بعد آہستہ سے کہا....

گوتم اکلیش نے چراغ میں تیل ڈال کرا سے پھر وسط میں رکھ دیا..اور گوتم کو غور سے دیکھنے لگاتم کو اگر کسی جنگ میں شامل ہونا پڑے تو کیا تم لڑنے سے انکار کرو گے؟

گوتم اکلیش کے اس سوال سے لڑکھڑا گیا..یہ سوال وہ مدتوں سے اپنے آپ سے کر رہا تھا....کیا دنیا میں ایسے لوگوں کی جگہ ہے جو کہ بغیر لڑے زندہ رہنا چاہتے ہوں...؟ اسے جو فنون جنگ سکھائے گئے ہیں کیا وہ استعمال کرے گا....؟

تم سمجھتے ہو کہ پرجا چپ رہے گی...کٹی کے دوسرے کونے میں بیٹھا ہوا جوگیش ولیشور سے کہہ رہا تھا...

ہرگز نہیں...دوسرے نے جوش سے جواب دیا..کوئی دن جاتا ہے...کوئی دن .....دیکھ لینا

گوتم ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جو کہ مگدھ کے سیاسی حالات پر زور شور سے تبصرہ کرنے میں مصروف تھے.....

اجات سترو کے پوتے کے بعد مہا پدم نند پاٹلی پتر کے تخت پر قابض ہوا...اس کی ماں شودر تھی اور اس کا باپ نائی....یہ مہا پدم پتی نند تھا.....بے حد و حساب دولت کا مالک....اور اگر سین تھا....زبردست فوجوں کا سپہ سالار...اس کے

بعد اس کے آٹھ بیٹے بارہ سال کے عرصے میں یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے اور اسی لیے یہ خاندان نو نند کہلایا...اس کا آٹھواں بیٹا دھن نند تھا...جس کے خزانے ہیرے جواہرات اور سونے چاندی سے پٹے پڑے تھے....اور جس کے لشکر میں بیس ہزار سوار؛؛ دو لاکھ پیادے..دو ہزار جنگی رتھ اور تین ہزار ہاتھی تھے...اور جو محصول بڑھائے جا رہا تھا...اور جس کی پرجا بےچین تھی

سارے دیش میں برہمنوں اور کشتریوں کا راج تھا..سندھ کی وادی میں برہمنوں کی حکومت تھی..لیکن مگدھ میں مہاپدم پتی نند کے عہد سے کھشتریوں کی حکومت کا خاتمہ شودروں کے دور کے آغاز سے ہوا تھا

شراوستی والے مگدھ کے باسیوں کو پہلے ہی کب خاطر میں لاتے تھے.. برہمنوں کا احساس برتری....آریاوں کے اس دور کی یادگار تھا...جب انہیں ڈینیوب کے ساحلوں پر قبائلی فوقیت حاصل تھی..اس زمانے میں روما کا ہم عصر سماج اور فرانس کا کیتلک معاشرہ کاہنوں....جنگجو سپاہیوں اور عام کاریگروں کے فرقے میں بٹا ہوا تھا...اور اس احساس برتری کا برہمنوں کے پاس اب بہر حال کوئی عالج نہ تھا...

اور گو طالب علم کا فرض تھا...کہ وہ نسل اور ذات کے غرور سے بچے...لیکن گوتم اور اس کے جمہوریت پسند ساتھی شودروں کو بہر حال برداشت نہ کر سکتے تھے..

پاٹلی پتر کا دھن نند جو االکھی کے دہانے پر بیٹھا تھا

۵...

ایک روز طالب علموں کی ایک ٹولی کے ساتھ ہری شنکر بھی آشرم میں آن موجود

ہوا...گوتم جو اس سے اپنی کٹی میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ایک تصویر بنا رہا تھا...اسے دروزاے میں کھڑا دیکھ کر بھونچکا رہ گیا...

میں اندر آجاوں..دہلیز پر پہنچ کر شنکر نے مسکراتے ہوئے پوچھا

آو آو.......کیسے آنا ہوا......گوتم نے گلہری کی دم کا مو قلم اور رنگوں کی کلیاں اور سفید چینی پٹہ ایک طرف کو سمیٹتے ہوئے کہا

ہری شنکر آتے کے ساتھ ہی چینی پٹے کو گور سے دیکھنے میں مصروف ہو گیا

گوتم نے جلدی سے فرش پر دوبارہ جھاڑو پھیر کر چٹائی بچھائی.....بھوج پتر....ریشم اور تانبے کی تختیوں پر لکھی ہوئی کتابوں کو جو انبار چاروں طرف بکھرا پڑا تھا اسے سمیٹ کر ایک کونے میں رکھا...دوسرے کونے میں گنتی کے چند برتن اوندھے سیدھے پڑے تھے..کھڑکی کے نزدیک اس کا کمبل بچھا تھا..جس پر وہ رات کو سوتا تھا...اس کا کشکول چھپر کے ایک بانس میں ٹکا تھا کٹیا میں اس وقت خاصی بے ترتیبی تھی....گوتم کو بڑی ندامت محسوس ہوئی.....وہ ہری شنکر کی سحر انگیز اور پر سکون شخصیت سے متاثر ہو چکا تھا...جانے یہ مجھے کیسا بے ڈھنگا لڑکا سمجھے گا...اس نے پریشان ہو کر سوچا...پھر سرعت سے مہمان نوازی میں جت گیا

اس نے ٹھنڈے پانی کی گڈوی ہری شنکر کے س سامنے رکھی..پھر برآمدے میں جا کر چولہا روشن کیے اور چاول ابلنے کے لیے چڑھا دیے..

ہری شنکر متبسم انداز میں اپنے میزبان کی یہ ساری تیاریاں دیکھ رہا تھا گوشت کے بغیر مہمان نوازی مکمل نہ ہو سکتی تھی..اسی بڑابڑاہٹ میں وہ چادر کو کندھے پر ڈال کر باہر جانے کے لیے اٹھا

کہاں جاتے ہو...؟شنکر نے چونک کر دریافت کیا

بستی سے ماس مانگ لاوں...ابھی آیا

ماس........ہری شنکر کے خوبصورت چہرے پر کرب کی لہر دوڑ گئی

ارے...گوتم دفعتا خاموش ہو گیا.اسے اور زیادہ خفت محسوس ہوئی..اسے اپنی بےوقوفی پر سخت غصہ آیا...وہ جانتا ہے کہ ہری شنکر بھکشو ہے..اور اہنسا کے اس نئے اصول کا قائل....پھر اسے شنکر کو ماس کھلانے کا خیال کیسے آیا کیونکہ وہ خود مدتوں سے ماس کھانے کے لیے بےچین ہے..لیکن برمچاریہ کے قوانین کو توڑ نہیں سکتا ..اور یہ انوکھا بے تکا بھکشو اسے بےحد عزیز ہے اور اپنی عزیز ہستی کو اپنی پسندیدہ شے ہی پیش کر کے دل کو سکون اور خوشی حاصل ہوتی ہے..اس طور پر اپنی حماقت کا تجزیہ کر کے اسے ذرا اطیمنان حاصل ہوا..دفعتا اسے خیال آیا کہ ایک اور پسندیدہ شے ہے جو کہ وہ سوجو کے پاس چھوڑ آیا ہے...غالبا وہ دونوں چھوڑ آئے ہیں..اور اس ءہری شنکر جانتا ہے...اور حسد کا جزبہ اس کے دل میں اٹدا...اور اس کے چہرے پر سے ایک بادل سا گزر گیا..

پھر وہ ہری شنکر سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا..وہ اتنے دنوں تک کہاں رہا ؟..کہاں کہاں گیا؟..کیا کیا سوچا...کیونکہ سوچنا ہی ان لوگوں کا خاص مشغلہ تھا

اس کے بعد اس نے شنکر کے سامنے سے اس کے جھوٹے برتن اٹھائے

تم میری اتنی عزت کیوں کرتے ہو..شنکر نے پوچھا..

پتا نہیں..کیونکہ اگر دیکھا جائے تو میں خود کافی عزت کے قابل ہوں..اس نے ہنس کر جواب دیا

برہمن ایک بات بتلاؤ

ہوں

خواہشیں تم کو بہت ستاتی ہیں

یعنی

مثلاً..یہی ماس کی خواہش

پتا نہیں...

تم نے کبھی قربانی کے فلسفے پر غور کیا ہے؟

آج کل میں اسی پر غور کر رہا ہوں ..مگر کس طرح کی قربانی ...جان کی ...یا روح کی...؟ جو بھی شے تمہارے تصرف میں آئے گی ..وہ گویا اپنے وجود کی قربانی تمہیں دے گی

میں سمجھا نہیں

تم خوب سمجھتے ہو

میں کیا کر سکتا ہوں اگر..گوتم نے گھبرا کر بات کو ٹالنا چاہا...اگر میرے پس منظر میں خون ہے..میرے چاروں طرف خون ہے..میں اتنے سارے خون کا کفارہ کس طرح ادا کروں گا؟

ہری شنکر خاموش رہا..پھر وہ دونوں کھڑکی میں جا کر کھڑے ہو گئے

باہر سبزہ زاروں میں کسانوں کے بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں ...اور چرواہوں کی بانسریوں کی آوازیں آ رہی تھیں...شکاریوں کے بالوں میں سجے ہوئے پر ہوا میں لہراتے تھے..ندی کے اس پار کھشتری امیر زادے اپنے باغوں میں

تیر اندازی سیکھنے میں مصروف تھے

زندگی جاری تھی

مجھے زندگی کے متعلق کچھ بتلاو

تمہاری زندگی تمہاری اپنی ہے...میری زندگی سے علیحدہ ہے ..میں تم کو کچھ نہیں بتا سکتا

گوتم نے دھیرے سے کونے میں جا کر تاڑ کا ایک صاف پتہ اٹھایا..مجھ سے امن کے متعلق باتیں کرو..میں لکھوں گا..وہ...اس نے قلم نکالا او رفرش پر آلتی پالتی مر کر بیٹھ گیا..میں اپنی کتاب کا دوسرا باب لکھوں گا

لیکن تمہاری کتاب کا آخری باب کون لکھے گا...

سارے میں تاریخ کا اتھاہ سمندر ہے..جس میں ہم اور تم پتوں ی طرح ڈول رہے ہیں...مجھ سے پہلے اب تک جو کچھ ہوا اس کی زمہ داری مجھ پر ہے یا نہیں ...؟بتاو میں کیا لکھوں...گوتم نے پوچھا

وقت کا تعین کرنے کی ضرورت نہیں ...سب خواب کی طرح گزر رہا ہے ....گزر جائے گا...ہری شنکر نے جواب دیا

گزر جائے گا یا گزرتا رہے گا...؟ گوتم نے پوچاھ

یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے....

مجھے اہنسا کے متعلق بتاو

برہمن ہو کر اہنسا کے قائل ہونا چاہتے ہو...ہری شنکر نے ہنس کر پوچھا

گوتم بھی ہنسا....ہاں بڑی عجیب بات ہے ہے ناں؟ اس نے نظریں اٹھا کر

شنکر کو دیکھا

جانوروں کو مارنا ہزاروں برسوں سے برہمنوں کا خاص مشغلہ رہا ہے..جب یہ آریہ مشرقی یورپ اور وسط ایشیا کی چراگاہوں میں گھومتے تھے .تب زندہ رہنے کے لیے اور گرم رہنے کے لیے درندوں کا شکار ان کے لیے ضروری تھا...اسی وجہ سے گنگا اور جمنا کے انتر ویدی علاقے میں آن کر بسنے کے بعد بھی ان کی معرفت اور ان کے فلسفے کے ارتقاء میں جانورون کے خون بہانے کا بڑا دخل رہا ہے...ان کی کوئی عبادت قربانی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی...سام ویدوں کے اصولوں کے مطابق قربان گاہ ایک زبردست رمزیت کی حامل تھی ...خود تخلیق کائنات مابعد الطبیعات کے نقطہء نظر سے ایک عظیم آفاقی قربانی تھی..اور کائنات کی کلیت اور اس کے بقاء کی علامت تصور کی جاتی تھی؛...چکروتی راجہ کے لیے گھوڑے کی قربانی لازمی تھی

کھیتوں کے اس پار الاو روشن کیے جارہے تھے...بہت دور گاوں کے سرے پر چوپال میں محفل جمی تھی .. بھاٹ جنگ عظیم کی داستان سنا رہا تھا..شام کے مکمل سناٹے میں ہوا کے جھونکے کے ساتھ اس کی پاٹ دار آواز کی لہر تیرتی ہوئی گوتم کی کٹی سے آٹکرائی...پھر خاموشی چھا گئی...

لیکن گوتم کا دل دھڑکتا رہا

یہ سناٹے مجھے طرح طرح کی داستانیں سناتے ہیں..الفاظ کے خاتمے میں بھی میری نجات نہیں..گوتم نے اپنے آپ سے کہا اور رہری شنکر کو دیکھتا رہا...

قربانی کا تصور...لڑائی کا فلسفہ...جنگ اور امن کا مسئلہ..یہاں برہمن تلوار

لیے گھومتے تھے ....اور کھشتری فلسفی بن جاتے تھے ...ورن اور جاتی کی تفریق ابھی شدید نہیں تھی ...نیتی شاستر ..ویدوں اور اتہاس پرانوں کی تعلیم برہمن اور کھشتری دونوں کے لیے لازمی تھی...ویدوں کے عہد میں پچھی کرت اگنی ...راستے تیار کرنے والی مقدس آتش ...کی عبادت گھنے جنگلوں میں پگڈنڈیاں بناتی مشرق تک پہنچ چکی تھی.... پورب میں گوتم نیلمبر کے سفید فام ہم قوموں نے ناگاوں کو اپنی تہذیب کے دامن میں سمیٹا...پچھم میں سندھو کے کنارے بسے ہوئے شہروں پر اندر کا قہر ٹوٹا ... ہری یو پیا کا نگر میدان کارزار میں تبدیل ہو گیا ...جہاں نادر کے زرہ بکتر میں ملبوس ....سپاہی لڑے اور فتح یاب ہوئے ...سندھو کا شہر... جہاں کہنیوں تک کپڑے پہنے ہوئے ...ماتھے پر تلک لگائے ہوے ...گلے میں سیاہ پوتھ پہنے ...کندن کے رنگوں والی سہاگنیں ..شیو ...درگاہ ...دیپ ...لاکشمی اور پیپل کی دیوی کی آرتی اتارتیں یہ لوہ جنہوں نے اپنے تمدن کو راجھستان ...سوراشٹر اور پچھمی اتر پردیش تک پھیلایا تھا....ایک روز شمال مغرب کے اونچے پہاڑوں کے اس پار.... کسی انجانے دیش سے گویا اندر مہاراج کا سب رفتار جنگی رتھ آیا..اور ان سب کو روندتا ہوا آگے نکل گیا

برہم ورت پہنچ کر یہ سنہری رتھ رک گئے....اور ان لوگوں نے اندر پرستھ آباد کیا...اور حمدیں لکھیں اور موسیقی تیار کی

اب تہذیب کے مرکز اندر پرستھ اور یادو خاندان کی راجدھانی سے ہٹ کر مشرق تک آ چکے تھے ...یہ ایودھیا اور شرواستی اور اجینی کے عروج کا زمانہ تھا ...مگدھ اور اتر کوشل کے انتہائی مہذب باشندے اب شمال مغرب اور سرسوتی کے

اس پار رہنے والوں کو نیم وحشی اور جاہل گردانتے تھے

گوتم نیلمبر کی تاریخ عظیم ناموں سے پر تھی..ان میں سے بہت سے نام اب روایت اور اسرار کے دھندلکے میں جا چھپے تھے...جس طرح ہماوت کی اونچی پہاڑیوں پر دھند جمع ہو جاتی ہے...

گوتم کو ماضی سے ڈر لگتا تھا..کیا ضرورت تھی....کیا وجہ تھی کہ ان سب کا یہ تسلسل قائم تھا...جاری و ساری...اور کب تک ایسا رہے گا...ڈگ وجے شری رام چندر کے عہد سے دواپار شروع ہوا تھا..جس کا اختتام جنگ عظیم پر ہوا...مہابھارت کے بعد..سری کرشن کے عالم موجودات سے روپوش ہونے کے ساتھ ہی کالی یگ شروع ہو گیا...جو کہ اب تک باقی تھا

اس کالی یگ میں کیا ہو گا؟

پرانوں کی داستانیں اس نے پڑھ رکھی تھیں...جن میں کائنات کی مادے سے تخلیق کا بیان تھا....اور خداوں اور فلسفیوں کے قصے اور شاہی خاندان کے نسب نامے...پراکرت کی تاریخوں پر ان قصوں کی بنیاد تھی...جو کہ صدیوں سے درباروں اور چوپالوں میں داستان گو سناتے آرہے تھے...ان پرانوں میں چالیس چالیس ہزار اشعار ہوتے تھے.....جو وشنو اور شیو کی حمد کے ساتھ شروع کیے جاتے تھے...پرانوں کے مطابق ارجن کے پوتے کے وقت سے لے کر جس کے دربار میں پہلی بار جنگ نامہ مہابھارت سنایا گیا تھا..مہاپدم نند کے عہد تک ایک ہزار سال کا وقفہ گزر گیا تھا...ارجن سے لے کر اودے تک چوبیس پشتیں گزر چکی تھیں...اودے کے دور حکومت میں شاکیہ منی پیدا ہوئے

گوتم نیلمبر نے نظریں اٹھا کر شنکر کو دیکھا جو کہ بڑی دلچسپی کے ساتھ پیتل کی ایک تختی پڑھنے میں مصروف تھا۔ کھڑکی کے باہر گیندے کے پھول غروب آفتاب کی روشنی میں قرمزی نظر آرہے تھے۔۔۔گوتم کی جھنجھلاہٹ بڑھتی گئی

اس کا فیصلہ کرنے والا کون ہوگا؟ کہ کون کس سے برتر ہے۔۔۔کس نے کس پر فتح پائی۔۔۔کون کورو ہے کون پانڈو؟

جنگ عظیم آج سے سینکڑوں برس قبل کوروکیشتر میں لڑی گئی تھی۔۔۔اور ہستناپور کے ان بہادروں کے قصے۔۔جنہوں نے دروپدی سے بیاہ رچانے کے بعد اندر پرستھ کا ایسا خوبصورت شہر آباد کیا تھا۔۔۔گانے والے وینا اور مردنگ بجا بجا کر گاؤں گاؤں سناتے پھرتے تھے سورماؤں کا تزکرہ رگ وید اور قدیم ترین برہمن ادب میں موجود تھا جس میں ہر چیز اصل سے بڑی دکھائی دیتی تھی۔۔بادلوں کی گرج۔۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ۔۔عظیم معرکے۔۔۔۔دلاور سورما۔۔نورانی رشی۔۔۔آسمانی سنگیت۔۔پری وش لڑکیاں۔۔شکنتلا۔۔دمینتی۔۔کاشی کے راجہ کی بیٹی امبا۔۔۔یہ سب طلسماتی ہستیاں ڈیڑھ دو ہزار برس قبل زندہ رہی ہونگی۔۔انہی جگہوں پر چلتی پھرتی ہونگی۔۔یہ سب سوچ کر گوتم کو بڑا عجیب سا لگتا۔۔کہ ایک وقت تھا کہ نربدا اور تاپتی کے درمیان راجہ نل کی حکمرانی تھی۔۔دمینتی برار کی راج کماری تھی۔۔سیتا مہارانی کے بابا کا ملک اسی گنگا کے اتر میں گنڈک ندی کے کنارے آباد تھا۔۔پل کی پل میں وہ سارا زمانہ داستان میں تبدیل ہوگیا۔۔اور یہ وقت جس میں وہ زندہ تھا وہ خود گوتم نیلمبر برہمن۔۔ہری شنکر بھکشو۔۔جو کہ کھڑکی کے پاس بیٹھا مطالعے میں مصروف تاھ۔۔اور راہو دھیا کی چمپک اور باہر آشرم کے کنج میں ٹہلتے ہوئے طالب علم۔۔یہ سب کے سب ایک آن میں ما

ضی کے دھندلے ..نا قابل یقین..غیر حقیقی کرداروں کی حیثیت اختیار کر لیں گے
..جن کی کائنات کے ..وقت کے بہتے ہوئے سمندر میں کوئی حیثیت نہیں ہو گی
..بھیم..دریودھن..کرشن..ارجن..

اگر کسی وقت مجھے جنگ میں شامل ہونا پڑ گیا تو کیا میں لڑوں گا ؟..اس نے
چوروں کی طرح ہری شنکر کو دیکھا..اکلیش کہہ رہا تھا کہ جنگ کوئی دن جاتا ہے کہ
چھڑ جائے گی.تم لڑو گے؟..اس نے یکلخت بآواز بلند سوال کیا..

ہم محض اپنے خیالات کا نتیجہ ہیں..ہری شنکر نے جواب دیا

لیکن کیا تم لڑو گے؟ گوتم نے ضد سے دہرایا

ہر انسان سے اس کے افعال..ضرورت یا حادثے یا اس کی فطرت کی وجہ سے
سرزد ہو جاتے ہیں ..وہ خود مختار نہیں ہے ذمہ داری کی کوئی اہمیت نہیں..ہری شنکر
تختیاں ایک طرف رکھ کر کھڑکی کے نزدیک چلا گیا

دفعتاً دریا پر بہت سی روشنیاں جھلملا اٹھیں..

کسی کی بارات جا رہی ہے..گوتم نے اظہار خیال کیا....

ہوں....

یا ممکن ہے شاہی بجرے نے ادھر کا رخ کیا ہو..

چلو باہر چلیں ..اندھیرے میں میرا دم گھبراتا ہے ..ہری شنکر نے بیک وقت
وحشت زدہ ہو کر کہا

وہ دونوں آشرم کے باغ سے نکل کر گاؤں کے راستے پر آ گئے..بارشوں کا
زمانہ....ختم ہو چکا تھا..فضا میں ہلکی سی خنکی آ گئی تھی چوپال کی طرف سے بھاٹ کے

گانے کی آواز اب زیادہ صاف سنائی دینے لگی تھی

گوتم خاموشی سے شنکر کے ساتھ ساتھ چلتا رہا..پھر ٹھٹک کر اس نے اداسی سے کہا.تم خود پرست ہو ہری شنکر.تم کو دوسروں کی پروانہیں..اپنے ذہن کے بل پر اپنے آپ کو ارہت کے درجے پر پہنچا دینا کونسی بڑی بات ہے.تم کو اس سے کیا غرض کہ دوسروں پر کیا بیت سکتی ہے

مجھ کو خوب معلوم ہے کہ دوسروں پر کیا بیت سکتی ہے..ہری شنکر نے مختصر جواب دیا..آؤ ادھر چل کر دیکھیں کہ کیا ہو رہا ہے؟

گوتم چپ ہو گیا...وہ دونوں چوپال کی طرف بڑھنے لگے

تم بھیشم کا قصہ سنو گے..مجمعے کے قریب پہنچ کر گوتم نے غیر یقنی سے انداز میں اپنے اس تھی سے پوچھا

کیا حرج ہے اسے جواب ملا

ان دونوں کے برہمچاری لباس دیکھ کر سامعین نے فوراً تعظیماً ان کے لیے جگہ خالی کر دی..بھاٹ لہک لہک کر قصہ سنایا گیا..گوتم نے اسے پہچان لیا..اس نے وہیں سے کھڑے کھڑے مسکرا کر اسے پرنام کیا اور خود بھی قصہ سننے میں مصروف ہو گیا..یہ لوگ صدیوں سے اسی طرح گاتے بجاتے اور ان داستانوں پر سر دھنتے چلے آرہے تھے...رگ وید کے زمانے مے اندرا اور دوسرے خداؤں کی تقدیس کے لحن الاپے جاتے تھے بادشاہوں کے اشومیدھ [گھوڑے کی قربانی] منعقد کروانے والے فرمانراؤں کے قصے پڑھے جاتے تھے..اس نے ایسے ایسے دان دیے..ایسی ایسی لڑائیاں لڑئیں..ایسی ایسی فتوحات حاصل کیں اور کاہن ہوترا

سے کہتا..قصے کا آغاز کرو.قربانی کرنے والے کو دوسرے انسانوں سے اوپر اٹھا

و..شام پڑے بربط نواز اتر مند راگ کی دھن میں رزمیہ گیت چھیڑتے

عہد عتیق میں ارجن ..واسو دیو اور دوسرے بہادروں کے دربار میں اسی طرح

وینا.مر دنگ اور شنکھ کی سنگیت میں یہ نغمے الاپے گئے تھے

سر مسلسل ہے.....

پرانے زمانے میں درباری بھاٹ کھشتری ہوتا تھا..بعد میں درباری شاعری

نے رزمیہ داستانوں کے لیے راستہ تیار کیا..اب چھوٹی چھوٹی ریاستیں ٹوٹ کر ختم

ہو رہی تھیں...اور شاعر جو کہ پہلے درباروں سے وابستہ تھے..اب گلی گلی اور گاوں

گاوں گھوم کر اپنی روزی کماتے تھے..رسمی اور باضابطہ مزہب کی جڑیں مضبوط ہوتی

جارہی تھیں..خالص رزمیہ شاعری میں مزہبی عنصر شامل ہو رہا تھا..پروہتوں نے

مہابھارت کے جنگ نامے کو اخلاقیات کے درس میں تبدیل کر دیا تھا...کھشتری

بھاٹ کی جگہ برہمن داستان گو نے حاصل کر لی تھی..تاریخ رفتہ رفتہ پیچھے پیچھے ہٹتی

جارہی تھی..تاریخ کے کردار فلسفیانہ اور مذہبی لبادہ اوڑھ چکے تھے

اب داستان گو کاشی کے راجہ کی بیٹی تینوں بیٹیوں کی کہانیاں سنا رہا تھا..جن کو

بھیشم میں ان کے سوئمبر کے وقت لے اڑے تھے..کچھ دیر کے بعد ارجن کا قصہ

شروع ہوا..گوتم اب ذرا آرام سے ایک ستون کا سہارا لے کر بیٹھ گیا تھا..ہری شنکر

ماحول سے بے نیاز دوسری سیڑھی پر بیٹھا رہا..

یہ ارجن بھی خوب شے تھے..گوتم نے سوچا..سب سے پہلے انہوں نے دروپدی

سے بیاہ رچایا..جب بارہ برس کی بن باس انہیں ملی تو وہ سری کرن کی بہن سبھدرا کو

بھگا کر لے گئے جال وطنی کے زمانے میں منی پور کی شہزادی چترانگدا سے شادی کر لی..ان سب کے علاوہ بھائی ارجن نے الوپی کو پرچایا..وہ الگ..گوتم کو ہنسی آ گئی وہ ذرا غور سے کہانی سننے میں مصروف ہو گیا

اس وقت تک دونوں فریق کوروکھیشتر کے میدان میں آمنے سامنے پہنچ چکے تھے..رزمیہ شاعری میں نسلوں یا قوموں کی ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کا ذکر نہ ہوتا تھا.. بہادر سورماؤں کا مقابلہ ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ اصل موضوع تھا .شہرت حاصل کرنا سورماؤں کا اصل مقصد حیات تھا..اور اپنی شجاعت پر نازاں ہونا اس کے لیے جائز..اس کے حریف کے لیے لازم تھا کہ اس کے ہم پلہ ہو ..بادشاہوں کے بیٹے اپنے سے کم حیثیت کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتے تھے..جس وقت گوتم سبھا سے اٹھ کر باہر جانے لگے..اس سے ارجن لاکار کر کرن سے اس کا شجرہ نسب دریافت کر رہا تھا

مہابھارت کے یہ سارے کردار جنگجو ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفی بھی تھے..یہ روایتیں نہیں تھیں..تاریخی شخصیتیں تھیں..حتکہ نیم الوہی کردار بھی صحیح تھے..جن کی دیبی لکشمی کی طرح کنول کے پھول سے تخلیق ہوئی تھی..اور جن کی جٹاوں سے گنگا بہتی تھی..کیونکہ گوتم اپنے ملک کے شعراء کے زور تخیل کا بڑا قائل تھا..اور دیو مالا بہر حال فلسفے کی ٹھوس شکل تھی..اور روایت کا جال بن لینا ذہن کے لیے بہر حال آسان ترین بات ہے..گوتم خود بھی شاعر تھا اور شاعر ہمیشہ اپنے کرداروں کو مثالی بنا کر پیش کرتے ہی آئے ہیں..اروشی اگر اپسرا تھی تو کیا وہ لڑکی جو کہ ایودھیا کے گھاٹ پر بیٹھی تھی..کوئی بھی کوی اسے اپسرا نہیں سمجھے گا تو کیا سمجھے گا کیا وہ اس روز پا

ندی کے کنارے بیٹھی جل پری نہیں محسوس ہو رہی تھی؟

سڑک پر آ کر تاروں بھرے آسمان کے نیچے گوتم نے ایک لمبا سانس لیا.. بھاٹ کی آواز اس کا تعاقب کرتی رہی.. بھیم.. ارجن.. کرن.. بھیم

جگمگاتے ہوئے بجرے دریا کو عبور کر چکے تھے.. اور دور سے ندی کے گھاٹ پر بڑی چہل پہل نظر آ رہی تھی.. یہ کسی کی بارات ہے؟

اس نے ایک راہ گیر سے سوال کیا

نہیں تو.. راجن ایودھیا سے آئے ہیں.. راہ گیر نے جواب دیا

گوتم نے چونک کر شنکر کو آواز دی.. پھر پلٹ کر چاروں طرف نظر دوڑائی.. لیکن شنکر حسب معمول غائب ہو چکا تھا.. اور گاؤں والوں کی بھیڑ میں جو کہ چوپال کے باہر جمع تھی شنکر کا پتا چلانا لاحاصل تھا..

گوتم نے چادر کندھے پر ڈالی اور شہر کی طرف چل کھڑا ہوا

وسط شہر میں پہنچ کر اسے اپنی حویلی کی روشنیاں دکھلائی پڑیں.. وہ فوراً دوسری گلی میں مڑ گیا.. سنہرے اور سبز اور گلابی مکان پر ہلکی ہلکی دھند چھا رہی تھی.. ایک عورت لمبا سا گھونگھٹ کاڑھے چھاگل بجاتی قریب سے گزر گئی.. تاڑی خانوں میں ہلڑ مچ رہا تھا

دکانوں پر خرید و فروخت ہو رہی تھی.. بازار کی سڑک پر دونوں طرف مشعلیں روشن تھیں.. ان کی جھلملاتی روشنی میں شہر کے امیر زادے اور بانکے زرتار کپڑے پہنے مونچھوں پر تاؤ دیتے اکڑتے پھرتے تھے.. بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دے رہی تھیں.. اس ہجوم میں خود کو موجود پا کر ایک لمحے کے لیے گوتم کو بڑا اچنبھا سا

ہوا.. میں یہاں کیا کر رہا ہوں .. تیز تیز قدم اٹھاتا وہ شہر سے باہر نکل گیا .. جدھر آم کے کنج میں ایک خاموش عمارت پتوں میں چھپی کھڑی تھی .. اس عمارت کے سامنے جھیل تھی .. جھیل میں ایک اکیلی ناؤ جس کا ملاح مسافروں کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا..

اس عمارت میں سو سال ادھر شاکیہ منی آ کر رہے تھے .. اس کنج میں ان کے چیلے گھوما کرتے تھے .. صرف سو سال ادھر

گوتم کا جی چاہا کہ وہ عمارت کے اندر جائے اور اس کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر سوچتا رہے .. مگر قریب جانے کی بجائے وہ پھر صرف آدھے راستے سے لوٹ آیا .. اور آہستہ آہستہ آشرم کی طرف روانہ ہو گیا

آزادی نہیں ہے .. آزادی نہیں ہے .. کھلی فضاؤں میں .. بسر ساگر کی لہروں میں .. ذہن کی وسعت میں .. آزادی کہیں نہیں ہے میں بندھا ہوا ہوں .. میں کچھ نہیں کر سکتا .. کچھ نہیں کر سکوں گا ..

یہاں تک کہ ایک روز تاریخ .... ناموں کا تسلسل .. زمان و مکان مجھے نگل جائیں گے ..

آشرم میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ گرو کے جھونپڑے میں چراغ جل رہا تھا .. وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوا .. جہاں اکلیش اور دوسرے طالب علم جمع ہو چکے تھے

۲..

گرو نے وینا ایک طرف رکھ دی اور سر اٹھا کر گوتم کی طرف دیکھا ..... یہ ہے ..... یہ ہے ..... یہ نہیں ہے ..... یہ نہیں ہے ....

ہاں گوتم نے جواب دیا...

قید کی حالت میں آنند مایہ سب سے بڑی مسرت ہے جو جیو حاصل کر سکتا ہے

..گرو نے کہا

آنند مایا سب سے بڑی مسرت ہے..گوتم نے دہرایا

مقید روحوں کے لیے پرکھوں کی راہ موجود ہے..وہ جسے بار بار جنم لینا ہے...

میرے پرکھ... بھاٹ کی آواز گوتم کے کانوں میں گونجی

اور روح دھوئیں اور رات اور راماوس کی اندھیری تاریخی راتوں میں سے گزرتی ہے ..وقت اپنے آپ سے منحرف نہیں ہوتا ..وقت سے تم بچ نہیں سکتے ..اور اپنی اصلی حالت کو پا کر کوئی چیز اپنے آپ سے انحراف نہیں کرتی...

گرو نے مزید کہا

وقت کے سامنے کوئی رشتے نہیں ہیں..کوئی منطق..کوئی طاقت..وقت پر تمہار اقابو نہیں رہ سکتا..جو آنکھیں رکھتا ہے وہ وقت کے ارتقاء کو پہچان لیتا ہے

لیکن آنکھیں کہاں ہیں؟..گوتم نے سوال کیا..پراکرتی اندھی ہے..اور پرش لنگڑا رہی ہے..جو کہ اندھی پراکرتی پر سوار ہے..

پراکراتی اندھی ہے اور بے حس..گرو نے جواب دیا..پرش اسے دیکھتا ہے تو شعور کا خارجی اور مادی دنیا میں اور دخلی اور ذہنی دنیا میں اکٹھا ارتقاء ہوتا ہے..اور ادراک اور خیال کی تخلیق..پراکرتی ابدی ہے..ہمہ وقت مصروف عمل..جب تک پرش کی نظروں میں رہے ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے..بے حس مادہ ذہن کی جوت سے روشن ہو جاتا ہے..ذہن میں بڑی طاقت ہے

ذہن میں بڑا خطرہ ہے..اکلیش نے کہا..ویدانت میں لکھا ہے..گیان نیکی اور بدی سے زیادہ اہم ہے.....کیونکہ خیر وشر مایا میں شامل ہیں..اور گیان مایا سے نجات دلاتا ہے

...میں گیان سے عاجز آ چکا ہوں...

گرو نے کہا..ادراک انانیت کے بغیر کام نہیں کر سکتا..لہذا دنیا کو خارجی اور عملی میں تقسیم کرنا ضروری ہے..یہ میں ہوں..یہ باقی دوسری چیزیں ہیں..برہما ایک ہے..جیوآتمائیں بہت سی ہیں..جو کچھ ہے وہ اس کا نتیجہ ہے..ہم اپنی حسیات کی وجہ سے نہیں ہے..پراکرتی رقاصہ ہے..پرش اسے دیکھ رہا ہے..جب وہ اس کی طرف سے آنکھیں اٹھالیتا ہے..تو وہ بھی اسے نہیں دیکھتی..کیونکہ دوسرے پرش اسے دیکھ رہے ہیں..بالآخر وہ ان پرشوں کو آزادی عطا کر دیتی ہے...پرش باہر اندھیری رات میں آ کر آزاد ہو جاتا ہے..

لیکن دکھ کون سہتا ہے؟پرش یا اس کی پارکراتی..گوتم نے سوال کیا

دکھ کا تعلق پراکرتی سے ہے..مقید زندگی کا احساس بذات خود تکلیف ہے..گرو نے جواب دیا

ویدانت والے کہتے ہیں..کہ پرش ایک ہے..ایکم است..اکلیش نے پوچھا

ہاں اور کپل کا کہنا ہے کہ پرش ایک ہوتا ہے..تو اگر ایک انسان خوش ہوتا ہے تو سارے انسان خوش ہوتے ہیں..ایک رنجیدہ ہوتا تو سارے کے سارے رنجیدہ ہو جاتے..لیکن انسان اپنے اعمال اور اپنی نسل اور اپنی زندگی کے ادوار اور ورن آشرم کے لحاظ سے مختلف ہیں..گرو نے کہا

بھگوت گیتا میں سری کرشن نے کہا۔۔کہ پراکراتی کے گن اعمال پر اثر انداز ہو
تے ہیں۔۔لیکن خودی یہ سمجھتی ہے کہ یہ میں ہوں۔۔اکلیش نے کہا

اورشا کیہ منی نے پوچھا ہے کہ کوئی محدود خودی ہے بھی یا نہیں۔ممکن ہے یہ
سب احساس کی مختلف کیفیتیں ہوں۔۔گوتم نے دل میں سوچا

پراکراتی کے تین گن ہیں۔۔نیکی۔۔شدت اور تاریکی۔۔گرو نے کہا

گوتم آہستہ سے اٹھا۔۔اور جھونپڑے سے باہر نکل آیا۔۔اور دوبارہ ندی کی سمت
چل دیا۔۔کچھ دیر قبل جس طرح بھاٹ کی آواز نے اس کا تعاقب کیا تھا۔۔اب گرو اور
اکلیش کی کی مدھم آوازیں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔۔ست کاریہ وار۔۔اودیا۔۔مایا۔۔شکتی
۔۔پراکرتی۔۔۔۔پراکرتی کے گن۔۔

ندی کے کنارے پہنچ کر اس نے خود کو ٹھنڈی گھاس پر گرا دیا

اپنشد میں لکھا تھا کہ جس کو اپنی آتما کی تمنا ہے اس کے لیے باپ باپ نہیں
،ماں ماں نہیں۔۔دنیا دنیا نہیں۔۔دیوتا دیوتا نہیں۔۔چور چور نہیں۔۔قاتل قاتل نہیں ہے
۔۔اس کو نیکی اور بد کی فکر نہیں ہے۔۔کیونکہ وہ دل کے سارے رنجوں پر فتح پا چکتا ہے

گوتم نیلمبر اب چوبیس سال کا ہو چکا تھا۔۔اتنی مدت میں پہلے وہ سوفسطائی بنا پھر
اس نے شو کی پوجا کی۔۔ہری کا بھگوت بنا۔۔کپل کے نظریوں پر اس نے بسیط شرحیں
لکھیں۔۔اس نے اپنے ہم نام فلسفی گوتم کا مطالعہ کیا۔۔جس نے براہمنوں کے
مذہب کے قوانین بنائے تھے اور وقت کے مسئلے پر سوچ بچار کیا تھا۔۔ہری شنکر سے
ملنے کے بعد اسے گوتم سدھارتھ سے دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔۔لیکن ابھی تک وہ اس
دیس کی ازلی اور ابدی سوچنے اور کھوجنے والی روح تھی۔۔جو کہ کبھی اور کسی جگہ مطمئن

نہ ہوتی تھی..جو برابر اس سوال کے جواب کی تلاش میں مصروف تھی کہ ہم کس طرح جانیں؟

وہ مدتوں سے اس کھوج میں تھا...

ہم کس طرح جانیں یہ سب کیا ہے..

وہ سہا ہوا گھاس پر لیٹا رہا..پچھلے پہر کی مدھم چاندنی سائیں سائیں کر رہی تھی..لیٹے لیٹے آہستہ آہستی اس کا ذہن صفر کے نقطے تک پہنچ گیا..پھر اس نے اپنے آپ کو ان گنت حصوں میں تقسیم کر دیا..بہت سے گوتم جو بول رہے تھے..گا رہے تھے..لکھ رہے تھے..قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے..اداس سے..اچنبھے میں تھے ..اسے اور زیادہ ڈر لگا..گرو کی آنکھوں میں اسے وہ خود نظر آیا..جو کہ چراغ کی روشنی میں اسے گھور رہی تھیں..اور بالوں کی سفید جٹائیں اسکے کندھوں پر بکھری تھیں ..کلیش کا مسکراتا چہرہ..بازار کے لوگوں کی شکلیں..نوکیلی مونچھوں والے زرگر ک..پرسکون چہرے والے بھکشو..چندھی آنکھوں والے پہاڑی..ان سب میں اسے اپنا آپ نظر آیا..اور اسے اور زیادہ ڈر لگا..آجکل اس قدر خوفزدہ تھا کہ اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی ویران مندر کے تاریک گربھ گرہ میں چھپ جائے اور اندر سے کنڈی چڑھالے..گربھ گرہ کے خیال پر اسے چنڈی کی بھیانک مورتی یاد آئی ..جس نیا سے سرجو کے کنارے ڈرایا تھا

یہ ساری دنے مل کر چاروں طرف سے اس پر حملہ آور کیوں ہو رہی تھی؟ سب اس کے خلاف ایک لشکر تیار کر رہے تھے..اس لشکر میں وہ گھاٹ والی لڑکی شامل تھی ..ہری شنکر شامل تھا..گرو پرشوتم اور سارے نئے اور پرانے حکماء شامل تھے....خدا

کا تصور شامل تا ھ ..اس نے آنکھیں بند کر لیں ..اور کوشش کر کے اپنے ذہن کو ماسواء سے عاری کرنا چاہا اس نے سوچا کاش وہ کم از کم یوگا کا ہی ماہر ہوتا ...کاش ایک لطیف سا خلاء اس کے ذہن میں آ کر کہیں سے بھر جاتا ..آخر اس کا کیا قصور ہے؟ اس نے تو ہمیشہ جاننے کی کوشش کی ہے...

اسے وقت سے نہیں ڈرنا چاہئیے

وقت کے راستے سے ہٹ کر وہ ایک طرف سڑک کے کنارے بیٹھ گیا..تھکے ہوئے آرام کے احساس کے ساتھ اس نے آنکھیں بند کر لیں..اس نے سوچا جیسے وہ زمان مکان سے آزاد بہار کے بادلوں کی طرح اوپر اٹھتا جا رہا ہے..چاروں اور خلاء ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح صرف وہ تنہا موجود ہے..دنیا کا ازلی اور ابدی انسان ..تھکا ہوا ..شکست خوردہ..بشاش..پر امید: رنجیدہ..انسان جو خدا میں ہے اور خدا سے الگ ہے..کائنات کا اولین ذی ہوش جسے یہ ساری چاندنی ..سارے پھول..ساری ندیاں..سارا حسن دے دیا گیا ہے..اولین روشنی کا زمانہ اور برہمنا کا سارا محل سنسان پڑا ہے ..اس میں محض نور ہے..نور کی دنیا سے ایک ہستی آن گری ہے جو پرش ہے اور اکیلا ہے...

اس اولین انسان نے آنکھیں کھول کر چاروں اوڑھ نظریں دوڑائیں ..اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور دور دور تک بستیاں جگمگا اٹھی ہیں ...اور کھیتوں میں سرسوں لہراتی ہے اور اودگاتری برہمن ست تانتو ساز کے سو سو تار چھیڑ کر سام وید کے گیت گا رہے تھے ..اور اندور م جھم برس رہی ہے ..باغوں کا نوجوان خدا اندر لڑکیوں کی چنریاں اپنی پھوار سے بھگوئے ڈالتا ہے...سنہرے بالوں والے نوجوان

آریہ سورما میدان میں رتھ دوڑا رہے ہیں ..ان کے ہاتھوں میں تیر کمان ہیں ..یہ جنگ اور شاعری کے دیوتاوں کے پرستار نوجوانوں کا عہد ہے ..شجاعت کا دور .. طاقتور کمزور کو زیر کرتا ہے ..یہ بے خوف نڈر انسان عناصر سے ..ظلم سے ..موت سے لڑتے ہیں .سوم پی کو رقص کرتے ہیں ..ان کا فلسفہ تیاگ کا فلسفہ نہیں ہے ..یہ زندگی پر جی جان سے عاشق ہیں ..انہوں نے پھولوں کے نگر آباد کیے ہیں ..مٹی کے فصیلوں والے پور بنائے ہیں ..لکڑی کے مکانوں میں اگنی شالائیں روشن ہیں ..پتھر کے قلعے تعمیر کیے جارہے ہیں جمنا کی وادی میں گائیں چر رہی ہیں ..رنگین پگڑیاں باندھے ..بالوں کی چار چار چوٹیاں گوندھے ..مرگ نینی لڑکیاں پشپ کرما کے لیے پھول چن رہی ہیں ... ہاملیہ کی وادی میں عظیم شوالک دریا بہہ رہا ہے ..سبزہ زاروں میں ویویکا ..اور الکھ نند اور بھاگرتی ندیاں گنگناتی ہیں .سریو ..اور ورناوتی کوشل دیس کو سیراب کر رہی ہیں ..اتر میں گیہوں کے کھیتوں کی کبھہ اور وتستا اور رویاس آبیاری کرتے ہیں ..جنوب میں مہاندی بہتی ہے

یہ سریلی ندیوں کا بہت اتم سنگیت ہے

دراے کی لہریں چاندی میں راوں ہیں ..گوتم نے آنکھیں بند کر تصور کیا

وہ اس سے دو ہزار برس قبل کی دنیا میں پہنچا .ہے ..وہ اس خنک ..آرام دہ .. پیاری زمین پر بیٹھا ہے ..یہ زمین اس کی زمین ہے اسے اس زمین سے عشق ہے .صدیوں سے وہ اس زمین کو سینچ رہا ہے اس نے اس میں خوبصورت درخت لگائے ہیں ...دلفریب شہر بسائے ہیں ..اس زمین پر اس نے محبت کی ہے

سنہرے بالوں والا بلند و بالا آریہ جو اپنے سنہری رتھ پر دھرتی کو روندتا مغرب

سے مشرق کی طرف آیا تھا..اندر کی کمان اس کی معیت میں ... پاربتی اس کے ساتھ ساتھ ناچتی آ رہی ہیں... برہما کی بی بی سرسوتی نے اپنی کٹیا پر سے جھک کر اس کے کان میں کچھ کاہ..علم تیرا ہے..گنیش نے سونڈ اٹھا کر قلم اس کے ہاتھ میں دے دیا

تخیل میں کتنی طاقت ہے... جس نے عناصر اور چرندوں پرندوں کو شخصیتیں عطا کی ہیں.. پرتھوی اور رورونا..اندھیرا آسمان اور اگنی اور اندر... عناصر کی یہ تمثیلیں فلسفے کی اولین مجسم شکلیں ہیں..ان کے ذریعے سبب کے قانوں کو مزین کیا جا رہا ہے.یہ دنیا کے اولین فلسفی ہیں.. فلسطین کی پہاڑیاں خاموش پڑی ہیں.اسرائیل کے نغمہ نواز ابھی پیدا نہیں ہوئے..مگر ان شاعروں کی آواز برہم ورت پر جھکے ستاروں سے جا ٹکرا رہی ہے..یہ صبح کے ستاروں کے راگ ہیں...اور خدا کے بیٹوں کی للکار...انہوں نے فطرت کے اس عظیم الشان ناٹک کو اتنے بہت سے حصوں میں تقسیم کر دیا ہے..ان کو کھوج لگی ہے..یہ سب کیوں ہے؟اس کا مصنف کون ہے؟ادا کار کون؟تماشائی کون؟مترا روز روشن کو سامنے لاتا ہے..ہم سب کا دوست ورونا اندھیرے آسمان کا مالک ہے.سوریہ روشنی کا خزانہ ہے..اوشا صبح کی کنواری...وایو ہوائیں چلاتا ہے...ماروت طوفان کے فرشتے ہیں...پش دیوتا سڑکوں اور گلوں کا نگہبان ہے..روز آسمانوں کا چنگھاڑتا بیل ہے...عالم بالا کا سرخ سور...

اوورونا.....ایک صاف گہری آواز فضا میں گونجی..گوتم نے گھاس پر لیٹے لیٹے پہچانا..یہ اس کی اپنی آواز تھی..جو کہ دو ہزار سال قبل بلند ہوئی...وہ اونی شال لپیٹے

..کانوں میں کرن شوبھا اور گلے میں سنہری رکما پہنے ایک اونچی چٹان پر کھڑا تھا
..اس کے ہاتھ میں سر منڈل تھا..اس نے پکار کر کہا..کیونکہ اندھیرے آسمان کے
نیچے اس سمے وہ تنہا کھڑا تھا

ادورونا.....ہم نے اپنے رفیق..اپنے بھائی..اپنے دوست..اپنے ہمسائے یا
کسی اجنبی کا دل دکھایا ہے..تو ہماری اس خطا کو درگزر کر...
اپنی کمزوریوں کی وجہ سے تیرے قوانین کی جو خلاف ورزی کی ہو...
ادوروناا اس کی سزا نہ دے
اور اسی تاریکی میں کوئی دوسرا شاعر آہستہ آہستہ کہتا تھا
میں؛؛جو بیوقوف ہوں اور جاہل ہوں
میں نے چاہا کہ دیوتاوں کے چھپے ہوئے گھر کا پتا چلاوں
میں نے مینوں سے پوچھا
وہ جس نے چھ آسمانوں کو سہارا دیا
کہیں یہ وہی تو خدائے واحد نہیں؟
پہلوٹھی کے لڑکے کو کس نے دیکھا ہے؟
وہ جس کے جسم میں ہڈیاں نہیں..اس نے ہڈیوں والی مخلوق کو جنم دیا
وہ کون جنگل تھا..کون درخت..جس کی لکڑی سے یہ کائنات گھڑی گئی؟
وہ کون تھا کہ جو جاننے والے کے پاس یہ پوچھنے کے لیے گیا؟
یم.....دنیا کا پہلا انسان جس نے مر کر موت کا پتا لگایا
پھر اس شاعر نے سوچ کر دوسرے شاعر کو جواب دیا

وہ طاقتور ترین دنیا کا باپ ہے

وہ مبارک ہے یعنی شیو ہے

اس کے قہر سے گائیں اور انسان مر جاتے ہیں

پھر اس نے پوچھا

موت مجھے ختم کر دے گی۔ موت کو کون ختم کرے گا؟ وہ کون سی چیز ہے جو کہ انسان سے اس کی موت کے گھنٹے میں جدا نہیں ہوتی؟ مرنے کے بعد انسان کا کیا ہوتا ہے؟ راجہ پر کشت کی نسل کہاں گئی؟ وہ کون ہے جو کہ ہر شے پر قادر ہے لیکن ہر شے سے علیحدہ ہے؟

موت سے سہم کر شاعر نے زمین سے استدعا کی...

وسیع مہربان دھرتی... ماں.. اسے اپنی گود میں جگہ

نوجوان لڑکی.. جو کہ اون کی طرح ملائم ہے

تجھے تباہی سے بچائے رکھے گی

دھرتی.... اپنے آپ کو دھیرے دھیرے جھکو رے دے

اسے اپنے بوجھ سے نہ دبا

اسے آرام کرنے دے

اسے اس طرح چھپا لے جس طرح ماں اپنے بچے کو آنچل اوڑھا لیتی ہے

شمشانوں میں روشنی ہو رہی ہے

اگنی اس کو جلانا نہیں اس کی کھال.. اس کے جسم کو بھون کر رکھ دینا

اسے کھا لینے کے بعد اسے اس کے پرکھوں کے پاس بھیج دینا

جب یہ اپنے پرکھوں کے پاس پہنچ جائے گا تب خدا کی مرضی پوری ہوگی

اور ایسا ہوا کہ اس کی آنکھیں سورج کے پاس جائیں ...اس کی سانس ہوا میں

تحلیل ہو یا آسمان کے پاس جائے یا زمین پر رہے ..جیسا سا کا مقدر ہو ..اور اس

کے ہاتھ پاوں پودوں کی شکلوں میں پھر سے نمودار ہوں

انسان بہت کمزور نکلا ... جو کہ اپنی ساری دھوم دھام ..سرای شان وشوکت ..

سارے ارادوں کے باوجود ختم ہو جاتا ہے ..شاندار شہر نیست ونابود ہو جاتے ہیں

...دریا غائب ہو جاتے ہیں .. پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑتے ہیں ..باغوں میں بسنت

منانے والوں کا نشان تک نہیں ملتا

ہر شے فانی ہے ...صرف ستوپ باقی بچتے ہیں

مسرت بیکار ہے ...دل کی لگن بیکار ہے ..اب میں کسے پکاروں ؟..کس کی

مناجات کروں ؟

اندر کی مناجات کرو ..رگ وید کے شاعروں نے کہا ...

اندر کی مناجات کرو ..آواز باز گشت لکڑی کے مکانوں اور پتھر کے قلعوں میں گو

نجی ...

اندر کی مناجات کرو ..اگر وہ واقعی ہی موجود ہے

اندر کا کوئی وجود نہیں .....دوسرے شاعر نے سوال کیا

اسے دیکھا کس نے ہے ؟ میں کس کو پوجوں اور اندر نے گرج کر گھنگھور

گھٹاوں کو جواب دیا ..

میں ادھر ہوں ...او مغنی مجھے دیکھ ..

میں ساری مخلوقات سے عظیم ہوں

نظام کائنات نے مجھے عظیم تر بنایا ہے..

پھر انہوں نے کہا..او پہاڑوں پر رہنے والے رور..اپنے تیز..قہرناک تیروں

سے

کسی انسان کو کسی حیوان کو نقصان نہ پہنچا

کیونکہ موت خوفناک ہے..

لیکن موسیقی موت کو ختم کر دے گی .موسیقی کی وسعت ..اس کی گہرائی میں

موت کہیں تنکے کی طرح ڈوب کر رہ جاتی ہے .موت دراصل بہت حقیر ہے

.موسیقی خدا ہے

روید کے شاعر چٹان پر بیٹھے رہے ..نیچے وقت کا تاریک دریا بہہ رہا تھا..اس

دریا کی سطح پر چھوٹے چھوٹے بھنور پیدا ہو گئے..

اس اولین موسیقار کے ہاتھ میں وینا تھی..انہوں نے سات سروں کی سرگم

تخلیق کر لی تھی.سرگم کا ایک ایک سر وینا کے تاروں پر علیحدہ علیحدہ گونج رہا تھا..

اب سارے تار اکٹھے ہو کر ایک آواز پیدا کر رہے ہیں...

وشو دیو....سارے خدا ایک ہیں...اگنی..اوشا..ورونا..سوما..کندھرو..ساری

طاقتیں ایک وشو بھونانی ہیں....

تد ایکم....خدا ایک ہے...مضراب کی ایک جھنکار سے فضا مرتعش ہو گئی.....

مگر میں کس کی عبادت کروں

کس کی بارگاہ میں قربانی چڑھاوں

اور شاعر نے خود ہی جواب دیا

وشو کرما..وشو دیوا مہمان اسی

تو سب کا خالق ہے خدائے بزرگ و برتر.. پر جا پتی....

کون کھمبا تھا....کون سہارا

کس طرح ایسا ہوا کہ وشو کرما نے اپنی طاقت سے زمین بنائی اور آسمان تانا

....

وہی ایک خدا ہے جس کی چاروں طرف آنکھیں ہیں..

اور منہ....اور بازو....اور پاوں

جو اپنے دو بازووں اور پروں کی دھونکنی سے دنیا کو گھڑتا ہے

سب سے پہلے نور پیدا ہوا...وہ سارے وجود کا خدا تھا....

اس نے آسمان اور زمین بنائے...

میں کس خدا کی بارگاہ میں قربانی چڑھاوں..؟

وہ جو زندگی اور طاقت بخشتا ہے....

ابدیت اور فنا جس کی پرچھائیاں ہیں...

میں کس خدا کی بارگاہ میں قربانی چڑھاوں؟

وہ جو اس سانس لیتی اور سوتی ہوئی کائنات کا مالک ہے

وہ جس نے فضا میں روشنی کی پیائش کی ہے

جس نے جگمگاتے عظیم پانیوں کو تخلیق کیا ہے....

وہ جو ایکا دیوا ہے اور پران اور سکھمبا [سہارا]

قصہ مختصر یہ کہ وہ برہما ہے

خدائے واحد.... جو کہ نہ مرد ہے اور نہ عورت... اس کی کوئی جنس نہیں... کوئی ثا
نی نہیں.. نہ کسی نے اس کو پیدا کیا ہے.. نہ یہ کسی کو پیدا کرتا ہے.. ایکا دیوا
برہما جو کہ بڑھتا ہے جو باہر لاتا ہے.. اور پھیلاتا ہے.. جو کہ دنیا کی تخلیق کا مادی
سبب ہے.. لیکن خود غیر مادی ہے.. اور دنیا جو اس نے تخلیق کی خود غیر حقیقی ہے
محض اوم اصل حقیقت ہے... خلا... روشنی اور آواز

لفظ..... جو اس زبان سے ادا ہوتا ہے.. برہسپتی ... جو پھیلتا ہے.... برہسپت
کی حیثیت سے برہما خدائے نطق ہے

لفظ جو کہ شروع میں تھا اور خدا تھا... مدتوں بعد فلسطین کے حکماء یہ جملہ دہرا کر
ایک نئے خیال کا پرچار کریں گے.. یونان میں لوگوس کے مسئلے کی ترویج ہو گی.. عہد
نامہ قدیم میں صوفیہ علم کی صورت میں ظاہر ہو گی
ویدوں کی تقدیس مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے
کیونکہ وید زبان کی شکل میں برہما ہے..

اب لفظ اور خیالات کے باہم رشتے پر غور کیا جا رہا ہے.. زبان نے ایک حمد
میں کہا...

میں وایو اور رودرا اور روشو دیو کے ساتھ گھومتی ہوں
میں مترا.. درونا.. اور اگنی کی مددگار ہوں
میں ملکہ ہوں.. دولت جمع کرتی ہوں... میں جاننے والی ہوں..
ان سب میں افضل جن کی عبادت کرنا چاہیئے

بغیر جانے انسان مجھ پر ہی بھروسہ کرتا ہے..

میں جسے پسند کروں اسے برہما..رشی اور اگنی بنا دیتی ہوں....

میں رور کی کمان موڑتی ہوں تاکہ وہ جو برہما سے متنفر ہے..اسے ختم کیا جا سکے

..

میں جنگیں کرواتی ہوں..میں ہوا کی مانند چاروں کھونٹ پھیلتی ہوں

شبد برہما..

برہما جو کہ بذات خود ذہن ہے اور کنول کے ریشے سے زیادہ لطیف بادل کی چھایا سے زیادہ ہلکا..جو کہ اس کائنات کا حامل ہے..جو کہ اپنے آپ کو تقسیم کرتا ہے تاکہ دوسرے پیدا ہوں...

وہ دوسرا میں خود ہوں..آتما....جو ذہن اور زبان اور سانس کا دوسرا نام ہے ..جو کہ خود اپنی گواہ آپ ہے..اور جو روح..کائنات اور... پرماتما بھی ہے

اب برہمن اور آتما کا مجرد تصور وحدت وجود کے نظریے کے لیے راہیں تیار کر رہا ہے

پرجاپتی کے تخیل نے واحدانیت کا بیج بویا

شروع میں پانی تھا جس پر پرجاپتی ہوا کی طرح منڈلایا..اور کائنات کی تخلیق کی

فلسطین کا فلسفی بعد میں کہنے والا تھا....شروع میں پانی تھا جس پر روحیں دھوئیں کی طرح منڈلاتی تھیں

ان شاعروں کے تخیل نے ساری کائنات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا..ان

کے لاشعور کی وسعت میں قطب شمالی کی طویل راتیں..مدھم سرخ سورج اور وسیع سبزہ زار تھے کھلی فضائیں موسم کی تبدیلیاں..پھولوں کے رنگ..بسنت رت کی زردی.سرسوں اور کپاس اور ٹیٹو اور ہار سنگھار اور ساون بھادوں کی جھڑیاں اور مور کی.... مینہ آؤ... مینہ آؤ کی صدائیں اور جب درخت جامن..فالسے اور کروندوں سے لد جاتے ہیں اور خزاں... جب دھان کی فصل کٹتی ہے اور سردیاں..جب چوپالوں میں الاؤ جلتے ہیں اور کھلیانوں کے اوپر ہیمنت کا چاند دھند میں تیرتا ہے.. یہ موسموں کی راگ مالا انہوں نے اس وینا کے تاروں میں قید کر لی ہے...برہما اور شکتیا کا تصور سنگیت میں ڈھل چکا ہے..برہما راگ ہے.سرسوتی راگ رانی...پانچ سر مہا دیو نے تخلیق کیے ہیں..کھرج اور پنچم پاروتی نے بنائے ہیں.فضائے بسیط تونبورو..نارومنی اور چترسین کی موسیقی سے گونج اٹھتی ہے..یہ عناصر کی موسیقی ہے جسے متشکل کر لیا گیا ہے

نٹ راج کا ڈمرو..آکاش تت ساء کا مظہر ناد جس میں ساری آوازیں پیدا ہوتی ہیں..رور آندھیوں کا خدا اپنی پر شکوہ وینا چھیڑ رہا ہے

جمنا کے کنارے مہاوشنو بانسری پر نغمہ حیات بجا رہے ہیں..گو پیاں..آفاقی طاقتیں..اس کی دھن پر رقصاں ہیں

کائنات ان گنت سازوں کی جھنکار سے گونج رہی ہے.راگ تخلیق ہو رہے ہیں..جن کی پر دیپ سے آواز کی دنیا جھلملا اٹھی ہے..فضائے بسیط میں بھیرو.. مالکونس..ہنڈول.میگھ..دیپک.سری کے دیو گرج رہے ہیں

اساوری اور رام کلی کی نازک پریاں ہوا میں پر پھیلاتی ہیں..جنگل کے پر

ندے اور جانور بھی شاعر اور موسیقار کے ساتھی اور دوست ہیں، ان کی آواز..ان
کے رنگ اور ان کی چال کو رقص ونغمہ کے تخیل میں محیط کرلیا گیا ہے مور کھرج میں
جھنکارتا ہے پپہا رکب میں اپنی گھٹ لگاتا ہے بکری گندھار میں ممناتی ہے کلنگ
مدھم میں پکارتا ہے کوئل کی کوک میں پنچم کا سر ہے.. دھیوت گھوڑے کا ہنہناتا ہے
.نکھاد ہاتھی کی چنگھاڑ ہے..

تان پورے پر سر چھیڑا گیا..تان پورے کی آواز جو گیت سے پہلے شروع ہوتی
ہے گیت کے دوران موجود ہوتی رہتی ہے اور گیت ختم ہونے کے بعد تک گونجتی
رہتی ہے..سر جو ذات مطلق ہے..جو ہمیشہ سے تھا.... ہے...اور رہے گا
سنگیت کار کے فن میں فلسفے..رنگ ونور.خیالات اور جزبات کا دھارا کھٹا بہہ
رہا ہے

اس شاعری اور موسیقی کے پس منظر میں بہت عظیم رنگوں اور آوازوں کی دنیا
پھیلی ہے..آسمان سے الوہی پانی برستا ہے اور الوہی شفاف ندیوں میں بدل جاتا
ہے..آسمان کی روشنی کا سمندر اوشا کے اجالے کے ساتھ ساتھ صبح کے راگوں میں
گھل مل جاتا ہے اور اس مقدس کہرے پر سنہری دیبی سرسوتی تیرتی ہے سرسوتی جو
کہ تخلیق کرنے والی ماں کا تصور ہے..جو راگنی ہے..جو علم ہے...جو زندگی کا مقصد
ہے..علم سے آزادی ملتی ہے..علم سرائے وجود کی بنیاد ہے.گیان میں نجات ہے
..[سوچتے سوچتے گوتم وقت کے اس نقطے پر لوٹ آیا جہاں وہ اس سے موجود تھا].
قید اس لیے ہوتی ہے..اس نے گھاس پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا کہ خودی اپنے آپ
کو اپنے ذہن سے مماثل کر لیتی ہے اور لہذا اس دکھ اور گناہ اور ذہنی اور اخلاقی

کمزوریوں کا شکار ہو جاتی ہے..اور پراکرتی کا تجربہ کسی کو تو کرنا ہوتا ہے...

یہ تجربہ خالص روح کرتی ہے.....

یہ تجربہ میں بھی کر رہا ہوں..

یہ تجربہ کرتے کرتے میں کدھر نکل جاؤنگا..

لیکن کوئی پروا نہیں

سوال حقیقت پسندی یا تصوریت کا نہیں..صحیح عمل اصل چیز ہے

وہ گھاس کی پتیوں کو توڑ توڑ کر اکٹھا کرتا رہا اور پھر زمین پر پتھر کے سہارے نیم دراز ہو گیا رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی..اور درختوں کے جھرمٹ میں کسی یوگی کی جھونپڑی کے سامنے آگ جل رہی تھی..اس نیم تاریکی میں اس کی روشنی آنکھوں کو بہت اچھی معلوم ہوئی..

پتا نہیں بیچارا اس وحشت اور ویرانے میں وہاں بیٹھا کیا سوچتا ہوگا..گوتم کو یاک لمحے کے لیے بڑا اچنبھا ہوا

وہ ان شعلوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا..وقت سنسناتا ہوا اس کے چاروں اور ڈول رہا تھا..ذہن کی جوت کے آگے اب قربانیوں کی آگ مدھم پڑ چکی تھی..انسانی دماغ دیو مالا کی تخلیقی مدتیں ہوئیں کر کے ختم کر چکا تھا..خیال کے صنم خانے آباد ہو کر نئے پرانے بھی ہو گئے..دماغ اب دقیق مسلوں کا حل تلاش کرنے میں مصروف تھا..مذہب اب محض کمتر درجے کا علم سمجھا جاتا تھا..اصل چیز فلسفہ تھا اور ما بعد الطبیعات..سارے ملک میں خیالات کی فرمانروائی تھی اور آزادی..افکار اور مزہبی رواداری...ایک ہی کنبے کے افراد برہما کے مختلف مظاہر کی کوشش کرتے اور

متضادنظریوں پر یقین رکھتے ..مادہ پرست ..ثنویت کے قائل .ملحد ..بےخوفی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے کیونکہ سچائی کی تلاش ان سب کا مشترکہ مقصد تھا..ہر فلسفی اپنی اپنی جگہ سے جو اس نے اپنے لیے منتخب کی تھی..ذرا برابر سرکنے کو تیار نہ تھا .مگر ان سب نے علم معقولات کو سب سے زیادہ فوقیت دی تھی ..حسی ادراک .. استنباط..اور لفظ کی شہادت اور سند پر اس جستجو کی بنیاد تھی..

ملحد حکیم کپل کئی سو سال قبل گزرا تھا...چونکہ ادراک.. استنباط اور لفظ کی شہادت میں سے کوئی چیز بھی خدا کے وجود کا ثبوت بہم نہ پہنچا سکتی تھی..لہذا کپل نے بڑی دلیری سے ایشور کی بجائے ان ایشور پر زیادہ توجہ دی تھی.. منطقی کی حیثیت سے وہ خدا سے منکر ہونے کی بجائے محض اسی پر مطمئن رہا کہ شہادت کے عام ذرائع سے خدا کے وجود کو ثابت نہیں کر سکتا..گو اس قدر روادار تھا کہ عوام کے دیوتاوں شیو اور وشنو تک گوارا کر لیتا تھا کہ ممکن ہے کہ وہ موجود ہی ہوں..لیکن اس کے نزدیک یہ محض تخلیق شدہ دنیاوی خدا تھے اس کے خیال میں ایشور تک کا وجود مظاہری تھا..ساتھ ہی وہ کہتا تھا کہ کوئی چیز زمان و مکان میں مقید ایسی نہیں جو بالآخر حقیقت اور ابدیت پر مبنی نہ ہو

کپل ناستک یا معدومیت پرست نہ تھا..سیدھا سادا ملحد تھا..برہما کے بجائے اس نے پراکرتی کو وجہ کائنات ثابت کیا.. پراکرتی یا فطرت ..جو کارن کاریہ نظریے کی بنیاد تھی پر ان کرتی اولین کارن ہے..ذہن خودی..حواس خمسہ اور عناصر اربعہ اس کی ترکیب اور سارا ارتقاء اس میں مشتمل ہے اور پرش جو کہ خالص روح ہے..جو کہ نہ کسی کا کارن ہے اور نہ کاریہ..اور پراکرتی الگ کھڑا ہے.. پرش ابدی

شخصی شاہد ہے..اوراس کے اوپر پرا کرتی کے ملاپ سے دنیا ظہور میں آتی ہے.ان دونوں کے علاوہ تیسری کوئی طاقت نہیں ہے.اور دونوں کی علیحدگی سے قطعی کامل مسرت اور مطلقیت پیدا ہوتی ہے..کپل کا کہنا تھا کہ ارتقاء محض اتفاقا نہیں ہوا .موجودہ کائنات کے پس منظر میں کوئی اور حقیقت رہی ہوگی..کاریہ کارن میں پہلے سے موجود رہتا ہے

ویدانت والے موحد خدا پرست جو کہا یک برہما کو قادر مطلق جانتے تھے کاریہ اکرن بھید کے مسئلے پر متفق نہیں تھے..ان کے نزدیک کاریہ اور کارن ایک ہی تھے کیونکہ ہر شے برہما تھی.بتت قوم اسی..تو..وہ..ہے..جیوآتما..بندہ..دراصل..وہ..ہے..تو ہی خدا ہے..

لیکن ہر شے برہما ہے.تو یہ دوئی کاہے کے لیے؟..کپل کے ملحد ساتھیوں نے پوچھا

یہ دوئی دراصل مایہ کا فریب ہے..مایا پراکرتی کا...انہوں نے جواب دیا..مدہ پرست کپل کی فطرت کو ویدانت والوں نے برہما کا سایہ قرار دیا..انہوں نے ادراک پر الہام کو ترجیح دی..ادراک اور استنباط محض عالم موجودات کے لیے ہی سند سمجھے جا سکتے تھے..اگر برہما ایک ہے تو دنیا میں کثرت کیوں ہے..؟ تجربے متنوع کیوں ہوتے ہیں؟ لیکن برہما کی ذات کا ایک پہلو..نام روپ بھی ہے ..اس کی مایا...شکتی اور پراکرتی دنیا کی تخلیق کرتی ہے..

لیکن اصل ذات خداوندی نام.روپ اور مایا سے بلند تر اور بے نیاز ہے..... گنی جن کے لیے ساری دنیا سراب کی مانند ہے..اصل برہما غیر مشروط اور قطعی ہے

..ہماری اودیا کی وجہ سے وہ ہمارے ذہن میں آ کر مشروط..عملی..خالق اور شخصی بن جاتا ہے....دنیا کی تخلیق بھی اودیا اور اصلی اودیا کی وجہ سے ہمارے ادراک سے باہر ہے...یا شکتی کے زریعے ہوئی اور اس کی وجہ سے برہما کا درجہ کم ہوگیا بڑھا نہیں..برہما صفات سے متاثر نہیں..جس طرح ہماریاپنی مشروطیت ہماری اصلی روح کو متاثر نہیں کرتی..جس طرح صفات زدہ برہمائیں تکلیق کرتا ہے.اسی طرح ہماری مشروط آتما اس برہما کو تخلیق کرتی ہے...مایا کی دوسرا تھ میں نرگن برہما سگن بن جاتا ہے

نا....نا....برہما کے لیے ہم محض یہی کہہ سکتے ہیں..وہ یہ نہیں ہے....وہ یہ بھی نہیں ہے..ویدانت میں لکھا تھا....وہ ست بھی ہے اور است بھی ہے..وجود بھی ہے اور عدم وجود بھی ہے..عظیم ترین وجود اور عدم وجود.. یوں کہ جن چیزوں کو دنیا وجود سمجھتی ہے وہ اس سے مختلف ہے..برہما شخصی ہے..اس کی خارجی صفات نہیں ..اگر وہ جانتا ہے تو محض خود کو جان سکتا ہے..جس طرح سورج اپنے آپ کو روشن کرتا ہے..ہمارا برہما کے متعلق علم محض برہما کا احساس ہوسکتا ہے..جو کہ خود ہمارا اپنا احساس ہے..مکتی سے ایشور..مظہری خدا اپنے آپ سے غائب ہوسکتا ہے

یہ حکماء بجائے خود بدعتی تھے..کیونکہ فلسفی تھے.ویدانت والوں نے اسی آزادی کو استعمال کرتے ہوئے خود ویدوں کو منتخب کیا اور الہام سمجھ کر ان کے آگے جھکے ..گو سند کو بڑی آسانی سے منظور یا نامنظور کیا جا سکتا تھا..خود کو پل کا ایسا منطقی بھی ویدوں کو کہیں کہیں سے اس شرط کے ساتھ مان لیتا تھا کہ وید بھی غلط کو صحیح ثابت نہیں کر سکتے

ابدیت پرست کہتے تھے کہ روح اور دنیا دونوں ابدی ہیں..محض زندگیوں کا تسلسل قائم ہے..اور ابدالاباد تک رہے گا..چندرو کے نزدیک آتما اور دنیا ایک حد تک ابدی تھیں اور ایک حد تک نہیں..اننتانکتوں کے نزدیک دنیا یا محدود تھی یا غیر محدود اس کے استھر ہی دناے محدود تھی نہ غیر محدود..سیاوادیوں کا خیال تھا کہ ہر چیز ہے بھی اور نہیں بھی..وہ کو دکسی بارے میں قطعی رائے نہیں دیتے تھے..دوسری دنیا ہے یا نہیں حادثہ ہے یا نہیں..جزا و سزا ہے یا نہیں..حیات بعد الممات ہے یا نہیں...

کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ دنیا اور آتما محض حادثے کے طور پر ظہور میں آئے..کیو نکہ ان کا کہنا تھا کہ انہیں خود یاد تھا کہ کچھ عرصہ قبل وہ نہیں تھے اور اب ہیں

صدیاں گزرتی گئیں..ذہنی اپشندوں کی شدید مابعد الطبیعات سے اکتا گیا ..رفتہ رفتہ خدا جو کہ فلسفے کا مسئلہ تھا شخصی بنا

تا کہ بالآخر دل کو ذہن پر فتح حاصل ہو..رور ایک ہے..ایک اپنشد میں لکھا گیا ..جو انسانوں کے دل میں رہتا ہے اور اسے پہچان کر ساری اودیا کا خاتمہ ہو جاتا ہے..

مابعد الطبیعات کے کارن نے اوتار کا روپ دھارا..اضافی کا مطلق سے تعلق خرد کے بجائے وجدان ٹھہرا.... بے جنس برہما مرد بنا..

وشنو جو پتے کے گرنے میں نہاں ہے..

نارائن جو خود مجھ میں ہے

درندابن سے بانسری کی تان بلند ہوئی..اور گنگا اور جمنا کے کناروں پر چھا گئی

انگ رنگ ساگرم

مدھوسودن.....جو کہ محبت کا اتھاہ سمندر ہے..گردھر گوپالا..کرشنا..کرشنا..کرشنا

گوتم نے گھاس پر سے سر اٹھایا اور ندی پر سے برستے سناٹے کو دھیان سے سننے لگا..

اور کرشنا نے کہا..اوارجن میں بے پایاں وقت ہوں..میں تباہ کن موت ہوں ..میں رازوں کا سناٹا ہوں..میں ابتدائے عالم ہوں اور میں ہی اس کی انتہا ہوں..او کنتی کے بیٹے میں پانی کا سوادا ہوں..سورج اور چاند کی روشنی..میں سارے ویدوں میں لکھا ہوا اوم ہوں..میں آکاش کی آواز ہوں..میں انسانیت کا اجتماعی شعور ہوں..او کنتی کے بیٹے..میں عورت کی ذہانت اور وفاداری اور رحم دلی ہوں ..میں گاتری منتر ہوں...میں اچھوں کی اچھائی ہوں..اوارجن میرے الوہی مظاہر بیکراں ہیں..میں عالم الغیب ہوں..لیکن مجھے کوئی نہیں جانتا

اور کرشنا نے کہا..مجھے چاہو..مجھ سے محبت کرو..میں تمہارا سکھا ہوں..تمہارا ساتھی..تمہارا محبوب...میں محبت کا سمندر ہوں..انگ رنگ ساگرم

کائنات اس کی بانسری کی آواز سے مسحور ہوگئی..پھر ویشالی کے مہاویر نے کہا ..خداوند عالم کا کوئی وجود نہیں..دنیا بادی ہے اور اپنے وجود میں قائم اور مادے اور خلا اور دھرم اور ادھرم اور روحوں کی ترکیب سے بنی ہے..صرف یہی ایک حقیقت ہے..

اور شاکیہ منی نے کہا..خدا ہو یا نہ ہو...حقیقت محض یہی ہے کہ دکھ موجود ہیں.. باسٹھ فلسفے او دیا کے باسٹھ گن ہیں..محبت بے کار ہے..فلسفہ بے کار ہے..سب مہا

موہ ہے..سب مایا ہے..سب دکھ کہ ہے..شروع میں نہ وجود تھا اور نہ عدم وجود..ہر شے خلا غیر حقیقی ہے..پھر یہاں خواہشوں کا گزر کہاں؟..کون تمنا کرے گا اور کس چیز کی..؟کسی چیز کا کسی چیز کے ساتھ کوئی تعلق نہیں..ہر شے اپنا لمحاتی وجود خود ہے..اور شا کیہ منی نے کہا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہیں..حالانکہ ہم اضافیت میں ڈوبے ہوئے ہیں..

ہر شے تکلیف ہے..سروم دکھم دکھم..ہر شے فانی ہے....جسم اور روح دونوں کی کوئی اصلیت نہیں..روح لازاول نہیں..محض اس کو تشکیل دینے والے عناصر باقی رہتے ہیں..روح کا آواگون نہیں محض کرم کا آواگون ہے..انسان اس طرح دفعتاً بجھ جاتا ہے..جیسے چراغ کو پھونک مار کر گل کر دیا جائے..صرف واقعات اور احساسات کا دور تسلسل قائم ہے..اور رہے گا

پانی کی نقرئی لہریں کنارے تک آ آ کر لوٹتی رہیں..گوتم نے آگ پر سے نظریں ہٹا لیں اور ندی کو دیکھا جو کہ بڑے سکون سے رواں دواں تھی..

میں دکھ سہنا چاہتا ہوں..میں کمزور رہنا چاہتا ہوں..میں اپنی حماقتوں کا نظارہ خود کرونگا..میں تکلیفیں اٹھاوں گا..

دل اور دماغ کے رنج اور آزمائشیں..میں مکتی نہیں چاہتا..میں مکتی بالکل نہیں چاہتا..رحم بہت بڑی چیز ہے شا کیہ منی..لیکن ممکن ہے کہ مجھے خود ہی تم پر بہت ترس آتا ہو..سوال یہ بھی ہے کہ مقدس شہزادے کہ کون کس پر ترس کھائے گا..؟

وہ اٹھ کھڑا ہوا..افق پر صبح کا اجالا بکھرنے لگا..لیکن دھند لکے کی وجہ سے ندی کا دوسرا کنارہ ابھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا..اس نے ایک طویل انگڑائی لی..اور پانی

میں کود گیا...

رات وہ کچھ سویا تھا کچھ جاگا تھا...رات اس نے بڑی بے چینی سے گزاری تھی
..پانی سے باہر نکل کر اس نے آشرم کی طرف جانے کی بجائے اس نے گھنے جنگل
کارخ کیا..اور ساحل کی ریت پر ایک سمت کو روانہ ہو گیا...

ے...

ترائی کا راستہ جو شراوتی سے اتر کی طرف جاتا تھا..اس میں دونوں طرف پیڑ
تھے ..اور اونچے اونچے سرکنڈے اور ڈھاک کے جنگل اور رنگ برنگے پھولوں وا
لی جھاڑیاں میں لمبی دموں اور جھلملاتے پروں والے پرندے سیٹیاں بجاتے تھے
..اور ادھر ادھر چکر کاٹ کر پھر گھنے جنگلوں میں چھپ جاتے تھے ..دریا اس پھولوں
کے جنگل میں سے لہراتا ہوا گزرتا تھا..اس کے مشرقی کنارے پر گھاٹ تھا..جہاں
شاہی بجرا رات کو کنارے پر آن کر لگا تھا

ایودھیا اور اتر کوشل کے علاقے کے حکمران ارجن اور ان کے کا دربار صبح
سویرے کھیدا کے لیے اتر کی طرف کوچ کرنے والے تھے ..مگر راسی تلاش کرنے وا
لوں نے اطلاع دی تھی .کہ ہاتھیوں کے علاقے میں بالکل غیر متوقع بارش شروع
ہو گئی ہے ..بجرے سے اتر کر شاہی قافلہ ہاتھیوں.. پالکیوں ..رتھوں اور بیلوں پر
سوار ہو رہا تھا.. جب یہ خبر ملی تو قافلے نے اپنا رخ پھر گھاٹ کی طرف موڑ لیا..اور
گرو پروشتم کے آشرم سے چند میل کے فاصلے پر مہوا کے جھنڈ میں خیمے لگ گئے...

آنا فانا جنگل میں منگل ہو گیا ..باغ جہاں صرف ہرنوں کی ڈاروں اور
مرغابیوں اور موروں کی عمل داری تھی..اور جہاں کبھی اکا دکا طالب علم مراقبے میں

غرق کسی پگڈنڈی پر سے گزرتا نظر آ جاتا تھا..وہاں پل کی پل میں میلہ سا لگ گیا ..شراوستی کے سنار اور بزاز اپنی اپنی دکانیں شہزادیوں کی خدمت میں حاضر کرنے کے لیے اٹھا لائے..پھول والوں نے تازہ کلیوں کے انبار لگا دیے..بھانٹوں نے اپنا ڈیرا جمایا..اور لہک لہک کر قصیدے گانے لگے..بنجاروں کی ٹولیاں..طوطے۔ مینائیں..پالتو بندر اور موتی منکے خچروں اور بیلوں پر لاد کر اس امید میں آ کر دور کھڑی ہو گئیں کہ شاید کوئی راج کماری طوطا خرید لے..کئی مصور اور سنگ تراش اپنا اپنا سامان لے کر فروخت کرنے کی نیت سے آن موجود ہوئے..نٹ اور بازی گر اپنے کرتب دکھلانے لگے..رات کو مشعلوں اور الاو کی روشنی سے جنگل کی چڑیاں جگ اٹھتیں اور خوب شور مچاتیں..

شاہی قافلے کی لڑکیاں دن بھر باغوں میں گھومتیں..اندھیرا پڑے ندی میں جا کر تیرتیں..کبھی دن میں تیر کمان لے کر ہرنوں کا شکار کرتیں..ورنہ پھر خیموں کے نیچے یا درختوں پر بیٹھ کر گپیں ہانکتیں..

دو تین دن کے اندر ہی چمپک کا اس بے مصرف زندگی سے جی اکتا گیا..وہ بنجاروں سے ان کے موتی..بزازوں سے ان کے ریشم..چینی اور پشمنے..ناروں سے ان کے گہنے اور مصوروں سے ان کی تصویریں خرید چکی تھی..کسی سائل کو لوٹانا اس کے بس کا کام نہیں تھا...دکانداروں سے اس نے بیکار کی چیزیں بھی خرید لی تھیں..کہ کہیں ان کا دل نہ ٹوٹ جائے..وہ لوگوں سے ان کی بیوقوفی کی باتیں سنتی رہتی تھی اور کبھی ان سے یہ نہ کہہ سکتی تھی کہ آپ لوگ سب کے سب عموما کس قدر گدھے ہیں..لوگ اسے اپنی اپنی کتھائیں سناتے تھے..ہر انسان اس سے

ہمدردی کا خواہاں تھا..کیونکہ سارے میں مشہور تھا کہ وہ بڑی گنی ہے ..بڑی نیک دل ہے بڑی فیاض ہے..یہ ہے..وہ ہے..دنیا بھر کی باتیں اس کے لیے مشہور تھیں اور اسے ہنسی آتی تھی..

تین دن جنگل میں رہ کر اس کا دل مسلسل اس سیر وشکار سے گھبرا گیا..اس نے نرملا کو ساتھ لیا..اور چپکے سے آبادی کی طرف چل کھڑی ہوئی..سامنے آم کا گھنا جھرمٹ تھا..یہاں بڑا سکون تھا..اور خنکی....آسمان پر جھٹ پٹے کے قرمزی رنگ بکھر گئے تھے اور باغ میں رہٹ چل رہا تھا..

آؤ ادھر چلیں جدھر سے گانے کی آواز آرہی ہے

نرملا نے کان لگا کر کچھ سنتے ہوئے تجویز کیا

چلو یوں سب راستے ایک جیسے ہیں..چمپک نے کہا

وہ پتوں کو روندتی آم کے جھرمٹ کی اور بڑھتی رہیں..درختوں کی شاخوں میں سے دور کسی آشرم کے جھونپڑے نظر آرہے تھے..

یہ کون جگہ ہے..چمپک نے کدم کی ایک شاخ پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا..

یہ سامنے کون لڑکے ہیں..نرمال نے بے ساختہ سوال کیا

ہر جگہ برہمچاری لباس والے لڑکے دیکھ کر اسے اپنا بھائی یاد آجاتا تھا

۸..

گوتم نیلمبر تین دن اور تین راتیں مستقل بھوکا پیاسا ندی کے کنارے ادھر ادھر گھومتا رہا..رات کے وقت وہ گھنٹوں ٹھنڈے پانی میں ایک ٹانگ پر کھڑا رہا..پھر ریت پر ببول کے کانٹے بچھا کر ان پر سویا

ایک دن سارا اس نے چیونٹیوں کو آٹا کھلانے میں صرف کیا۔۔جو کہ وہ ملاحوں سے مانگ کر لایا تھا۔۔پہروں اس نے آنکھیں بند کر کے منتر پڑھے

لیکن چوتھے روز وہ اس قدر جھنجھلایا کہ اس نے واپسی کی ٹھان لی

شام پڑے وہ ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا آشرم کی کو جانے والی سڑک پر چل رہا تھا کہ اس نے کسی نے پیچھے سے آواز دی

اس نے مڑ کر دیکھا۔۔اکلیش اس کی سمت ہنستا ہوا آ رہا تھا

بھائی گوتم۔۔۔۔تم تین دن سے کہاں غائب تھے۔۔سارے میں تمہاری ڈھنڈیا مچی ہوئی ہے۔۔

میں تو یہیں تھا۔۔تم یہاں اس وقت کیا کر رہے ہو۔۔؟۔۔گوتم نے سکون سے پوچھا

وہی جو کہ تم کر رہے ہو۔۔اکلیش نے خوش دلی سے جواب دیا۔۔

میں تو بھگوان کی لیلا دیکھ رہا ہوں۔۔

میرا بھی ان دنوں یہی مشغلہ ہے

آشرم میں سب خیریت ہے۔۔گوتم نے یونہی بات جاری رکھنے ء کے لیے پوچھا۔۔اس وقت اسے احساس ہوا کہ ہری شنکر ٹھیک کہتا تھا۔۔۔الفاظ بیکار ہیں

ہاں تم اس طرح خیریت پوچھتے ہو جیسے برسوں کے بعد لوٹے ہو۔۔۔وہاں تو یہ خبر اڑ گئی ہے۔۔کہ تم تپوون کے لیے اندھیرے جنگلوں میں چلے گئے۔۔اب کبھی نہ لوٹو گے

مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔۔گوتم نے دفعتاً کہا۔چلو سامنے پڑاو ہے۔۔وہاں

سے لے کر دکھشنا لے لیں..

میں دیکھتا ہوں تم کسی اور چکر میں یہاں آئے تھے..

کیسا چکر... گوتم نے سادگی سے پوچھا..وہ بھوک کی وجہ سے نڈھال ہوا جا رہا تھا..

گرو یہ معلوم کر کے بہت خوش ہونگے کہ چیلا اتنا سعادت مند نکلا..**اکلیش** نے پھر خوش دلی سے کہا..

گرو یہ معلوم کر کے بہت خوش ہونگے...کہ چیلا اتنا سعادت مند نکلا..**اکلیش** نے پھر کوش دلی سے کہا....

گرو کو تو خوش ہونا چاہیے..تین دن تین راتیں میں نے بھگوان کی لیلا کا نظارہ کیا..گوتم نے معصومیت سے جواب دیا

بھگوان کی لیلا کی ایک جھلک تو کل میں نے بھی دیکھی..تیر کمان لیے ایک ہرن کے پیچھے

بھاگ رہی تھی..مجھے آتا دیکھ کر فوراً درخت پر چڑھ گئی..

گوتم کو سمجھ میں نہ آیا کہا **کلیش** کیا کہہ رہا ہے..وہ ادا سیسیا **کلیش** کی بشاش شکل دیکھتا رہا..

املتاس کے پتے ہوا میں اڑتے ہوئے آئے اور پگڈنڈی پر آ کر ان کے چاروں اور گر گئے..

ہر طرف خوبصورت درختوں پر زرد اور سرخ پتوں نے آگ ایسی لگا رکھی تھی ..سارا باغ شام کی مختلف روشنیوں سے جھلملا رہا تھا..

بن دیوی۔۔بن دیوی دور جھرمٹ میں کوئی بھجن گاتا ہوا جا رہا تھا۔۔بن دیوی تمدور سے جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہو۔۔

کبھی ہمارے گاؤں میں آو۔۔

کیا تمہیں آدمیوں سے ڈر لگتا ہے۔۔؟

گوتم اور اکلیش ہوا کی مدھم خوشبو حلق میں اتارتے گھاس پر چلتے رہے۔۔۔

جب گلیوں کے ڈکرانے کا جھنگر جواب دیتا ہے اور گھنٹیاں بجتی ہیں ۔۔اس سے بن دیوی ہرے کنجوں میں رقصاں ہوتی ہے۔۔

طالب علم بھجن گاتا ہوا جھرمٹ میں غائب ہو گیا۔۔

بن دیوی۔۔۔۔۔کبھی اس کی جھلک دکھلائی پڑ جاتی ہے۔۔۔۔

جیسے بہت دور گائیں چر رہی ہوں

یا درختوں میں کوئی گھر چھپا کھڑا ہوا

رات کو بن دیوی کی آواز ایسی آتی ہے۔۔۔

جیسے کہیں دور گائیں چر رہی ہوں۔۔

یا درختوں میں کوئی گھر چھپا کھڑا ہو۔۔۔

رات کو بن دیوی کی آواز ایسی آتی ہے۔۔

جیسے کہیں دور بیل گاڑیاں گزرتی ہوں۔۔۔

جیسے کوئی اپنی گمیوں کو پکارے

جیسے درخت گرے۔۔۔۔۔

یا بہت دور کوئی چپکے چپکے روتا ہو۔۔

بن دیوی جو کہ جنگلی پھول کھا کر جیتی ہے...جو جہاں جی چاہے ٹھہر کر آرام کرتی ہے..

جو مہکتی ہے...جو سارے جنگل کی ماں ہے.

گوتم اور اکلیش گاتے ہوئے آگے بڑھتے گئے..کچھ فاصلے پر بانسری بجاتے ہوئے لڑکوں کی ایک ٹولی آبادی کی اور جا رہی تھی...آج زراعت کی دیوی سیتا اور کھیتوں کے خدا کھیشتر پتی کی عبادت کا تہوار تھا..گاوں میں بڑی چہل پہل تھی ....

بالآخر گوتم تھک کر ایک درخت کے نیچے ٹھٹک گیا..

ایک طرف دیویاں ہیں ..دوسری طرف اپسرائیں اور درختوں کی پریاں ..دونوں وقت ملتے ان درختوں کے سائے میں کھڑے نہ ہونا..اکلیش نے اسی طرح مصنوعی سنجیدگی سے کہا

کیونکہ درختوں کی پریاں انسانوں کو ورغلا کے لے جاتی ہیں..دیکھنا کسی اور پاٹلی پتر کی بنیا دیہیں نہ پڑ جائے

ارے یہ سامنے کون کھڑا ہے..گوتم نے یکلخت ہڑبڑا کر پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا

کون..اکلیش نے کہا.مہابھرت کے کوی نے پوچھا..ہے تو کون ہے جو کہ کدم کے درخت کی ٹہنی جھکائے ہے..؟دیوتا ہے اے یکشی یا اپسرا؟ درختوں کے اسرار بہت گہرے ہیں گوتم بھائی.....

کیسے درخت؟

گوتم تم بھولتے ہو کہ ہمیں لڑکیوں پر نظر نہ ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے..اکلیش نے دفعتاً سنجیدہ ہوتے ہوئے جواب دیا اور آنکھیں بند کر کے ایک درخت کی اوٹ میں چلا گیا

گوتم نے چونک کر دوبارہ سامنے دیکھا

کدم کے نیچے اجودھیا کے گھاٹ والی لڑکی کھڑی تھی

۹..................................

چمپک نے گوتم کو نہیں دیکھا..وہ نرملا سے باتیں کرتی ہوئی دوسری پگڈنڈی پر مڑ گئی

اکلیش ایکل پتھر پر بیٹھ کر دھیان میں مصروف ہو چکا تھا..آؤ آشرم چلیں..اس نے ایک آنکھ کھول کر گوتم کو مخاطب کیا

انہوں نے پھر راستہ طے کرنا شروع کر دیا

گاوں کے قریب پہنچ کر گوتم رک گیا..آشرم میں کچھ کھانے کو ملے گا....

میں دیکھتا ہوں کہ تم بیحد مادہ پرست ہوتے جا رہے ہو...

میں پوچھتا ہوں تمہاری ءکٹی میں چاول ہونگے؟

نہیں آج صبح سے سب لڑکے سیتا کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں..ایک روز اور بھوکے رہ لو

میں دکھشنا لے کر ابھی آتا ہوں

اچھا اکلیش چپ ہو گیا..مگر جلدی آنا گوتم بھائی..

بھائی اکلیش ابھی آیا...

اکلیش سے پیچھا چھڑا کر وہ تیزی سے اس سمت روانہ ہو گیا جدھر لڑکیاں گئی تھیں..جلدی میں کانٹوں پر دوڑنے سے اس کے پاوں بھی زخمی ہو گئے

چمپک پڑاو کے نزدیک پہنچی تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے..اس نے پلٹ کر دیکھا

اس کے سامنے وہ سرجو کو تیر کر پار کرنے والا لڑکا کھڑا تھا جس کی کالی آنکھیں تھیں اور کھلی رنگت اور جس نے برہمن طالب علموں کا سفید لباس پہن رکھا تھا

مجھے معلوم تھا کہ ایودھیا والے ادھر آئے ہوئے ہیں..میں نے سوچا کہ آج کی بھیک ادھر سے ہی لے لوں..وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا..

تم کہاں پڑھتے ہو؟چمپک نے پوچھا

ادھر کل پتی گرو پرشوتم کے آشرم میں.

جنگل میں بن دیوی کا بھجن تم ہی گا رہے تھے

کہہ نہیں سکتا کہ میں کون ہوں اور جو بھجن گا رہا تھا وہ کون ہے

اچھا یہ بات ہے..؟ آو کسی روز مجھ سے بحث کرو.چمپک نے تبسم کے ساتھ کہا

..

اس جگ میں ماتیری اور گارگی کی جانشین بننے کا تمہارا ہی ارادہ ہے..وہ فورا بحث پر تیرا ہو گیا

ارادہ ایک نہایت فضول لفظ ہے..شاید تمہیں معلوم نہیں کہ عام طور پر الفاظ کے معنی نہیں ہوتے..تمہارے مضامین کیا ہیں؟

فلسفہ.. اخلاقیات ....اور...پھر گوتم دفعتاً جھنجھلا کر چپ ہو گیا... یہ لڑکی اسے بیوقوف بنا رہی تھی

تم تصویریں بناتے ہو؟

ہاں.....

میں نے سنا ہے کہ گرو پرشوتم کے آشرم کا گوتم نیلمبر تصویریں اچھی بناتا ہے .تمہاری شکل دیکھ کر لگتا ہے کہ تمہارا نام ہی گوتم نیلمبر ہو سکتا ہے. میں انموں کے اسرار کی بہت قائل ہوں. تم ناموں کے اسرار کے قائل نہیں ہو؟

میں وہی ہوں جس کا تم نے شاید چند احمقوں سے ذکر سنا ہو اور تم نے ٹھیک سنا ہے

تو غالباً تم بھی میری تصویر بناو گے.. آج صبح یہاں سے چتر کار آئے تھے

میں پریتما کاریک ہوں. صرف تخیل کی بناء پر دل کی آواز سن کر تصویریں بناتا ہوں

اس نے ذرا فخر سے کہا میری قدر وشوا کرمن الوہی مصور تک کو کرنا پڑے گی جو کہ سب سے بڑا چتر کار ہے

وشوا کرمن...تو تم ملحد نہیں ہو؟ آج کل تو طالب علم کپل اور رشا کیہ منی کے زیادہ قائل ہیں

مجھے آٹا لا کر دو.. میرا راستہ کھوٹا ہوتا ہے.. گوتم نے ذرا بگڑ کر کہا.. اس لڑکی کو دوبارہ دیکھنے کے لیے وہ مدتوں گھوما گھوما پھرا تھا اور اب جب کہ وہ اس کے سامنے تھی تو وہ کھڑا کھڑا اس سے جھگڑا کر رہا تھا.. کیونکہ اسے یکلخت یہ احساس ہوا کہ

وہ اس کی اپنی چیز تھی اس کے اپنے وجود کا..اپنے ذہن اور دل کا ایک حصہ... یہاں دوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا..کسی تکلف ..غیریت یا حجاب کی گنجائش یا ضرورت نہ تھی وہ اسے ازل سے جانتا تھا

اس نے دوسری لڑکی پر نظر ڈالی جو کہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی..گوتم نے اسے پھر ذرا دھیان سے دیکھا..یہ لڑکی ہری شنکر کی بہن تھی

چمپک خیمے کے اندر جا کر آٹا نکال لائی..اور گوتم کے کشکول میں ڈال دیا

اب جاو..پھر کبھی آنا.....چمپک نے کہا

وہ اسے پرنام کر کے پڑاو سے باہر آ گیا..اسے اب تک یہ معلوم نہ تھا کہ یہ دونوں لڑکیاں کون ہیں..اور راجن کے لاؤلشکر سے ان کا کیا تعلق ہے..خیموں کے آس پاس نا کی طرح کی بہت سی لڑکیاں گھوم رہی تھیں..مگر یہ دونوں اس ہجوم میں سب سے علیحدہ اور ممتاز نظر آتی تھیں..

یہ دونوں کون ہیں..اس نے بڑی ہمت کر کے ایک بڑھیا سے پوچھا جو کہ تیز تیز قدم رکھتی رسوئی کی طرف جا رہی تھی

بڑھیا نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورا..تم تو برہمچاری نظر آتے ہو..اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا..پھر تم کو یہ جان کر کوئی دلچسپی نہ ہونا چاہیے کہ ان میں سے ایک راج گرو کی بیٹی چمپاوت ہے...اور دوسری راج کماری نرمل ہے اور یہ دونوں راجن کے ساتھ کھیدا کے لیے جا رہی ہیں اور تم آئندہ ادھر نہ آنا..آج کل بہت سے چور اچکے سنیاسیوں کا بھیس بدل کر ٹھگی کرتے پھرتے ہیں..

کلنی کہیں کی چڑیل...گوتم نے چپکے سے کہا اور آشرم کی طرف روانہ ہو گیا

دوسرے دن وہ چادر لپیٹ کر پھر پڑاو کی سمت چل کھڑا ہوا..سارے میں گھوما مگر وہ اسے نظر نہ آئی..[راج گھرانے کی لڑکیاں یوں بھی مجمع عام میں سامنے نظر نہ آتی تھیں]ممکن ہے کہ وہ اندر کسی زربفت کے شامیانے کے نیچے کسی طوطے کو بیٹھی پڑھا رہی ہو..یہ سوچ کر وہ مسکرایا..اس نے سن رکھا تھا کہ طوطوں کو پڑھانا امیرزادیوں کا مشغلہ ہے...ممکن ہے کہ وہ پالکی میں بیٹھ کر سیر کرنے کے لیے شہر چلی گئی ہو وہ شراوستی کی طرف مڑ گیا..جہاں سڑکوں..بازاروں اور جھروکوں میں بہت سے چہرے نظر آئے جو کہ ایک جیسے تھے..وہ پھر باغ کی سمت لوٹ گیا..شاہی خیمے میں کاتک پورنیا کے تہوار کی تیاریاں کی جا رہی تھیں..ان گنت لڑکیاں پھول سنبھالے ساز اٹھائے ادھر سے ادھر جا رہی تھیں..رنگ برنگی ساریاں پہنے ہری شاخوں کے نیچے رقص میں مصروف تھیں..ان میں چمپک کون سی ہے..اس نے ہڑبڑا کر سوچا..کیونکہ اب اسے ہلکا سا شبہ ہوا کہ عورتیں سب ایک سی ہوتی ہیں..ان میں سے چمپک کون ہے..اس نے ذرا اچنبھے سے دل میں کہا

میں یہ ہوں..کدم کے درخت کے پیچھے سے کود کر وہ نیچے اتر آئی

وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا..

تم بھی اداس ہو...میں اس اداسی سے اب عاجز آ چکی ہوں..کل سے نرملا بھی بہت رنجیدہ ہے..آؤ ہمارے ساتھ ناچو..

میرا خیال تھا کہ تم میرے ساتھ بحث کرنا چاہتی تھیں..

فی الحال تو میرا جی ناچنے کو چاہ رہا ہے

نرمل کیوں رنجیدہ ہے..

اس کا بھائی راج پاٹ چھوڑ کر غائب ہو گیا ہے ..کل تمہیں دیکھ کر اسے اپنا دلارا بھائی یاد آ گیا

آنند نے بھی دنیا ترگ دی تھی یہ راہیں بہت کٹھن ہوتی ہیں..

ٹھیک کہتے ہو...

اس کے بھائی کا نام کیا ہے؟

مہاراجکمار ہری شنکر.....

اور اس نے دنیا.....

دنیا کے علاوہ اس نے اور بہت کچھ تیاگ دیا..گدھا کہیں کا..چمپک نے گوتم کی بات کاٹی

گوتم نے اسے دھیان سے دیکھا

سنا ہے آنند نے اپنی چہیتی سندری کو چھوڑ دیا تھا اور وہ بھی سدھارتھ گوتم کے ذرا سے کہنے پر

تو پھر تمہارا مطلب..؟

میرا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں لاکھوں سندریاں اور رہوں گی اور لاکھوں آنند اور ہری شنکر..یہ چکر تو بہت وسیع ہے چمپک رانی

تیاگ کا فلسفہ خود اپنی جگہ ایک اور چکر نہیں؟

اس سندری کو کیا اس بات کا بہت رنج ہے ..گوتم نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے پوچھا

وہ خاموش رہی...

اور اگر آنند واپس آ جائے تو.... کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ابھی پورا راہت نہیں بن سکا..اس کی ارہ کی مشکلیں ابھی باقی ہیں..وہ بار بار لوٹ آتا ہے..وہ ابھی پوری طرح آزاد نہیں ہوا..

یہ تو بہت بڑی خبر ہے..چمپک نے کہا..کیونکہ آزادی بڑی بھاری چیز ہے ..اس سے کہنا کہ کیا وہ بھول گیا..کہ شاکیہ منی نے مہا متی سے کیا کہا تھا؟

کیا کہا تھا؟ گوتم نے زرا چڑ کر پوچھا

شاکیہ منی نے کہا تھا..اے مہا متی جس طرح ناٹک کے ناچ گانے ..وینا بجانے مصوری اور دوسری کلاوں کی مہارت بتدریج حاصل ہوتی ہے اسی طرح ارہت بھی ایک دن میں نہیں بن جاتا ہمارے مہاراج کمار نے بھی تو تیاگ کو ایک قسم کی کلا سمجھ رکھا ہے

وہ باتیں کرتے کرتے تالاب کی منڈیر پر بیٹھ گئے جو کہ خیمہ گاہ کے عقب میں تھا..دور سے آشرم کے جھونپڑے نظر آ رہے تھے..جن پر پھیلی ہوئی کدو اور لوکی کی ہری بیلیں آنکھوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں..لیکن تم کچھ کہنا چاہتے ہو..کیا بات ہے؟چمپک نے سوال کیا

اظہار...اسے محسوس ہوا کہ وہ اظہار نہیں کر سکتا سارے اظہار کا ایک مقصد ہے جو کہ اظہار سے ماورا ہے..میں کیا کہنا چاہتا ہوں..چلو میں تمہیں اپنی تصویریں دکھاوں..اس نے گڑ بڑا کر کہا

اس کا مجھے کیا فائدہ ہو گا...اس نے بشاشت سے پوچھا

تم سمجھتی ہو کہ میں بالکل نکما تخیل پرست مسخرہ ہوں ..جیسے سب طالب علم ہو

تے ہیں ..مگر چمپک رانی ایک روز تم سنو گی کہ شراوستی کا گوتم نیلمبر بہت بڑا چتر آچاریہ بن چکا ہے..اس نے بچوں کی طرح غصہ سے کہا اور پھر چمپک کو دیکھنے لگا کہ شاید وہ خفا ہو گئی اور اب اسے ترکی بہ ترکی جواب دے گی..مگر وہ چپ رہی

وہ منڈیر پر خاموش بیٹھی رہی..کیونکہ اسی طرح آج سے چند سال پہلے ہری نے اس سے کہا تھا.تم مجھے نکما اور تخیل پرست مسخرہ سمجھتی ہو جیسے سب طالب علم ہوتے ہیں..لیکن ایک روز تم سنو گی چمپا رانی..کہ ایودھیا کا مہاراج کمار بہت بڑا ریاضی دان بن چکا ہے

اظہار مقصد سے ماورا ہے..ویدانت میں آیا ہے..کہ آتما کو اپنی خواہشوں کے زیر اثر کائنات سراب کی ایسی دکھلائی پڑتی ہے..جس طرح پیاسے ہرن کو ریگستان میں ندیاں نظر آتی ہیں..اسی مرگ ترشنا نے مجھ کو..ہری کو بہت پریشان کیا تھا

مقصد کیا ہے؟ اصل مقصد کیا ہے ....وہ منڈیر پر سے اٹھ کھڑی ہوئی..اگر تمہارا آنند تمہیں کہیں ملے تو اس سے کہہ دینا سندری مرگ ترشنا سے بھی آزاد ہو چکی ہے اسے فکر نہ کرنا چاہیئے

تم.....یہ خبر صحیح ہے کہ وہ یہار میں جانے والی ہو..؟

شاید ....کیا حرج ہے؟....یہ تجربہ بھی کر دیکھنا چاہیئے...سجارانی نے تو اپنی آنکھیں نکلا کر دی تھیں..کہ دنیا کی ترغیبات سے بچیں

چمپک تمہاری عمر کتنی ہے؟

کئی سو سال..اتنے سو سال کہ مجھے بھی یاد نہیں رہا..اس نے ہنس کر کہا

چند روز ہوئے میں نے بھاٹوں سے بھیشم اور ارجن کا قصہ سن کر یہ سوچا تھا

..کہ چتر انگدا اور الوپی کیسی رہی ہونگی.

مجھے دیکھ کر تمہیں معلوم ہو گیا..؟ وہ پھر ہنسی..اور اسنے کہا..تم تو پر-تما کار یک ہو

ہاں

لیکن تم بھولتی ہو کہ ہر فن پارہ نام وت اور روپ وت کا امتزاج ہے..ایک سے کان دوسرے سے آنکھ آشنا ہوتی ہے...

لیکن جو شے خالص ماہیت ہے..جس کا ادراک خالی عقل کے زریعے کیا جاتا ہے..اسے محسوس نہیں کیا جا سکتا..ورنہ تم خود اپنے نظریے کی تردید کر رہے ہو

خالص ماہیت صرف ماہیت ہے موزونیت نہیں..گوتم نے جواب دیا...کسی مادی علامت کے زریعے اس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے اسے مادی علامات سے مماثل نہیں سمجھ جا سکتا

آ کاش رو پم لکھیا.....چمپک نے ہنس کر کہا

خالص ہیت...گوتم نے جوش سے بولنا شروع کیا..وجود کی تشریح کرتی ہے خود اس کا وجود نہیں..

تم کیا بنانا چاہتے ہو؟

میں تم کو بتاوں گا ایک دن ضرور بتاوں گا کہ میں کیا بنانا چاہتا ہوں.تم میرے گرو سے نہیں ملو گی؟

نہیں....میں نے ایودھیا میں اپنے اساتذوں سے تھا پڑھا ہے کہ وہ لوگ مجھے پڑھا پڑھا کر اکتا گئے..دیکھو تو نرملا کے کتنے مزے ہیں...دن بھر سنگھار پٹار میں

مگن رہتی ہے...ناچ اور گانا سیکھ چکی ہے.. پڑھنے میں اس کا جی نہیں لگتا..

نرملا تمہاری بہت دوست ہے؟

وہ ہماری اور تمہاری مہاراج کماری ہے

پڑھنا تو اس کا بھی فرض ہے

اس کا فرض ہے کہ اب وہ گھر بسائے ..چمپک نے بزرگوں کی طرح کہا...تم بھی تو اپنا برہمچاریہ کا زمانہ ختم کر کے بیاہ و یاہ کر ڈالو گے......

پیچھے سے چھا گل کی آواز آئی...نرملا بہت سارے پھول ٹوکری میں اٹھائے مالنی بنے ہوئے پگڈنڈی پر سے آرہی تھی...گوتم کو دیکھ کر اس نے ٹوکری منڈیر پر رکھ دی...اور ہاتھ جوڑ دیے..گوتم نے برے پہنچے ہوئے اور مقدس برہمن کی طرح اسے آشیر باد دی اور الٹے پاوں لوٹ گیا....

علاوہ تصویریں اور مجسمے بنانے کے تم ناٹک بھی اچھا کھیل سکتے ہو..چمپک نے بشاشت سے کہا اور گوتم کو درختوں میں اوجھل ہوتا دیکھتی رہی

۱۰..

مبارک ہیں وہ جن کو شانتی میسر آچکی ہے ..چمپک نے دل میں دہرایا اور اسے گوتم سدھارتھ کا وہ وعظ یاد آگیا جو کہ انہوں نے گیا میں دیا تھا...ساری چیزوں میں....اے پروہت..آگ لگی ہے..آنکھیں آگ میں جلتی ہیں اور اشکال ..اور بصیرت...حسیات...وفور شوق..آوازیں..خوشبوئیں...ذہن و دماغ...جسم... تصورات...سب دھڑ دھڑ آگ میں جل رہے ہیں...اور نفرت اور محبت اور پیدائیش اور بڑھاپے اور موت اور رنج والم اور دکھ اور گریہ زاری اور مایوسی نے اسے

پروہت یہ الاؤ تیار کیا ہے...

آشرم کا طالب علم لڑکا واپس جا چکا تھا..جنگل پروائی ہوا میں سنسنا رہا تھا ..درکتوں کے نیچے سے چند بھگونیاں کشکول سنبھالے اپنی جھونپڑیوں کی طرف واپس جارہی تھیں ان کے چہروں پر کس قدر سکون تھا کیونکہ وہ ندی میں داخل ہوچکی تھیں...اس راستے پر چل رہی تھیں جہاں سے کبھی واپسی نہیں ہوتی..کیا میں بھی ندی میں داخل ہوسکوں گی..چمپک نے اداسی سے سوچا..مبارک ہیں وہ..اس نے دل میں دہرایا..اس نے پلٹ کر خیمہ گاہ پر نظر ڈالی..جہاں جشن کی تیاریاں کی اج رہی تھیں..پھر وہ چپکے سے منڈیر سے اتر کر اس پگڈنڈی پر آ گئی..جدھر سے گوتم اپنے آشرم کی طرف اورلوٹا تھا..اور جس پر سے گزرتی ہوئی بھگونیاں ندی کے کنارے اپنی جھونپری کی طرف گئی تھیں

چمپک درختوں کی ٹہنیوں کو اپنے سامنے سے ہٹاتی راپتی کی طرف روانہ ہوگئی ..سامنے کچھ فاصلے پر کٹی تھی..جس پر ترئی کی بیل پھیلی تھی...اوراس میں سے گانے کی آواز بلند ہورہی تھی... یہاں اس نے سن رکھا تھا کہ بزرگ ترین راہبہ سمن رہتی ہے..جوکہ کوشل دیس کے ایک راجہ کی بہن تھی اور پچاس سال سے سنیاسن کی اس کٹی میں رہتی آئی تھی

شرواستی بھگونیون اک سب سے بڑا مرکز تھا..اس وقت ان کی ٹولیاں بھیک مانگ کر لوٹ رہی تھیں ان میں ہر طبقے اور ہر عمر کی عورتیں شامل تھیں ..چمپک حیرت اوراچنبھے سے ایک طرف کھڑی ان کو دیکھتی رہی..انہوں نے کام لوک فتح کرلیا ہے اور برہم لوک میں داکل ہوچکی ہیں....کیا میں بھی کبھی کام لوک فتح کر

سکوں گی..اسے گوتم نیلمبر کی بات یاد آئی..اسے ہری شنکر کا خیال آیا..جو کہ برسوں سے اس کے دل میں رہتا تھا..ان بھگونیوں نے کام لوک کس طرح تسخیر کیا..وہ سوچتی رہی مگر اس کی ہمت نہ پڑی..کہ ان کے قریب جا کر ان سے بات کرے..وہ جو زرتار بنارسی ساڑھی اور سونے کے زیورات سے مزین تھی..وہ جو جی بھر کر راگ اور رنگ کی دنیا سے محظوظ ہوتی تھی..حسیات کی کنیز جو جب سے اس لڑکے سے باتیں کر کے آئی تھی جی ہی جی میں ایک نامعلوم سی خوشی کی کیفیت محسوس کر رہی تھی..وہ ایسی حقیر بندی..ان اونچی..پوتر..دیوبالاؤں سے کیا بات کر سکتی تھی..؟

بہن....ادھر آؤ...وہاں کاہے کو کھڑی ہو...ان میں سے ایک نے گویا اس کی کشمکش کو بھانپ لیا..ادھر آؤ...ہمارے سنگ بیٹھو..ایک بھگونی نے قریب آ کر بڑی شفقت سے اسے کہا..

میں.......دیوی سمن سے مل سکتی ہوں....؟

ہاں کیوں نہیں....بہن سمن تو تمہاری ہی راہ دیکھ رہی ہیں

ڈرتے ڈرتے چمپک اس نوجوان بھگونی کے ساتھ کٹی میں داخل ہوئی

سامنے سمن بیٹھی تھی..جوش عقیدت سے چمپک کا گلہ رندھ گیا..اور اس کو اپنے جسم میں جھنجھناہٹ ایسی محسوس ہوئی..سری کرشن کی پجارن چمپک کسی خدا کو نہ ماننے والی راہبہ سمن کے آگے جھک گئی..

باہر اندھیرا چھا رہا تھا..سمن ان سب سے الگ مرگ چھالے پر بیٹھی تان پورہ بجا بجا کر گا رہی تھی...

یہ گانا راہبہ چتا نے راج گیر کی چوٹیوں پر گایا تھا...

گو کہ میں کمزور اور دکھی ہوں اور میری جوانی ختم ہو چکی ہے

اور میں لاٹھی کے سہارے پہاڑ پر چڑھی ہوں..اور میری چادر میرے کندھے سے لٹکی ہے..

اور میرا کاسہ الٹا ہے..

چٹان کے سہارے کھڑے ہو کر میں نے اپنی خودی کو سہارا دیا ہے..

اور آزادی کی ہوا میرے چاروں اور منڈ لا رہی ہے

بدھ کی خواہش پوری ہوئی

چمپک کٹی کی دہلیز میں بیٹھی رہی..بھگونیاں گا رہی تھیں....یکلخت چمپک نے طے کر لیا کہ وہ اپنی بنارسی ساڑھی یہیں پھینک کر اور کیسری دھوتی لپیٹ کر ان سے آن ملے گی ان لوگوں کے اور اس کے درمیان مغائرت کی جو دیوار کھڑی ہے اس کو وہ اپنے اس لباس اور اس زندگی کے ساتھ کبھی بھی عبور نہیں کر سکتی..

مجھے کچھ گوتمی کے بارے میں بتلاو .....کچھ شاکیہ منی کے بارے میں...اس نے ڈرتے ڈرتے سمن سے کہا

سمن خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی..ایک لمحے کے لیے چمپک کو ڈر سا لگا..ان آنکھوں میں گزرے ہوئے وقت کی چھایا جھلملا رہی تھی اور چمپک کو معلوم تھا کہ سمن کتنی بوڑھی ہے..اور چمپک کو وقت سے ڈر لگتا تھا.

مجھے کچھ اپنے سنگ کے بارے میں بتاو.....اس نے ہڑبڑا کر دوبارہ کہا

سمن اٹھارہ برس کی عمر میں اپنا راج گھرانہ تج کر سنگھ میں شامل ہوئی..وہ بیس سال کی تھی جب شاکیہ منی نے مہاپری نروان حاصل کیا..اس کو گئے اسی سال ہو

چکے تھے ..اٹھارہ برس کی عمر میں راج کماری سمن کے حسن کی شہرت دور دور تک پھیلی تھی ..اب ایک اٹھانوے سالہ بوڑھیا پھونس گھیرو لباس پہنے اس کے سامنے بیٹھی تھی ....دنیا تج کر بھی اسے کیا ملا تھا؟ چمپک کے دل میں کسی چور نے پوچھا ..اگر میں نے دنیا چھوڑ دی تو مجھے شانتی مل جائے گی؟ اور اگر یہاں بھی شانتی نہ ملی تو..؟ اس نے آنکھیں بند کر لیں ..پھر اس نے آہستہ سے سمن کی ساری کے کنارے کو چھوا ..سمن گزرتے ہوئے وقت کی گواہ ..شاکیہ منیکے قدموں میں بیٹھ چکی تھی ..جیت وون و یہار کی گندھ کٹی معطر کمرہ جس میں مہاتما بدھ رہتے تھے .میں داخل ہو چکی تھی ..کنڈل کیشی سے مباحثہ کر چکی تھی ..چمپک نے اس کی ساری کے کنارے کو چھوا اور اسے محسوس ہوا ..جیسے اس لمس کے زریعے وہ شاکیہ منی تک بھی پہنچ گئی ہے ..اور اس احساس سے اسے ایک لمحے کے لیے بڑا سکون ملا.....

روہنی ندی کے کنارے شاکیہ منی کا وعظ سننے کے بعد ملک کے پانچ سو امراء نے دنیا تیاگ دی تھی ..ان کی بیبیاں شاکیہ منی کی خالہ اور سوتیلی ماں پجاپتی کے پاس آئیں ..جنہوں نے اپنے شوہر کے مرنے کے بعد رہبانیت اختیار کر لی تھی .اورانہوں نے پجاپتی سے کہا کہ ہم بھی ترک عالق کے خواہش مند ہیں ..شاکیہ منی نے ان کا سنگھ قائم کیا ..اور شہزادیاں اور گرہستنیں اور ہر طبقے اور ہر عمر کی لڑکی بھگوانی بننے لگی .ان کے نگموں سے جنگل اور وادیاں گونج اٹھیں ..وہ گرو کی چیلی بن کر بعد میں خود گرو بنتیں ..دوسروں کو پڑھاتیں ..دھرم کا پرچار کرتی تھیں ..علمی مباحثوں میں حصہ لیتی تھیں ..پنا جو کہ پہلے چندر بھاگ ندی کے کنارے پیدا ہوئی تھی ..اور جس نے اب کے سے شرواستی کے ایک امیر گھرانے میں جنم لیا تھا ...اور

جس نے جوانی ہی میں ارہت کا درجہ حاصل کیا..اور دھیرا اور بھدرا اور ابھی روپ
نندا جسے اپنے حسن پر بڑا ناز تھا..اور بنارس کی ویشیا او دھا کاشی اور اتما جو کہ پہلے جنم
میں داسی تھیں..اور دوسرے جنم میں شرواستی کے ایک سیٹھی کے یہاں پیدا ہوئی اور
راجہ بھیم بسیرا کے پروہت کی لڑکی سوما جو کہ جیت ون کے نیم تاریک کنج میں بیٹھی
تھی ..اور ....مارا ....[ابلیس] نے ..ہوا میں نمودار ہو کر اسے مخاطب کیا ..کہ او
عورت جس کے پاس صرف دو انگلیوں کا احساس ہے.تو اس میدان کو تسخیر نہیں کر
سکتی جس پر بڑے بڑے رشی منی چلتے ہوئے گھبراتے ہیں..[کیونکہ عورت جو کہ
سات آٹھ سال کی عمر سے رسوئی میں چاول ابالنا شروع کرتی ہے اور سارے
وقت یہ دیکھنے کے لیے کہ چاول گلے ہیں یا کہ نہیں انہیں ڈوئی سے نکال نکال کر
اپنی دو انگلیوں کی مدد سے مسل مسل کر ان کی گنی دیکھتی ہے] پر سوما نے مارا کو مار
بھگایا..اور ارہت بن گئی اور ویشالی کی طوائف وملا اور ویش لی کے سپہ سالار کی لڑکی
سہا جس نے گایا.....میں جسے چیزوں کا...کیا..کیوں بہت ستاتا تھا..اور گزرتے
وقتوں کی یاد بہت تنگ کرتی تھی ..میں نے خودکشی کی ٹھانی ..تا کہ پھر سے اس
دنیا میں ذلیل زندہ رہوں...مگر مجھے راستہ مل گیا اور بدھ کی خواہش پوری ہوئی..اور
شرواستی کی برہمن زادی ملکتا اور ویشالی کی رقاصہ امبا پالی اور ہنس وتی شہر کی سندری
نندا اور راج گیر کی سنہرے بالوں والی کنڈل کیشی جو کہ ایک ڈاکو کے عشق میں دل
شکستہ ہو کر پہلے جین سنیاسن بنی اور جو کہ سیب کی ٹہنی ہاتھ میں لے لے کہ گاؤں
گاؤں للکارتی پھرتی تھی..کہ کوئی ہے کہ جو آن کر بحث میں مجھے ہرائے.اور چندا
اور ارج گیر کی ملکہ کھیم جو کہ اپنے حسن پر بڑی مغرور تھی..اور جس نے بانس کے

جھنڈ میں پہلی بار شا کیہ منی کو دیکھا.اور خوبصورت امیر زادی انو پم اور مہارانی کھیم کی سہیلی وجے اور سبھارانی ...آم کے باغ میں ایک نوجوان نے ان پر ڈورے ڈالنے چاہے تھے تو جنھوں نے اپنی آنکھیں نکال لی تھیں

یہ سب اب دوبارہ پیدا نہیں ہونگی کیونکہ انہوں نے ارہت کا درجہ حاصل کرلیا تھا... یہ سب ندی میں داخل ہو چکی تھیں.... باہر کوئی اسے آواز دے رہا تھا...

وہ کٹی سے نکلی ...خواصیں اور ہرکارے اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آن پہنچے تھے کیونکہ جشن کے لیے خیموں میں اس کا انتظار کیا جارہا تھا...

عورتوں کے متعلق ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے ..؟سو سال قبل یہیں شرواستی میں ایک اہم سوال کیا گیا تھا....

ان کی طرف دیکھنا بھی نہیں آنند....جواب ملا تھا

لیکن فرض کیجیے وہ نظر ہی آجائیں

ان سے بات مت کرنا

لیکن اگر وہ خود سے بات کرنے لگیں تو....؟

برابر جاگتے رہنا......

کئی راتوں تک متواتر جاگتے رہنے کے بعد دفعتاً گوتم کو نیند کا زوردار جھونکا آگیا.لیکن کوشش کر کے اس نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں

طالب علمی کے زمانے میں جب وہ آشرم میں یا کتب خانوں میں مختلف کتابیں پڑھتا تو عجیب وغریب متضاد نظریے عورتوں کے متعلق اس کے مطالعے میں آتے ...مہابھارت کی بارہویں کتاب میں لکھا تھا کہ عورت کبھی غیر مقدس ہو

ہی نہیں سکتی...لیکن تیرہویں کتاب کا بیان تھا کہ عورت ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے ..اس کی طبیعت میں اوچھاپن ہے ..اسور یہ کہ اچھے گھرانوں کی خواتین طوائفوں کے ملبوسات اور گہنے پاتوں کو رشک کی نظر سے دیکھتی ہیں..ساور چونکہ سارا شر پیدائیش کی وجہ سے ہی ظہور میں آتا ہے..اورعورت پیدا کرنے والی ہے لہزا عورت ہی دنیا کے سارے شر کی ذمہ دار ہے....اور یہ عورت صرف محبت کی بھوکی ہے..اور سخت نا قابل اعتبار

لیکن اسی صحیفے میں یہ بھی لکھا تھا کہاں سب کمزوریوں کی باوجود عورت کی عزت کرنا چاہیے..ساتھ ہی ساتھ عورت کو دیوی کا درجہ حاصل تھا..اس کی وفاداری .شرافت...شرم وحیا کی رشی منی قسمیں کھاتے تھے...لیکن شرواتی کی ویشائیں اور ناٹک میں اداکاری کرنے والی نائیکائیں اور سیاسی خدمات انجام دینے والی جاسوس عورتیں اور وش کینیائیں بھی تو عورتیں ہی تھیں

اور اروشی نے اپنے چاہنے والوں سے کہا تھا کیوں اپنی اجن کے پیچھے ہاتھ دھوکو پڑے ہو...خود کو بھیڑیوں کے پنجوں سے بچاو...

عورتوں سے دوستی رکھنا ناممکن ہے کیونکہ ان کے دل بھیڑیوں کے مانند ہوتے ہیں...

اور دوسری طرف گندھاری تھی...جس نیا پنے اندھے منگیتر کی خاطر خود بھی اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی تھی اور انوسیا اس قدر وفا شعار تھی کہ اپنے پتی کو خود اپنی سوتن کے گھر پہنچانے کے لیے گئی تھی اور کہیں پر یہ بھی لکھا تھا کہ پتی ورتا عورت کے لیے دوسرے آدمی سائے کے سمان ہیں..اور منومہاراج نے کہا تھا کہ جس جگہ

عورتوں کی عزت کی جاتی ہے وہاں دیوتا خوشی سے رہتے ہیں

لیکن شاکیہ منی نے کہا تھا..عورت بیوقوف ہوتی ہے آنند.......عورت حاسد ہوتی ہے آنند..عورت بد باطن ہوتی ہے آنند...عورت سے بچو...عورت سے بچو ناری.بزتی ہے...مجسمہ شر

ایک مرتبہ شاکیہ منی اپنے بارہ سو چیلوں سمیت اسی جیت ون میں موجود تھے جو کہ جھیل کے اس پار نظر آ رہا تھا..اور راجہ پرسین جیت نے ان کی دعوت کی تھی ....اور انند جو کہ کہیں باہر گیا تھا..اس دعوت میں نہ پہنچ سکا تھا

خوبصورت آنند نے اپنا کشکول اٹھایا اور ہمیشہ کی طرح سوچ میں ڈوبا شہر میں بھیک مانگنے کے لیے نکل گیا...اس کے لیے کشتری اور چنڈال سب برابر تھے..اور اسے اپنی نیک نامی کا بڑا خیال تھا..اور بڑے وقار کے ساتھ اس نے شہر کی پناہ کی خندق عبور کی.اور شرواستی کے پھاٹک میں داخل ہوا...اور بھیک مانگتے مانگتے ایک مشہور رقاصہ کے دروازے پر پہنچا..اور رقاصہ کی لڑکی اس پر عاشق ہو گئی اور اس نے ایسا جادو ڈالا کہ بچارہ آنند دکھشنا لینا بھول کر سیدھے اس کے گھر میں داخل ہو گیا

اور شاہی محل کے ایوان ضیافت میں بیٹھے بیٹھے شاکیہ منی کو علم ہوا کہ آنند بڑی آفت میں مبتلا ہے اور انہوں نے دوسرے چیلے کو اس کی دستگیری کے لیے روانہ کیا

اور شاکیہ منی نے آنند سے کہا...میں اپنے پری نروان کے بعد چاہتا ہوں کہ تم سب میرے خاص چیلے...بودھی ستو..مہاستو اور ارہت...مکمل نجات حاصل کرنے کی بجائے آخری کلپوں میں دوبارہ پیدا ہونا منظور کر لو...تم طالب علموں...عام

آدمیوں.. بادشاہوں.. وزیروں.. امیروں... برہمچاریوں حتکہ طوائفوں اور بیواوں اور بدمعاشوں.. اور چوروں اور قصابوں اور بساطیوں کی صورت میں جنم لو... تا کہ تم ہر طبقے کے انسانوں میں گھل مل کر انہیں مکتی کا راستہ دکھلا سکو.. صرف مرتے وقت اپنی اصلیت ظاہر کرنا ورنہ بدعتی تمہیں ورغلائیں گے..

اگر کوئی چیلا اپنے پہلے کلپ کی عادتوں کو ترک نہ کرسکا تو تم اس پر وہ اسرار منکشف کرنا جو کہ مجھ پر بودھی درکت کے نیچے کنول کے پھولوں کے درمیاں ظاہر ہوئے تھے

آنند ابھی جب اس لڑکی نے تم کو بہکایا یہ محض اس جنم یا اس کلپ کا اتفاقی حادثہ نہ تھا.. کئی کلپوں سے تم اس کی کشش میں مبتلا ہو... لیکن وہ پچھلے کلپوں کا بندھن اب ٹوٹ چکا ہے تم اور وہ اب آزاد ہو...

آزادی کا مقصد کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ کون آزاد ہے اور کون نہیں؟ گوتم نے اپنے آپ سے سوال کیا.. ہری شنکر تم کو آزادی کی تلاش میں کیا ملا؟ آنند جو اسرار تم پر منکشف ہوئے وہ تمہارے سوا کون جانے گا؟ ہم سب اپنے اپنے اسرار میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کر سکتے

شاہی خیمہ گاہ کی جانب سے جھانجھ اور شہنائی کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو چکی تھیں.. کبھی کبھی گھنگھرووں کی جھنکار سنائی دی جاتی تھی.. چودھویں تاریخ کا چاند ڈولتا ڈولتا آشرم کے اوپر آ گیا.. اور اس کے اجالے میں پھولوں کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے جھونپڑے انتہائی پرسکون نظر آ رہے تھے.. اکادکا چراغ جل رہے تھے ... باقی طالب علم سو چکے تھے.. صرف اب تک وہی جاگ رہا تھا

جانے اس سمے راجن کے پڑاو پر کیا ہو رہا ہوگا ؟ روشنی ..موسیقی ..اور رقص ..اس نے اپنے ذہن میں چمپک کے تصور کو انہی تین چیزوں سے وابستہ کر رکھا تھا روشنی ..موسیقی ..اور رقص

وہ آہستہ سے اٹھا اور کاندھے پر چادر اچھی طرح لپیٹ کر دبے پاوں آشرم سے باہر نکلا اور مہوا کے باغ کی سمت روانہ ہو گیا ..اس سمے وہ بڑی بھاری چوری کر رہا تھا ..اور اس چوری پر شدت سے مسرور تھا ..اس کا سایہ زمین پر اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا ..اس کے پیروں کے نیچے خشک پتیاں زور زور سے کھڑ کھڑا رہی تھیں ..ایک گلہری اس کی آہٹ پر چونک کر تیزی سے بھاگی ..ادھر ادھر دیکھتا ہوا کہ کوئی اسے پہچان نہ لے ..وہ دھیرے دھیرے سے مہوے کے باغ میں داخل ہوا ..جہاں مشعلوں کی روشنی تیز ہو رہی تھی ..وسط میں منڈپ ایسا بنا تھا جس کے ایک جانب سنگیت کار لڑکیاں سر منڈل اور چھتارے اور جھانجھ لیے بیٹھی تھیں ..راج گھرانے کے مرد اور عورتیں چاروں اور جمع ہنسنے بولنے میں منہمک تھے ایودھیا کے لوگ رقص اور موسیقی میں اپنی مہارت کی وجہ سے سارے دیس میں مشہور تھے ..اس مجمعے میں ہر شخص کلاونت جان پڑتا تھا ..

دفعتا گوتم کی نظر اس بوڑھی خادمہ پر پڑی ..جس نے کل اسے ڈانٹا تھا ..وہ ذرا گھبرا کر ایک خیمے کی آڑ میں ہو گیا ..اگر کوئی اسے اس سمے دیکھ لے تو کیا ہو ..وہ گوتم نیلمبر آشرم کا سب سے سعادت مند اور قابل طالب علم ..مشہور لیکھک اور چتر کار .. برہمچاری ..اس سمے چوروں اور آوارہ گردوں کی طرح ایک خیمے کے پیچھے چھپا لڑکیوں کو ناچتا ہوا دیکھ رہا تھا

....اا

ناچ....ناچ...ناچ

چھایا پتھ کہکشاں.. پر اپسرائیں ناچ رہی تھیں..مرگ گھٹ میں کالی رقصاں ہے..دل کے سنہرے ایوانوں میں شیو ناچتا ہے..اور گوکل میں نٹور گر دھاری.... کیلاش پر اوما ناچتی ہے..اور یہاں راپتی کے کنارے..مہوا کے جھرمٹ میں... خزاں کے چاند تلے وہ ناچ رہی ہے..جسے کوئی کماری چمپک کہتا ہے..کوئی چمپارانی..کوئی چمپاوتی..اس کے ہزاروں نام ہوسکتے ہیں کیونکہ اس کے ان گنت روپ ہیں...اس کی اداسی..اس کی ہنسی...اس کی مسکراہٹ..اس کا دکھ..اس کا ویراگ.. اس کی مسرت..اس کی نفرت..یہ ایسے بھاو اور ایسے رس ہیں جنہیں بھرت منی بھی نہیں سمجھ سکتے...کسی شلپ شاستر میں اس ناچ کا ذکر نہیں..جو کہ میں نے اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھا..کسی نند کشور..کسی بھرت منی نے اپنی کتابوں میں اس کی مدراوں کا تذکرہ نہیں کیا..اس ناچ کے قوانین نہیں بنائے....یہ بڑی انوکھی راس لیلا ہے..یہ بڑا اتم شرنگار رس ہے..لڑکیاں سازوں پر چھایا راگ الاپ رہی ہیں..سبز طوطے پر سوار کام دیو اپنا پھولوں کا بان چلاتا ہے...اور پراکراتی مایا بن جاتی ہے..شو کی تیسری آنکھ کے شعلے نے کا دیو کو جلا کر بھسم کر دیا تھا..لیکن کام دیو تو اننگ ہے..انسانوں کے دلوں میں موجود ہے....شیو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا

اور وہ اس طرح ناچ رہی ہے مانو پاروتی نے دیبی اوشا کی بجائے اسی کو بھرت ناٹیم کی تعلیم دی تھی..رقاص شہزادے ارجن نے آسام کی چتر نگدا اور رد کھشن کی راجکماری اترا کی جگہ اس کو اپنا شاگرد بنایا تھا..وہ جو سفید ساری پہنے کمدنی التسو کا

تہوار منا رہی ہے اس نے بالوں میں کیسر کے پھول اڑس رکھے ہیں۔اس کے جوڑے کو رتنا جلی نے ڈھانپا ہوا ہے۔۔اس کے گلے میں وجنتی مالا ہے۔۔جس کے صدف اور یاقوت۔۔زمرد اور نیلم اور ہیرے چاندی میں جھلملا تے ہیں اس کے گلے کی مکتاولی اور شیکھر ہار اور سفید موتیوں کی سدھ ایکاولی کی چھوٹ اس کئے چہرے پر پڑ رہی ہے۔۔اس کے کانوں میں کرن پھول ہیں۔۔اس کے کنول ایسے پیروں میں پد پد ما جگمگا رہی ہے۔۔۔اس کے ماتھے پر طلائی سیس پھول سجا ہے۔وہ سولہ سنگھار کیے اپسرا شر دوتی کی طرح خزاں کے چاند تلے ناچتی ہے۔۔۔۔سارا شر واستی سارا یودھیا سارا کسم پورہ سارا جبو دیپ۔۔۔کاتک پورنماشی منا رہا ہے۔۔اور شیو نے آنکھ کھولی ہے۔خزان جو کہ شیو کے جسم کی مانند زرد ہے۔۔شیو بھبھوت رمائے ہاتھی کی کھال پہنے لیٹا ہے۔۔اس کی جٹاؤں سے گنگا بہہ رہی ہے۔۔اس کے ماتھے پر ہلال جگمگا تا ہے۔۔وہ بہت کم کم ہنستا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔چتر م سا گزرنے کے بعد وشنو اپنی گہری نیند سے جا گا ہے وشنو جو کہ انت ل امحدود عقل کا مظہر شیش ناگ۔کی پیٹھ پر پڑا سوتا تھا۔وشنو چیتر جو کہ خلا کو نگل چکا ہے۔۔جو کہ ساری کائنات کا زہر ہلال پی چکا ہے۔۔انت پر بیٹھا ہوا وہ زمان و مکان کی قید سے بلند ہے۔۔اور وشنو اپنی ڈمرو بجا رہا ہے۔۔اور زمان و مکان اس کے ڈمرو کی آواز پر لرزرہے ہیں۔۔اور سبزہ زاروں پر چاند کی روشنی برس رہی ہے۔۔اور چاندنی فضا میں گھل گئی ہے۔۔اور جب دنیا احساس اور چھونے اور دیکھنے اور تجربہ کرنے کی دنیا اس قدر دلکش ہے تو اس میں مرگ ترشنا کا کیا دخل؟ یہ سب اصلیت ہے۔۔زندگی سب سے بڑی اصلیت ہے۔۔تخلیق سب سے بڑی حقیقت ہے۔۔۔۔تخلیق عظیم ہے۔۔شکتی کی تقدیس کرو جو کہ تخلیق کرتی ہے

..دیوی کی تقدیس کرو جو کہ ماں ہے..ماں....اوما....گوری..کاشمی.....جس کا دوسرا نام آشا ہے..جس کا دوسرا نام کملا ہے..جس کے تصور کی تشکیل کنول کے پھولوں نے کی....وہ چمپا کے پھول کی طرح معطر ہے...وہ ماں ہے...جیسے کہ زمین ماں ہے..جیسے ندی ماں ہے..ماں الوہی ہے..عورت الوہی ہے...کیونکہ ماں ہے..چمپک الوہی ہے...اس کی حمد کرو...اس کی عبادت کرو..اس کے آگے جھک جاو...وہ اس خنک زرد گھاس..اس ہری زمین کی دیبی ہے...ابدی ماں..اور ابدی رفیق..میری بہت پرانی ساتھی ہے...کیا میں اسکو نہیں جانتا؟

رگ وید میں لکھا ہے کہ میاں بیوی وہ ہیں جو کہ ذہنی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہوں

کیا کبھی ایسا ہو گا کہ اسے وواہ [رتھ] میں بٹھلا کر اپنی دلہن کی طرح اپنے گھر لے جاوں گا...؟

۱۲..

مجمع چونک اٹھا...ایک نوجوان خیمے کے پیچھے سے نکلا..منڈپ میں آ کر اس نے جھک کر گھنگھرو باندھے..اور اپنی سفید چادر ایک طرف پھینک کر انند تانڈو ناچتا سامنے آ گیا...

مجمع مسحور ہو کر اس کا رقص دیکھتا رہا.....لگتا تھا کہ جیسے نٹ راج نے اپنا فن اسے خود سکھلایا ہے وہ خود ہی نٹ راج ہے

چمپک ناچتے ناچتے رک گئی..اس نے رقاص کو اچنبھے سے دیکھا

مردنگ زور زور سے بجتی رہی...سندصیا تانڈو اچتا ہوا وہ منڈپ کے وسط میں

آ گیا..

اس نے شو کی مانند رقص کے ایک سو آٹھ مختلف مظاہرے کیے..اس نے آٹھوں رس دکھلائے..یہ وشنو کا سرنگار رس ہے..یہ اندر کا ویر رس ہے....یہ یم کا کرونا ہے...یہ رورا کا رور رس ہے...یہ کال کا بھیانک رس ہے...یہ گندھرو کا ابھت رس ہے...یہ شانت رس ہے....یہ شو کا رقص ہے...اس کی زراوں میں کائنات کا سارا عمل ارتقاء مضمر ہے...اس کی زبان سارا اظہار ہے..اس کا لباس چاند اور ستارے ہیں.شو جو کہ جسم تان ہے اور مجسم سنگیت..جو کہ آفاقی لے کا مظہر ہے

مادر کائنات اوما ہماوتی کو کیلاش کے سب سے اونچے تخت پر بٹھا کر نٹ راج اس کیاس منے ناچتا ہے...سرسوتی وینا بجا رہی ہے..اندر بانسری...برہما جھانجھ بجا تا ہے...لکشمی گاتی ہے...اور وشنو مردنگم بجا رہا ہے..سارے دیوتا اور گندھرو اور سدھ اور ودیا دھر آس پاس کھڑے ہیں...یہ شام کا سمے ہے..سندھیا کا رقص ہے

..

چمپک اپنی جگہ سے اٹھی اور ناچتے ہوئے اس کے برابر ہو گئی...

ان دونوں نے مل کر اوتا ماندا شروع کر دیا..وہ گوری تھی اور شنکر کے ساتھ رقصاں تھی..

چاندنی کھلے میدانوں پر نغمہ ریز تھی..اور چاندی کے رنگ کے بال ندی پر تیر رہے تھے اور چاندی کے رنگ کے سارس پروں میں چونچ چھپائے بالو پر سو رہے تھے اور کاتک کا پورا چاند پھولوں کے اوپر سے جھانکتا تھا

مگر وہ رات بھی ختم ہوئی..اور تہوار منانے والوں کا ہنگامہ کم ہوا..اور ان کے

گیتوں اور گھنگھروں کی آوازیں مدھم پڑ گئیں ..اور پو پھٹے سمے تک شاہی خیمہ گاہ پر خاموشی چھا گئی...اور منڈپ میں پھولوں کے چند گجرے اور کلیوں کے سے انبار بکھرے پڑے رہ گئے

۱۳..

صبح ہوئی.. ہالیہ کی چوٹیوں پر دھند تیر رہی تھی ..تالابوں میں سرخ کنول کھل گئے تھے ...گاؤں کی سڑک پر جاتی ہوئی گنوالنوں کی رنگین گگریاں دھوپ میں جگمگا رہی تھیں مہوا کے پیلے پھولوں پر منڈلاتی ہوئی مدھوکر..شہد کی مکھی..اس کے کانوں میں بھنبھایا کی...اور جب سورج کی تیز کرنیں اس کے پپوٹوں میں گھسیں تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا..اور اس نے اپنے آپ کو تالاب کی شکستہ سیڑھیوں پر لیٹا ہوا پایا ..اس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا..وہ کہاں تھا اور یہ سب کیا تھا؟...اس نے دماغ پر بہت زور ڈالنے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ یاد نہیں تھا

چمپک......چمپک.....چمپک

سارے وقت مدھو صرف یہی بھنبھاتی رہی تھی...وہ اطمینان سے انگڑائی لے کر اٹھا اور دوسری انگڑائی لے کر پھر سیڑھی پر بیٹھ گیا...دفعتاً اس کی نظر مہوا کے جھنڈ پر پڑی..جو کہ سنسان پڑا تھا..یہ جگہ جہاں ساری دنیا کی رونقیں سمٹ آئی تھیں ..اس وقت بھائیں بھائیں کر رہی تھی ..ایک ہرن درخت کے پیچھے سے بھاگا.. چند گلہریاں بیل کے پھل کترتی رہیں..ہرے طوطوں کی ایک ڈار شاخ پر سے اڑ گئی ...جنگل خاموش پڑا رہا..وہ حیران و پریشان وہیں بیٹھا تھا..پھر اسے رفتہ رفتہ بہت دھندلے خواب کی طرح یاد آیا اس جگہ رات بھر پہلے شاہی خیمہ گاہ تھی..اور اس میں

وہ منڈپ کے نیچے رات گئے تک ناچا تھا..وہ سب ناچے تھے اور جب ن اچتے ناچتے وہ تھک گیا تھا تو راجن سے اسے بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا..اور اس نے راجن کے ساتھ خوب جی بھر کر مدرا پی تھی اور بھنا ہوا ماس کھایا تھا...اور زر زنگار چھتر کے نیچے اطلسی مسند پر بیٹھا تھا..اور اس محفل رنگ و بو میں اس کی نظریں برابر چمپک کی متلاشی تھیں..لیکن وہ رقص ختم ہونے کے ساتھ ہی شہزادیوں کے ساتھ زنان خانے کی طرف چلی گئی تھی...اور اس کے انتظار میں وہ پو پھٹے سے تک وہاں بیٹھا رہا..جب وہ منڈپ سے باہر نکل کر لڑکھڑاتا ہوا آشرم کی طرف لوٹ رہا تھا.. اس وقت اسے نیند کا جھونکا آیا تھا..اور وہ تالاب کے کنارے پڑ کر سو گیا تھا...اور صبح صبح کوچ کا نقارہ بجا تھا..اور خیمے اٹھا دیے گئے تھے..اور جب شاہی قافلہ کھیدا کے لیے روانہ ہو رہا تھا..اس وقت چمپک نو ملا کے ساتھ تالاب کے کنارے سے گزری تھی..اور نرملا نے اس سے کہا تھا..کیسا انوکھا برہمن ہے..پرسوں تم سے چتر کاری کے متعلق بحث کر رہا تھا...رات کونٹ راج کی طرح ناچا..اور اس وقت بچوں کی طرح پڑا سوتا ہے..جانے سے پہلے آؤ اسے جگا کر پرنام تو کر لیں..

چمپک چند لمحوں کے لیے خاموش گم سم کھڑی رہی تھی اور پھر اس نے جواب دیا تھا..نہیں..کیونکہ جو جاگتا ہے اسے ایک دن نیند آ جاتی ہے..اور جو سوتا ہے وہ ایک روز جاگ اٹھتا ہے..ان لوگوں کی طرف دیکھو جو کہ مسلسل جاگتے رہتے ہیں

اور اب مہوے کے باغ میں مکمل سناٹا تھا..وہ تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھا سوچتا رہا..اس ایک رات میں وہ دفعتاً کتنا بڑا ہو گیا تھا..اس نے دل کی کائنات کی سیاحت کی تھی..اس نے مایا کا تجربہ کیا تھا...اور وہ اس تجربے سے غیر مطمئن نہیں تھا..

لیکن یہ کیسا عجیب احساس تھا جیسے شیوا کی بجائے زندگی کا سارا ہلاہل اس نے خود پی لیا ہو.. یہ کیسا انوکھا تجربہ تھا..اس کی شرط تو اس نے کپل سے نہیں لگائی تھی..اور ہری شنکر تو کہیں ہزاروں میل کے فاصلے پر کھڑا رہ گیا تھا

اس کا جی چاہا کہ دوڑتا ہوا جائے..اور شاہی قافلے سے جا ملے..راجن کا ایک حقیر کہار بن کر ان لوگوں کے ساتھ چلے..اس لڑکی کے پیچھے پیچھے افق کے دوسرے کنارے تک پہنچ جائے

لیکن وہ تو اس سے چلتے وقت مل کر بھی نہیں گئی..اس نے اسے قریب آکر جگایا تک نہیں

چنانچہ وہ مجھ سے ایک بات کہے بغیر ہی چلی گئی..اور ایک لمحے کے لیے اسے بڑی طمانیت محسوس ہوئی..اس کا یہ احساس شدید ہو گیا کہ وہ اس سے الگ نہیں.. اس کے وجود میں شامل ہے..اسے مجھ سے بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو مجھ سے ہر سمے باتیں کرتی رہتی ہے..مگر یہ بھی غلط ہے..بکواس میں تو اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہوں..میں مایا کے فریب میں اچھی طرح مبتلا ہو چکا ہوں..وہ مجھ سے الگ ہے..بہت دور ہے..بھلا میں کہاں اور وہ کہاں..؟ یہ سب جھوٹ ہے

بہت اچھا...اس نے تالاب کی سیڑھی پر سے اٹھتے ہوئے کہا..[یہیں اس روز وہ بیٹھی تھی]تم اپنے کروفر کے ساتھ ہاتھیوں کے شکار کے لیے روانہ ہو چکی ہو..اور زندگی....تمہارے بنا بھی گزر سکتی ہے

آشرم کے راستے پر چلتے ہوئے اسے یاد آیا کہ اس کی تعلیم کا آخری سال ہے .عنقریب اس کا باپ اسے گھر لے جانے کے لیے آئے گا..گر وا سے رخصت کر

تے وقت اپنی نصیحت دہرائیں گے ..وہی الفاظ دہرائیں گے جو کہ ہر فارغ التحصیل طالب علم کے سامنے صدیوں سے دہرائے جا رہے تھے..سچ بول اور دھرم کر..(دھرم؟) آشرم کے سارے لڑکے اس کے عمر بھر کے ساتھی اسے گھاٹ تک پہنچانے جائیں گے.فضیلت کی پگڑی باندھ کر وہ آنکھوں میں پہلی بار انجن لگائے گا..کانوں میں منی کنڈل پہنے گا.کیسری لباس کے ساتھ کاندھوں پر اونی کمبل ڈال کر پیروں میں جوتی پہن کر بالوں میں تیہی کے کانٹوں سے بنی کنگھی اڑسے .. چھتری لگائے وہ شان سے شرواستی کی سڑکوں پر نکلے گا..ایودھیا اور پاٹلی پتر کے دربار وں میں جائے گا..وہ پروہت کی مسندوں پر بیٹھے گا.حکومت کے منتری منڈل میں شامل ہوگا..جبکہ بیچاری مورکھ لڑکی مگدھ کے کسی اجاڑ وحشت خیز و یہار میں سر گھٹائے بیٹھی شاکیہ منی کے بتلائے ہوئے نروان کے حصول میں جٹی ہوگی

اگر وہ اپنے ذہن پر اس قدر غرور کر سکتی ہے تو کیا میں اپنے رتبے پر نازاں نہیں ہوں..اور خالی مسوری اور سنگتراشی میں کیا رکھا ہے..؟ میں ستر ادھر بنوں گا.. میں قوانین بناوں گا۔منو کپل اور جیمنی میری گرد کو نہیں پہنچ سکتے..میں ذہن کی دنیا تہہ و بالا کر کے رکھ دونگا..علم میرا ہے..گنیش کا قلم میرا ہے..!اگر چمپک میری نہیں ہو سکتی..تو کیا اندھیرا ہوگیا..سرسوتی تو میری ہے وہ مجھے کبھی بھی اس طرح چھوڑ کر نہیں جائے گی

اور چمپک میں رکھا ہی کیا ہے..خوبصورت تو دنیا میں ہزاروں لڑکیاں ہیں.. نرملا کتنی خوبصورت تھی..چمپک اگر غور سے دیکھی جائے تو تم ایسی بھی حسین نہیں اس کی شکل کیسی تھی بھلا..؟ اس نے غصے سے چلتے چلتے تین چار کنکروں کو ٹھوکر

لگائی.. میں نے کم از کم یہ تو طے ہی کر لیا ہے.. کہ تمہاری تصویر ہرگز نہیں بناوں گا.تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو.. میں تمہیں کچھ نہیں سمجھتا.. میں تو اس کی شکل بھی بھولتا جا رہا ہوں.شکل محض ہیولے ہے..میرے دل کے اندر جو روپ محفوظ ہے ..اسے صرف وشوا کرمن پہچان سکتا ہے

وہ اپنی کٹی میں داخل ہوا..پھر باہر نکل آیا..اور ادھر ادھر گھوما پھرا..آشرم کے لڑکوں نے اسے حیرت سے دیکھا کسی نے اس سے پوچھا.کل رات سے نظر نہیں آئے..کہاں تھے؟

تو اس نے رکھائی سے ان کی بات ٹال دی..

اکلیش سے اس نے جھوٹ بولا تھا.. کہ ندی کے کنارے تپسیا کر رہا تھا.عمر میں پہلی بار اس نے جھوٹ بولا تھا اور اب اسے سارے جھوٹ بہت اچھے لگ رہے تھے ..اس نے سندھیا نہیں کی نہ گرو کے درشن کے لیے گیا آشم کے کنجوں میں مارا مارا پھرتا رہا

میں اس کی تصویر ہرگز نہیں بناوں گا میں پر یتما کاریک ہوں..فن پارے کو زندگی کے سارے رشتوں سے بلند تر ہونا چاہیئے ..اس نے بار بار دل میں دہرایا.. لیکن بالآخر اس سے رہا نہ گیا..وہ کلا کار تھا..اور تخلیق کی لگن نے اسے بہت پریشان کر رکھا تھا

دوسرے روز صبح سویرے وہ اپنا تصویر کشی اور مجسمہ سازی کا سامان لے کر مہوے کے باغ کی سمت روانہ ہو گیا.تالاب کے کنارے بیٹھ کر اس نے گیرو پیسا اور سرخ رنگ تیار کر لیا..نیل کی پڑیا مٹی کے کٹورے میں گھول دی.. ہلدی اور کیسر

سے زرد اور زعفرانی رنگ تیار کیے۔۔دوسرے رنگوں کے لیے جڑی بوٹیاں ابالیں۔
اور سفید چینی پٹہ سامنے پھیلا کر تصویر بنانے بیٹھ گیا۔مگر روپ اور اروپ کی کشمکش
نے پھر اس کا موقلم روک لیا۔۔میں کیا بناؤں؟ پھر اس نے سوچا کہ معنی کا کوئی مقام
نہیں ہوتا۔۔ایک ہی معنی کو مختلف علامتوں کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔۔اور ان
علامتوں کو مختلف مقامات سمجھا جا سکتا ہے۔۔ان کی وجہ سے معنی محدود نہیں ہو جاتے
۔۔تصویر رنگ نہیں مصور کی روح ہے۔۔دیکھنے والوں کی آنکھیں ہیں جنہوں نے اس
کا اشارہ سمجھ لیا ہے۔۔رنگے ناودیا تے چتر م۔۔آنکھ صرف رنگ دیکھتی ہے جو کہ سطح پر
موجود ہیں۔۔جس طرح شاعری محض بیان ہے جسے حس نے تحریک دی ہے۔۔جس کا
کوئی مقام نہیں۔۔حس تجربہ حس میں موجود ہے۔۔۔

اسے یاد آیا۔۔ویدانت والے کہتے ہیں۔۔ذات مطلق امورت ہے۔۔جس کی کو
ئی شکل نہیں۔۔جو کہ ادراک سے باہر ہے۔۔وہ ذہنی تصور یا خیال بھی نہیں۔۔اس لیے
ویدوانت والوں کے نزدیک فن کا تصور اپار برہما یا کمتر درجے کی عالمت سے
آگے نہیں بڑھتا۔۔برہما ایشور ایسی ذات ہے جسے شکل سے تشبیہ دی جا سکتی ہے
۔۔اور اس تصویر کا اصل مخرج روشنی ہے۔۔اس کی اصل ہیئت یا سروپ مختلف چیزوں
کی ہیئت ہے۔۔وشواروپ

اصل مسئلہ یہ تھا کہ خیال محض علامت کے ذریعے ہی دیکھنے والوں تک پہنچایا
جا سکتا تھا۔سرائے چتر کار اور نقاد کم از کم اس بات پر متفق تھے۔۔اسی نظریے نے
اصنام پرستی کی ترویج شروع کی تھی

مگر خیال سے علیحدہ گوتم نے سوچا۔۔زندہ ہستی تو بذات خود زندگی ہے۔۔علا

مت نہیں ..اس کی طرف کشش جزبات پر مبنی ہے ..پھر کلا کار خالص خیال کو کس طرح پیش کرے ..؟ اس کا رویہ تو غیر جانبدار نہیں رہ پائے گا ..دھیان ..جو کہ کلا کار کا اصل فن ہے ..سالم نہیں رہ سکتا ...خالص ہیت ..... شئے کا تصور جو کہ خود شے ہے ...اصل دھیان ہے ....شے کی شخصی کیفیت کو کس طرح نظر انداز کیا جائے ؟

حقیقت زندگی سے آنکھیں نہیں چرائیہ جاسکتیں

اسی طرح تالاب کے کنارے بیٹھے بیٹھے اس نے بہت سی تصویریں بنائیں ..اور بگاڑ دیں ...سرخ مٹی سے بہت سی مورتیاں گھڑیں اور توڑ ڈالیں

آشرم کے لڑکوں میں کانا پھوسی شروع ہوئی ...یہ گوتم کچھ باولا ہوتا جا رہا ہے ..اسے کیا ہو گیا ؟ اکلیش نے غصے سے کہا ..نہیں گوتم باولا نہیں ہوا ..اس پر ایک استری کی دھن سوار ہے ..ایسی شرمناک بات آج تک اس آشرم میں کبھی ہوئی تھی ..؟ کال کار بنتا ہے اور خیال کی بجائے روپ کے پیچھے بھاگ رہا ہے

شہر کی چتر شالاوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں ..گوتم نیلمبر کیا اب ناگرک [فیشن ایبل پورٹریٹ پینٹنگ]مصوری کرے گا ..سنا ہے کہ اس نے ایودھیا کی کماری چمپک کی تصویر بنائی ہے ..ہاں میں نے بھی یہی سنا ہے ..چتر کاروں کی منڈلی کے پرکھ نے اظہار خیال کیا ..اب وہ پریتما کاریک نہیں رہا ..

گوتم تصویریں اور مجسمے بناتا رہا ..اس نے آشرم کی زرد دیوراوں پر مٹی اور برادہ اور چونا پھیر کر گہرے رنگوں کے خطوط بنائے ..اس نے سرخ مٹی کی مورتیاں ڈھالیں ..اب تک جو تختیاں سینکی جاتی تھیں ..ان پر زیادہ تر مابعد الطبیعات کی علامتوں کے نقوش ابھرے ہوئے ہوتے تھے ..ترشول اور زندگی کا درخت اور زمین

کے کنول اور دنیا کے پہیے اور کنول کے سنگھاسن اور آگ کے ستون ..گوتم نیلمبر کی تختیوں پر گاؤں کے مناظر تھے عورتیں ..بیل ..پتے ..گائیں ..پھولوں کے نمونے... کسان لڑکے ..ان نقوش میں قوت تھی ...اور زندگی کی سرخی اور تپش .. ماورائے حیات کی بجائے یہ اصل حیات تھی.... یہ زمین کی اپنی تخلیق تھی

پھر ایک دن اس نے سدرشن یکمشی کا مجسمہ مکمل کرلیا..سدرشن یکشی جو کہ کدم کی ڈالی جھکائے درخت کے تنے سے لگی کھڑی تھی

شہر کے فنکاروں نے اسے دیکھ کر سراہا..چتر شالاوں اور مندروں میں اسے نا پسند کیا گیا عوام جن میں فن کا ذوق عام تھا ..اسے دیکھ کر خاموش رہے ..نقادوں نے گہری نظروں سے اس کو جانچا..لیکن گوتم کی تعریف کسی نے نہیں کی ..سب کو اچنبھا تھا

فنکاروں اور ذہن پرستوں کے حلقوں میں اس کے متعلق زوردار بحثیں چھڑ گئیں گوتم خاموشی سے سب کی سنتا رہا خود کچھ نہ بولا ..وہ فلسفے کا راستہ چھوڑ چکا تھا اس لیے یہ نہ بتا سکا کہ خالص جمالیاتی تجربہ دراصل کیا شے ہے؟ کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ کس طرح دوسروں تک پہنچایا جا سکتا ہے؟ روہ اور اروپ .. بھاو اور ابھاو کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے والا کون تھا؟ وہ تو محض یہ چاہتا تھا کہ انسانوں کو ان کے اسرار کو پتھر میں مقید کر لے.... انسان جیسے وہ ہیں ..ویدانت کے پرستار کی حیثیت سے ..اس نے سوچا کہ خالص جمالیاتی تجربہ غیر متعلق آنند ہے ..بجلی کی طرح ہے اکھنڈ ہے اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا خود ظاہر ہوتا ہے یعنی سو پر آکاش ہے ..جس طرح کے فنکار کا تصور وشوا کرمن کے تصور میں شامل ہے اس طرح دیکھنے وا

لا آتم یا خودی میں شامل ہے ..جو ہمہ وقت دیکھتا ہے...اور جس کا سروپ ساری کا ئنات کا مظہر ہے ..وشوا روپ...رو پم رو پم پرتی روپ...جمالیاتی لگن کا مکمل نمونہ وہ ہے جو کہ دنیا کی تصویر کو محض خودی سمجھتا ہے...جو کہ خودی کی سطح پر بنائی گئی ہے ...یہ وہی خالص وجود ہے خالص ادراک اور خالص حیات ....دل کا نگار خانہ جہاں کہ ساری تصویریں موجود ہیں..سارے تخیل موجود ہیں.. جہاں پہنچ کر ساری شبیہیں ایک ہو جاتی ہیں جہاں مختلف رنگین شیشوں میں سے ایک ہی روشنی گزرتی ہے اور ہر شے جو کہ ڈھنگ سے بنائی گئی ہے اور سچائی سے بنائی گئی ہے..مکمل فن پارہ ہے ..اور فن کار اور دیکھنے والے دونوں کے لیے ہی یہ ایک ہی مارگ ہے ....اور سمجھنے والے وہ وان پر بدھا سے سمجھ سکتے ہیں

سدرن یکشی کی تخلیق کے ساتھ ہی سنگتراشی کا ایک نیا مدرسہ شروع ہوا ..سنگتراش کا فن خالص دنیاوی بنا....ان مجسموں میں شدید حقیقت پسندی تھی یہ کدم اور پاتلی کے درختوں کی پریاں ..اندرلوک کی دیو مالائیں دراصل ایودھیا اور شرواستی کی امیر زادیاں تھیں ..گاؤں کی کسان لڑکیاں تھیں ..جو کہ دراصل زندگی میں پنگھٹ پر پانی بھرنے جاتی تھیں ..ساون گاتی تھیں ....کھیتوں کی نرائی کرتی تھیں

سدرشن یکشی کمر پر سے بل کھائے ہوئے انداز میں کھڑی تھی ..اس کی باہیں گداز تھیں ..آنکھیں بہت بڑی بڑی ..اس کا جسم بہت مضبوط اور سڈول تھا..یہ خطوط اور حجم کے توازن ..شانت اور لوچ اور حرکت کے احساس کا مکمل امتزاج تھا..اس انداز میں جان تھی اور حرکت اور قوت اور آزادی...اور زندگی اور اطمینان

کی شدید کیفیت ... یہاں قید نہیں تھی ..بندھن نہیں تھا..کلا کار کو بلا آخر قید سے آزادی ملی تھی..اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کیا بنائے گا؟

اب سنگتراش راہب نہیں رہا تھا..اس نے خوبصورت ..تندرست ..مسکراتی ہوئی عورتوں اور مردوں کے پیکر تراشے ..عورتیں جو دل آویز کاہلی اور آسائش کے احساس کے ساتھ کھڑی تھیں یا بیٹھی تھیں ..ان کے چہروں پر افسردگی کہیں نہیں تھی ..چہرے جو کہ سوچ میں ڈوبے مسکرا رہے تھے ...یہ بہت حقیقی .. بہت اصل بہت واقعاتی دنیا تھی ...دنیا جو کہ آس پاس چاروں اور دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور کلا کار جس کی شکتی اسے سرسوتی کا چہیتا بناتی تھی ..سکون سے زندہ رہنے کا خواہاں تھا

ایک روز گوتم اپنی چند نئی تصویریں لے کر کملیشور کے نگار خانے میں پہنچ گیا وہاں حسب معمول اس کے اسرے دوستوں اور مخالفوں کا مجمع موجود تھا اس گروہ میں اسے چند لپی کار (رپورٹر)اور رچی وید ک بھی نظر آئے ..اور اسے ذرا تعجب ہوا ..یہ سب ایک زمانے میں سیاست پر گفتگو کرنے کے لیے اس کی کٹیا میں جمع ہوا کرتے تھے سب لوگ چپ چاپ کسی گہری فکر اور سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے .. انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر خاموش رہے ..وہ چپ چاپ کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور نیچے بازار کی چہل پہل کو دیکھنے لگا

تم کو نہیں معلوم ..کملیشور نے بلا آخر بات شروع کی

کیا...؟ گوتم نے پوچھا

تم نے کچھ بھی نہیں سنا؟ آخر کس دنیا میں رہتے ہو؟

کیا ہوا؟ بتاؤ تو

باہر کسی نے کنڈی کھڑ کھڑائی...اوراکلیش داخل ہوا..اس کی اسنس پھولی ہوئی تھی اوراس کے پیر گرد آلود تھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کہیں دور سے بھاگتا ہو آ رہا ہے

بھائیو..اپنا اپنا سامان سمیٹو اور فورا یہاں سے بھاگ نکلو

کیوں کیا ہوا..گوتم نے سوال کیا..

مگدھ میں لڑائی چھڑ چکی ہے..بھائی گوتم..چندر گپت کی فوجیں سارے دیس پر قبضہ کرتی ہوئی اس طرف آ رہی ہیں..اب یہاں ہل چل جائیں گے..میدانوں میں سہرام نیہ جنگ کے دیوتاؤں نے اپنا رقص کرنا شروع کر دیا ہے...اب تمہار وقت ختم ہوا..موت جنگ کا نقارہ بجاتی تمہارے تعاقب میں آ رہی ہے..موت جو کہ روپ اورا روپ..بھاو اورا بھاو کے جھگڑوں کو مٹا دیتی ہے..اکلیش تھک کر چارپائی پر بیٹھ گیا اوراس نے آنکھیں بند کر لیں..تھوڑی دیر بعد اس نے کہا..راجن کھیدا سے واپس آ رہے تھے..جب وشنو گپتا کے سپاہیوں نے ان پر حملہ کر دیا.. سب کے سب مارے گئے

سب کے سب..گوتم نے لڑکھڑاتے ہوئے پوچھا..

ہاں....سنا ہے کہ شہزادیاں ندی تیر کر پنچالوں کے علاقے کی اور نکل گئیں مگر سپاہی نا کے تعاقب میں ہیں..

کاے چمپک بھی ماری گئی ہو گی؟

وہ کون ہے؟اکلیش نے آنکھ کھول کر بڑی بے رحم آواز میں کہا..جنگ میں انسان نہیں رہتے صرف نام رہ جاتے ہیں..پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا

تم کہاں جاتے ہو بھائی اکلیش ؟

میں لڑنے جاتا ہوں۔ مگر شاید تم نہیں لڑو گے۔۔کیونکہ تم اہنسا کے قائل ہو چکے ہو۔۔اس نے اپنی چپلوں سے گرد جھاڑی اور اسی سکون سے باہر نکل گیا

جنگ۔۔۔امن۔۔۔خونریزی۔۔۔اہنسا

وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔اس نے کملیشور کو مخاطب کیا: ''مجھے کوئی بتاؤ، تم سب کلا کار اور عالم جو یہاں موجود ہو، بتاؤ کس وقت لڑا جائے۔کس وقت نہیں۔کوئی ہری شنکر سے یہ پوچھنے جاؤ، جیو ہتیا کس سے جائز ہے کب نا جائز؟'' وہ کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔''بھائیو مجھے نند راجہ سے کوئی دلچسپی نہیں، میں وشنو گپتا کو نہیں جانتا۔چندر گپت سے میرا کوئی جھگڑا نہیں۔یہ سب مل کر مجھے اپنی لڑائی میں کیوں گھسیٹتے ہیں، لیکن مجھے بھی دوسروں کو مارنا پڑے گا۔مجھے تو ان سب کی جانیں پیاری ہیں۔میں خود بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں، میں اب کیا کروں گا۔'' کھڑکی کے پٹ سے سر لگا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس اثنا میں لوگ، جو نگار خانے میں موجود تھے اپنے اپنے جوتے پہن کر باہر نکلنے لگے۔ان کے جانے کی آہٹ پر گوتم نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ کمرہ سنسان پڑا ہے، وہ ان کے پیچھے پیچھے برآمدے تک بھاگا اور زور سور سے چلانے لگا: ''ارے اپنی اپنی مورتیاں چھوڑ کر کہاں جاتے ہو، یہ ٹوٹ جائیں گی۔بھائیو۔بھائیو۔''

لیکن دفعتاً نیچے بازار میں شور قیامت بلند ہوا۔شہر پر جنگی رتھوں اور ہاتھیوں کی یلغار شروع ہو چکی تھی۔پل کی پل میں سارا بازار رن میں تبدیل ہو گیا۔ڈھول اور

ہاتھیوں کی چنگھاڑ اور تیروں کی سنسناہٹ اور تلواروں اور ڈھالوں کی جھنکار اور عورتوں اور بچوں کے رونے اور چیخنے کی صداؤں کے خوفناک بھنور میں اس کی اپنی آواز ڈوب کر رہ گئی، وہ سکتے کے عالم میں برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا سامنے کا منظر دیکھتا رہا۔ بازار کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ اس کے چتر کار ساتھیوں کی لاشیں سڑک پر ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ چانکیہ کے سپاہی بڑی صفائی سے لوگوں کی گردنیں اتارنے میں مشغول تھے۔ گوتم کی نظروں میں اندھیرا چھا گیا، آخر وہ لڑکھڑاتے قدموں سے نگار خانے کی سیڑھیوں سے اترا۔ اس نے مرے ہوئے کملیشور کے ہاتھ میں سے تلوار نکالی اور خواب کے عالم میں چلتا تلوار گھماتا، کیونکہ خود فنون جنگ میں طاق تھا، سڑک پر اتر گیا۔

گوتم رات گئے تک لڑتا رہا اور آخر کار زخموں سے نڈھال ہو کر ایک گلی میں گر پڑا جہاں چاروں طرف اہل شہر کی لاشوں کے انبار لگے تھے۔

افق کے نزدیک شہر سے کچھ فاصلے پر جیت ون کی عمارت چپ چاپ درختوں میں چھپی کھڑی تھی۔ اس کا کلس اندھیرے میں مدھم مدھم یوں جھلملا رہا تھا جیسے اس سارے نقشے پر خاموشی سے ہنستا ہو۔

۱۴

وقت گزرتا جا رہا ہے۔ دیس پر اب مور کے نشان والے شہنشاہ کا راج ہے، وہ جو دیس کی چتر انت ریاست کا پہلا سمراٹ ہے۔ اتہاس پران میں ایک نئے باب

کا اضافہ ہوا ہے۔ بادشاہوں کے نسب نامے لکھنے والوں کے قلم یہاں پہنچ کر رک گئے ہیں۔ یہ پر یہ درشن نری چندر، انسانوں کا چاند، جو پاٹلی پتر کے سنہاسن پر طلوع ہوا ہے۔

یہ شودر ماں کا بیٹا، جسے گڈریوں نے پالا، جسے چانکیہ نے ٹکشلا میں پروان چڑھایا اب نئی تواریخ لکھوائے گا۔ روایت کے زمانے ختم اور نندوں کے ننانوے کروڑ اشرفیوں کے خزانوں کے قصے خواب و خیال ہوئے۔

یہ عہد جدید ہے۔

چندر گپت بڑا زبردست بادشاہ ہے، اس کی سلطنت کا ڈنکا سارے عالم میں بج رہا ہے، اس کا پایہ تخت دنیا کے عظیم ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی فوجی طاقت سے دوسرے ممالک خوفزدہ ہیں۔ اس کے ہزار ستونوں والے چوبی محل میں دور دور کی سلطنتوں کے سفیر موجود ہیں۔ اس کے دربار میں ملیچھ دوسری زبان بولنے والے غیر ملکی لوگوں کا ہجوم ہے۔ دور پچھم کے دیسوں کی سفید فام لڑکیاں محل میں نرتکیوں اور داسیوں کی حیثیت سے ملازم ہیں۔ سارا شہر دلہن کی طرح آراستہ ہے۔ وسیع تماشا گاہ میں نیزہ بازی اور رتھوں کے مقابلے ہو رہے ہیں۔ سڑک پر سے سمراٹ کی سواری گزرتی ہے۔ جلوس میں موسیقار شنکھ بجاتے بجاتے ساتھ ساتھ جا رہے ہیں۔ چوراہوں پر رقص ہو رہا ہے۔ جھروکوں میں سے پھولوں کی بارش ہوتی ہے۔ عوام جے شبد بولتے ہیں۔ اب گرام بھوجک ان سے زبردستی لگان وصول نہیں کرتا، اب وہ چوری اور بدامنی کی آفتوں سے محفوظ ہیں۔ ان کی خوشحالی میں اضافہ ہوا ہے۔

کیونکہ وشنو گپتا، جس کا دوسرا نام چانکیہ ہے، جس کا دوسرا نام کوٹلیا ہے، جس نے مہاپدم نند کو اپنی سیاست سے شکست دی، وہی وشنو گپتا مشیر سلطنت ہے۔ (اور شاکیہ منی نے کہا تھا کہ فتح نفرت پیدا کرتی ہے کیونکہ مفتوح دکھ کی نیند سوتے ہیں لیکن فتح و شکست سے بلند شانت آدمی سکھ میں رہتا ہے۔)

لیکن ہر فتح یا شکست تاریخ کے راستے پر ایک موڑ ہے جس کی وجہ سے دنیا کسی نہ کسی طرح آگے بڑھتی ہے۔ اس فتح کے بعد سے عوام پہلی بار قومیت کے تصور سے دوچار ہوئے ہیں۔ ان کو ایک مبہم سا احساس ہوا ہے کہ وہ ایک قوم ہیں جو بہت سارے قبیلوں اور ذاتوں اور خاندانوں سے بلندتر ایک اور شے ہے، وہ ایک ایسی قوم ہیں جنہوں نے چندرگپت پریہ درشن کی قیادت میں ایرانیوں اور یونانیوں کو اپنے دیس سے نکال باہر کیا ہے۔

وشنو گپتا، تکشلا کا برہمن، اپنے سیاسی تصورات کو اب عملی جامہ پہنا رہا ہے، وہ جانتا ہے کہ نیکی کا سیاست میں بدلہ نہیں ملتا۔ سیاست میں جرائم کی بھی سزا نہیں دی جاتی۔ جزاءوسزا کے مسئلے کو اس نے دھرم شاستر والوں کے لیے چھوڑ دیا ہے، وہ کہتا ہے سیاست میں صرف غلطی سے احتراز کرنا چاہئے۔ ریاست کی بہتری شخصی فائدے سے برتر ہے۔

معدنیات، بازار، منڈیاں، نہریں، آبپاشی، شفاخانے، مالیات، تجارتی گودام، باغات، محصول، دیوانی، فوجداری، طلاق، شادی، وراثت کے قوانین، تعلقات عامہ، امور خارجہ، دفاع، چراگاہوں اور قصاب خانوں کے اس نے الگ الگ محکمے قائم کیے ہیں۔ سارے میں جاسوسی کا جال پھیلا دیا گیا ہے۔ جو برہمن

اپنے علم کے ذریعے روزی نہیں کما سکتے اور نا کام سوداگر، حجام، نجومی، نوکر چاکر، طوائفیں اور کسان، ہر شخص اپنی قابلیت کی بدولت جاسوسی کے محکمے میں شامل ہو سکتا ہے۔ سادھوؤں کے بھیس میں ادھر ادھر گھوم کر جاسوس چندر گپت کے تخت و تاج کی حفاظت میں جٹے ہیں۔ بغاوت کا پتا چلاتے ہیں۔ ویشیاؤں کے گھروں اور قمار خانوں میں جا کر عوام کے خیالات سے باخبر رہتے ہیں۔ جرائم کی بیخ کنی کے لیے بھیدی کا کام کر رہے ہیں۔ سارے میں امن قائم ہے۔ منو نے کہا تھا جہاں سیاہ فام سرخ آنکھوں والی ڈنڈ مجرموں کو ختم کرتی زمین پر گھومتی ہو وہاں کی پرجا تنگ نہیں ہوتی۔

یہاں بادشاہ ڈنڈ دھر ہے اور پرجا خوش ہے۔

پاٹلی پتر پر اتنی رونق اس سے پہلے کبھی نہیں آئی۔ نئی نئی عمارتیں بن گئی ہیں۔ آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زبان میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ مگدھ نام نرتی (پراکرت مگدھ کی عوامی بولی) میں بدلتی جا رہی ہے۔ ناٹک اور موسیقی کے فنون اپنے عروج پر ہیں۔ گلی کوچوں سے گیتوں کی تانیں بلند ہوتی ہیں۔ کاریگر نئے نئے زیور گھڑ رہے ہیں۔ دور دور کے ملکوں کا سامان بازاروں میں فروخت ہو رہا ہے۔ بیراگی اور سپیرے گلیوں میں دوتارہ اور بین بجاتے پھر رہے ہیں۔ بہروپیے منڈپوں کے نیچے سوانگ بھر رہے ہیں۔

ایک ناٹک منڈلی، جو کاشی سے آئی ہے، نئے نئے تماشے دکھا رہی ہے۔ ان ناٹکوں کا لیکھک پہلی بار پاٹلی پتر آیا ہے لیکن اس کی شہرت اس سے پہلے یہاں پہنچ چکی ہے۔ اس کے بارے میں طرح طرح کے افسانے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے وہ

بہت بڑا گنی اور کلاونت ہے، ایک زمانے میں چتر کار تھا اور مورتیاں بناتا تھا۔ نٹ (رقاص) ہے۔ بہت معرکے کا ناچتا ہے۔ نائک (ایکٹر) ہے۔ غضب کی اداکاری کرتا ہے۔ بھرت منی کا سارا فن اس نے گھول کر پی رکھا ہے۔ برسوں برس اس نے ایودھیا کے گنی جنوں اور گندھریوں کی سنگت میں گزارے ہیں۔ سارے سر اس کے قابو میں ہیں، بڑے بڑے گائیک اس کا لوہا مانتے ہیں۔ پر تب بھی اسے چین نہیں پڑتا۔ سارے دیس میں گھوما گھوما پھرتا ہے۔ کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتا۔ کسی ایک فن کو اپنی پوری توجہ کا مرکز نہیں بناتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے بادل کی چھایا کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہو اور وہ اس کے ہاتھ نہیں آتی۔

اس ناٹک کی بہت دھوم مچی ہے، سارا پاٹلی پتر ناٹک گھر کی اور امنڈا چلا آ رہا ہے۔ خواتین کے رتھوں اور پالکیوں کا تانتا بندھا ہے۔ راج محل کی شہزادیاں، امیروں، وزیروں اور تاجروں کی بیٹیاں، انتظامی ملازمتوں کے افسروں کی بیبیاں، سبھی رنگ برنگی ساریاں، زرنگار پٹکے اور سنہری کردھنیاں پہنے آ آ کر ناٹک گھر کے ایوان میں بیٹھ رہی ہیں۔ بن بیاہی نوجوان لڑکیاں اس اداکار اور لیکھک کو دیکھنے کی بہت مشتاق نظر آتی ہیں۔ انہوں نے سن رکھا ہے کہ وہ بہت خوبصورت آدمی ہے اور خواتین کی ایک بری عادت یہ ہے کہ وہ کلا کی اچھائی یا برائی کے مسئلے کو کلاکار کی شکل وصورت سے گڑبڑا دیتی ہیں۔

سفید پردہ ایک طرف کو سرکایا گیا۔ منقش چوبی رنگ بھومی کا عقبی پردہ **کلسوں**، پٹکوں اور تصویروں سے سجا تھا۔ سازندوں کی روشن چوکی سامنے بیٹھی تھی۔ سنگیت کار لڑکیوں نے پہلو کے ستونوں سے برآمد ہو کر مہادیو کی استوتی کی اور ان میں

سے ایک لڑکی ٹولی سے باہر آ کر کمر پر ہاتھ رکھے ایک طرف کو کھڑی ہوگئی۔ یہ لڑکی تمثیل کی نائیکہ تھی۔ اس کی لمبی چوٹی میں موتیا کا گجرا گندھا تھا اور اس کی طلائی کردھنی میں یاقوت جڑے ہوئے تھے۔

پھر پردیپ کی روشنی میں رنگ بھوم کے سفید روغنی تختوں پر وہ نمودار ہوا جس کا اتنی دیر سے سب کو انتظار تھا۔ اس نے کیسری رنگ کے ریشمین کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے کانوں میں کرن بھوشن جگمگا رہے تھے، وہ بڑی شان سے سر اٹھائے سامنے خلاء میں دیکھتا باوقار انداز سے قدم رکھتا سامنے آیا اور چند لمحے تک سب کی طرف نظر ڈال کر اس نے قاعدے کے مطابق نٹی سے اس ناٹک کے موضوع کے متعلق مکالمہ شروع کیا۔ مجمع اس کی خوبصورت آواز سے مسحور ہمہ تن گوش رہا۔ سب ٹکٹکی باندھے اپنی اپنی جگہ پر ساکت و صامت گردنیں آگے بڑھائے اسے دیکھنے میں مصروف تھے۔

مکالمے کے دوران میں کسی بات پر زور ڈالنے کے لیے اس نے پہلے اپنا دایاں اور پھر بایاں ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔

تماشائی چونک اٹھے ان کے چہروں پر دکھ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ خواتین نے تاسف کی شدت سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس خوبصورت اور انوکھے کلاکار کے دونوں ہاتھوں کی کئی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔

گوتم نیلمبر کے سامنے ایک اور شہر تھا۔ تماشائیوں کا ایک اور ہجوم جو حسب معمول عقیدت اور محبت سے اسے دیکھ رہے تھے، وہ سب کو تماشے دکھاتا تھا لیکن اس کا تماشا کسی نے نہ دیکھا تھا۔ جس طرح رنگ بھومی کے پردے کے پیچھے ایک

اور رنگ بھومی ہوتی ہے جو دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتی۔

پاٹلی پتر کے یہ مہذب باوقار شہری، جو ایوان میں بیٹھے اس کے مکالمے پر عش عش کر رہے تھے، ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہ تھا وہ کیسی کیسی دنیاؤں کی سیاحت پر نکلا ہے۔ اس نے زندگی کے سارے تجربے کر دیکھے ہیں اور اب کچھ باقی نہیں۔ جن چیزوں سے اس نے بچنا چاہا، جن باتوں کو اس نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی محض یہ سوچنا چاہا کہ زندگی محض خلاء ہے یا محض روشنی یا محض تاریکی مگر یہاں محض کا وجود نہ تھا، وہ ماسوا کو اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکتا۔ دنیا قدم قدم پر اپنے ہر روپ میں اس کے سامنے موجود اس کا منہ چڑا رہی ہے، وہ جنگ کے خلاف تھا اور اس نے اپنی تلوار سے شراوستی کے معرکے میں مخالف فوج کے پانچ سپاہیوں کو قتل کیا۔ پانچ انسان۔۔۔ جو اس کی اپنی دنیا کے باسی تھے۔ اسی کی طرح بولتے تھے، گیت گاتے، اسی کا ایسا دل و دماغ رکھتے تھے، وہ برہمچاری تھا لیکن برہمچاریہ کے سخت قوانین کو توڑ کر اس نے ایک لڑکی کو دیوانہ وار چاہا۔ اس کی سوچ کو منجمد کرنے کے لیے، اس کے پیکر تراشنے کی خاطر اس نے کلا کی دنیا میں پناہ ڈھونڈی۔ یہ بالآخر اس کی اپنی دنیا تھی۔ خالی الفاظ اور سوکھے فلسفے کے مسائل سے بلند تر۔ یہاں رنگوں اور پتھروں کی سنگت میں وہ زندہ رہا، لیکن جنگ میں لڑتے سمے ''دشمن'' کی تلوار سے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں قلم ہو گئیں۔

شراوستی کے بازار میں حملہ آوروں سے وہ دن بھر لڑا تھا۔ رات گئے تک لڑتا رہا تھا اور پھر نیزے کے ایک وار کی تاب نہ لا کر گر پڑا تھا۔ جب اسے ہوش آیا اور اس نے سر اٹھا کر دیکھا کہ رات کی سیاہی آسمان پر سے مدھم ہوتی جا رہی ہے، وہ

زخموں سے چور ہے اور اس کے ہاتھ لہولہان ہیں۔ اس نے لیٹے لیٹے بڑی مشکل سے اپنی ہتھیلیوں کو پھیلایا جو خون میں لت پت تھیں۔

تب اسے ایک اٹل حقیقت کا اندازہ ہوا۔ ہاتھ، انگلیاں، جو حسن کی تخلیق کے لیے بنائی گئی ہیں، خون میں نہلا دی جاتی ہیں۔ کسی خاموش و بیہار میں بیٹھ کر وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ کلا کار کی حیثیت سے انسان کا ہاتھ اس کے لیے بہت بڑی علامت تھی۔ انگلیاں، جو رقص کی مدراؤں کے ذریعے کائنات کے سارے اسرار، ساری زندگی کے معنی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ جو مکان بناتی ہیں۔ باغوں کو سینچتی ہیں۔ بانسری بجاتی ہیں۔ تھپک تھپک کر بچے کو سلاتی ہیں۔ آرتی کے لیے نارنجی پھول چنتی ہیں اور دوسری حقیقت یہ تھی کہ انگلیاں تیر گری کرتی ہیں۔ نیزے ڈھالتی ہیں۔ دوسرے انسانوں کا اپنی گرفت سے گلا گھونٹتی ہیں۔

تب اس نے اپنی کٹی ہوئی انگلیوں کو دیکھا اور سوچا کہ یہ اس کے کرم کا پھل ہو گا۔ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ کرم کے فلسفے سے اسے بڑا سکون حاصل ہوا۔ اگر یہ فلسفہ میرے پاس نہ ہوتا تو میں سوچ سوچ کر دیوانہ ہو جاتا۔

ذرا سی سکت آنے کے بعد وہ اٹھا اور لاشوں کو پھلانگتا، گلیوں کی دیواروں کا سہارا لیتا اپنے مکان کی سمت گیا۔ جہاں اس کی ماں تھی جو اس کے زخم دھوئے گی، اس کو اپنی گود میں سلائے گی۔

لیکن اس کا مکان سنسان پڑا تھا۔ یہاں وہ بیس سال بعد اس وقت پہنچا تھا جب اس کے ماں اور باپ چند گھنٹے قبل لڑائی میں مارے جا چکے تھے۔

لڑکھڑاتا ہوا وہ شہر سے باہر آشرم کی سمت روانہ ہوا جہاں ہو کا عالم تھا۔

جھونپڑے خاموش پڑے تھے۔ گرو کی کٹیا خالی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ مہوے کے باغ میں داخل ہوا اور تالاب کی سیڑھیوں پر لیٹ گیا، اس کے زخموں کے خون نے تالاب کے شفاف پانی کو ارغوانی کر دیا۔

ایک نوجوان گوالن نے، جو ادھر سے گزر رہی تھی، اسے سسکتا ہوا دیکھا، وہ گھبرا کر دوڑی ہوئی اس کے قریب آئی۔ اس نے پانی سے اس کے گھاؤ صاف کیے، اسے گائے کا تازہ دودھ لا کر پلایا۔

اور بجائے اس کے کہ وہ اس کا شکریہ ادا کرتا اسے بڑے زور سے ہنسی آ گئی۔

گوالن اسے اچنبھے سے دیکھنے لگی۔ کیسا انوکھا سپاہی ہے۔ میدان جنگ سے لڑتا مرتا ہوا آ رہا ہے اور ہنستا ہے۔

اس کو اتنی ہنسی آئی کہ اس کا جی چاہا کہ زور زور سے قہقہے لگائے۔ اس وجہ سے اس نے ازراہ مذاق بھی گوالن سے یہ نہ پوچھا کہ تمہارا نام سجاتا ہے یا نند بالا۔

کیونکہ اسے اس سے ہری شنکر کے الفاظ یاد آ چکے تھے۔ ''بھائی گوتم! ہر زمانے میں ہر موڑ پر تمہیں کوئی نند بالا ملے گی کوئی سجاتا اور وہ نزدیک آ کر تمہاری خدمت تمہاری پرستش کرنا چاہے گی۔ اب بھی وقت ہے آنکھیں کھول لو۔'' یہ دوسرا تجربہ تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ عورت کی خدمت، اس کی پرستش کو ٹھکرانا خدا کا سب سے بڑا ناشکرا پن ہے۔ اس نے آنکھیں نیم وا کر کے بڑے سکون اور بڑے اطمینان کے ساتھ گوالن کے کنگنوں کو چھوا، پھر اس کے پلو پر سر رکھ کر سو گیا۔

گوالن اسے اٹھا کر اپنے گھر لے گئی جہاں وہ کئی دن ۔۔ جب تک اس کے زخم اچھے نہیں ہوئے۔ اس کا مہمان رہا۔ یہ اس کا ہمسایہ گاؤں تھا لیکن اب اجاڑ پڑا

تھا۔گاؤں کے بہت سے باسی مہاراج چندر گپت کی فوج کے خوف سے بھاگ کر ادھر ادھر چلے گئے تھے۔گوالن نے اسے روکنا چاہا لیکن ایک روز وہ چپکے سے اس گاؤں سے نکل گیا۔نند بالا، کہ یہی اس گوالن لڑکی کا نام تھا، بہت روئی لیکن وہ ندی پار کر کے بہت دور پہنچ چکا تھا۔

رفتہ رفتہ ملک میں امن قائم ہوا۔چندر گپت کی سلطنت مستحکم ہوگئی۔گوتم گھومتا پھرتا کاشی جا نکلا، وہ عالم برہمن تھا۔سوائے اپنے علم وفن کے اس کے پاس کوئی اور تجارت نہ تھی، لیکن اسے فکر نہیں تھی۔ودیارتھی برہمچاری کی حیثیت سے اسے ہمیشہ سے بھوکا رہنے اور سختی اٹھانے کی عادت تھی۔اسے یہ ونجاروں کی ایسی زندگی بری نہیں لگی، مگر اب وہ عالموں کی صحبت سے اور ان سے بحث کرنے سے بچتا تھا۔

کاشی میں ایک ناٹک گھر کی نائیکا سے اس کی ملاقات ہوئی جو دیکھتے ہی اس پر ریجھ گئی۔اس نے گوتم کو اپنی منڈلی میں شامل کرلیا۔

اپنی کٹی ہوئی انگلیوں سے اب وہ تصویریں نہیں بنا سکتا تھا۔مورتیاں نہیں ڈھال سکتا تھا۔ناچ نہیں سکتا تھا،صرف اداکاری کے ذریعے اپنا اظہار کرنے کا راستہ اس کے سامنے تھا۔طالب عالمی کے زمانے میں اس نے ناٹک لکھے تھے۔ فن اداکاری کا مطالعہ اس کی تعلیم کا ایک جزو رہ چکا تھا، وہ فلسفی، عالم، چترکار اب نائیک بن گیا۔

نٹ شاستر میں لکھا تھا کہ اداکار کے لیے ضروری ہے کہ اس کی آنکھیں طویل ہوں۔ہونٹ سرخ، دانت چمکیلے۔اس میں وقار، تمکنت اور غرور ہونا چاہئے۔ اسے فن عروض، فن خطابت اور فنون لطیفہ پر دسترس حاصل ہونی چاہئے۔گوتم میں

یہ سارے وصف موجود تھے۔ یہ علم بحرِ ذخار تھا۔ اس کا رتبہ بلند تھا۔ اسے بھی رقص اور موسیقی کی مانند الوہی حیثیت حاصل تھی۔ کہا جاتا تھا کہ برہما نے اندر کی خواہش پر پانچوں وید کی حیثیت سے ناٹک قائم کیا۔ شیو اس فن میں دیوتاؤں کے استاد بنے۔ پاروتی نے اپسراؤں کو اپنی شاگردی میں لیا۔ وشوا کرمن نے رنگ بھوم تیار کی۔ پر ایک مرتبہ گندھروا اور اپسراؤں نے ایک تمثیل میں ایک رشی کا مذاق اڑایا جس کی بددعا کی وجہ سے ان اداکاروں کو دیولوک چھوڑ کر دنیا میں آنا پڑا، یہاں بھی ان کے درجے میں کمی نہیں آئی۔ اداکار کشی لو کہلاتے تھے کیونکہ رام کے دونوں بیٹے خانہ بدوش مغنیوں کے بھیس میں اپنے باپ کے دربار میں پہنچے تھے۔

سارا عالم بہروپ سے خوش ہوتا ہے۔ گوتم ان روایتوں کے متعلق سوچ کر خیال کرتا۔ بہروپ ایک اور حقیقت ہے۔

ناٹک کا فن بہت ترقی یافتہ اور ہمہ گیر تھا۔ بھرت منی نے اس کے قوانین کی تشکیل کی تھی۔ انہوں نے اڑتالیس قسم کے نائیک اور پونے چار سو اقسام کی نائیکاؤں کی فہرست بنائی تھی۔ انہوں نے ہدایت کاری اور رنگ بھوم کی آرائش اور اداکاروں کے اوصاف کے متعلق تفصیل سے لکھا تھا۔ سکون اور رع توازن تمثیل کے لیے لازمی تھا، شدید المیے اور قتل و دہشت کے مناظر سے گریز کیا جاتا تھا تاکہ تماشائیوں کے ذہنی سکون میں خلل نہ پڑے۔

فراق تمثیل کا خاص موضوع تھا۔ گوتم نیلمبر نے بھی اس روایت کو قائم رکھا، فراق کے علاوہ اور کون سے موضوع وہ اپنے لیے منتخب کرسکتا تھا؟

ناٹیہ، نرتیہ اور نرت کے سام گیت میں اس نے خود کو سمو دیا۔ ایک روز ناٹک

گھر کی اس نائیکا نے اس سے کہا: ''میں نے سنا ہے تم بہت اچھا ناچتے ہو، مجھے بھی سکھلا دو۔''

''تم کو سکھلا دوں۔۔؟ تم کو ابھی اور سیکھنے کی ضرورت ہے؟'' گوتم نے چڑ کر کہا، ''مجھے تو کچھ نہیں آتا جاتا۔'' اس روز اس پر شدید بدمزاجی اور چڑچڑاہٹ کا دورہ پڑا ہوا تھا، وہ سہم گئی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا: ''پتہ نہیں۔ لوگ کہتے ہیں انہوں نے تم کو خود ناچتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''کون لوگ۔'' وہ پھر گرجا۔

''جانے کون۔ ایودھیا کے کچھ نٹ بتا رہے تھے ایک دفعہ انہوں نے جنگ سے پہلے کسی تہوار میں تمہیں ناچتے دیکھا تھا۔''

ایودھیا کے۔ گوتم کا دل ڈوب سا گیا، وہ یکلخت نرم پڑ گیا۔ اسے اس لڑکی پر ترس آیا، وہ اس پر کتنی بری طرح فریفتہ تھی۔ بے چاری۔ ''وہ کون لوگ تھے۔'' اس نے پھر کہا۔ ''کیا معلوم۔ ناٹک گھر میں دسیوں طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔'' لڑکی نے ذرا بے پروائی سے جواب دیا۔ ''اچھا اب میں گھنگرو باندھتی ہوں۔''

وہ اوما تانڈو کرتی رہی، وہ اسے دیکھا کیا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

گھنگروؤں کی آواز اس کے کان میں پہنچا کی، وہ ایک اور حقیقت سے دوچار ہوا۔ سارے نظام کائنات میں لے ہے۔ آفاق میں لے ہے اور چدمبرم، انسان کا دل، جو کائنات کا مرکز ہے، شو اس میں ناچتا ہے۔ شو کسی تخیلی خدا کا نام نہیں جو پہاڑوں پر رہتا ہو۔ وہ میرے اپنے دل میں موجود ہے، وہ جو تخلیق ہے اور تخریب

بھی ۔ جو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے ۔ جو وجود اور عدم وجود، موت وزیست کا مکمل قانون ہے۔

اور ہر شے میں تال لے اور سر پنہاں ہے۔ تخلیق اور ارتقا اور بقاء اور تخریب میں رقص ہے۔ روح کی تشکیل اور اس کی آزادی میں رقص ہے۔ برہما جس نے تخلیق کی ہے۔ وشنو جو بقا ہے رور جو خاتمہ ہے۔ مہیشور جس نے روحیں تشکیل کی ہیں۔ سدیشور جو انہیں ان کے چکر سے نجات دلاتا ہے۔ یہ سب اس کے مختلف پہلو ہیں جو ذات مطلق ہے، جو ازلی اور ابدی رقاص ہے۔

اس ناچ کے رس اور بھاؤ انسان کی ساری ذہنی، دلی اور روحانی کیفیتوں کے عکاس ہیں اور آفاقی تصورات سے انہیں نسبت دی گئی ہے۔ شرنگار رس وشنو کا ہے، اس میں ان کے اوتار نٹور گردھاری درندا بن میں اپنی گوپ لیلا رچاتے ہیں۔ ویر رس کڑکتے گرجتے بادلوں کے سنہرے خدا اندر سے منسوب ہے۔ کرونا ترحم کا جذبہ ہے۔ یم سے اس کا رشتہ جوڑا گیا ہے۔ رور غیض کی کیفیت ہے۔ ہاسیا سفید رنگ میں ملبوس مزاح ہے۔ بھیانک رس کا رنگ سیاہ ہے۔ کال سے منسوب بھاسیہ شیو کے مہا کال روپ کی نیلی علامت ہے۔ او بھت رس میں حیرت ہے۔

ان کیفیتوں کے اظہار کے لیے مکمل قوانین ہیں۔ ان کے لیے کس طرح کی اداکاری کی جائے، کیسے رنگ ہوں، کیسے پس منظر، کون کون راگ۔

میگھ، سری، ہنڈول، توڑی، چھایا، للت، شرنگار رس کے، محبت کے راگ ہیں۔

گوری، سوم اور دیو کرتی ویر رس کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ رام کلی اور آ ساوری کرونا کے راگ ہیں۔ شنکرا ہا سیہ کا نغمہ ہے۔

ادا کار رقاص اپنے سر، اپنی آنکھوں، اپنی بھوؤں، اپنے بازوؤں، اپنے ہاتھوں، اپنی انگلیوں، اپنے پیروں، اپنے پورے جسم، سارے وجود کے ذریعے کائنات و زندگی کی کہانی سناتا ہے۔ آنکھوں اور انگلیوں اور بازوؤں میں آہنگ قائم کر کے ناچتا ہے۔ آنکھوں کے تین طرح کے اشاروں کی پینتالیس قسمیں ہیں۔ گردن کے نو مختلف اشارے ہیں۔ ہاتھوں کی مدراؤں کی چار قسمیں اور ہر قسم کی چوبیس علیحدہ علیحدہ شاخیں۔ ان گنت طرح کے لوچ اور جھکاؤ ہیں۔ جسم کی حرکات ایک سو آٹھ انداز کی ہے۔ جس طرح گائیتری منتر ایک سو آٹھ دفعہ پڑھا جاتا ہے یا جیسے آرتی کے پردیپ میں ایک سو آٹھ چراغ روشن ہوتے ہیں اسی طرح نٹ راج کے ایک سو آٹھ مختلف ناچ ہیں۔

کاشی کی خوبصورت پاتر اس کے سامنے ناچا کی۔ اس نے پیروں کی مختلف چالوں کا مظاہرہ کیا: یہ مور کی چال ہے، یہ ہرن کی، یہ ہاتھی کی، گھوڑے، شیر اور مینڈک کی۔ کودنے کے پانچ، قدم رکھنے کے دس، چکر کاٹنے کے آٹھ انداز ہیں۔ ہاتھوں کی دو سو سینتالیس مدراؤں نے ساری کائنات کو سمیٹ لیا ہے۔ ساری کیفیات، احساسات، خیالات۔ درخت، پھل، پھول، پرند، عہد عتیق کے شہنشاہ۔ انسانی رشتے دیوی دیوتا۔ وشنو کے اوتار، چتر ورن، تاریخی ہستیاں، ساتوں سمندر، مشہور ندیاں، ساتوں طبقات ارضی، ساتوں طبقات سماوی۔ ان سب کا مدراؤں کی زبان سے بیان کیا جاتا ہے۔ المیہ اور طربیہ اداکاری کے

سارے اتار چڑھاؤ پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ تال، لے اور گیت کا مکمل آہنگ ہے۔

یہ بھرت ناٹیم ہے۔

شیو کا ناچ، بھرت منی نے جس کے قوانین دنیا کے سامنے پیش کیے۔

کاشی کی رقاصہ بھرت ناٹیم ناچ رہی ہے جس طرح ایک مرتبہ چمپک ناچی تھی، جس طرح جب تک تال اور لے اور سر قائم ہے بھرت ناٹیم ناچا جائے گا۔

مگر میں نٹ راج کا ایک حقیر بندہ کبھی نہیں ناچ سکوں گا کیونکہ میں اپاہج ہوں۔

اس نے لڑکی کو غصے سے دیکھا جو ناچے جا رہی تھی، وہ خوش شکل نہیں تھا، وہ گوری بھی نہیں تھی۔ تخیل کا جادو ٹوٹ چکا تھا۔ تب اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ خواب زیادہ دیر تک قائم رہنے والی چیز نہیں۔

لڑکی ناچتے ناچتے اکتا کر اس کے قریب آ بیٹھی اور اداسی سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ میں اس آدمی کو کبھی نہیں سمجھ پاؤں گی، مگر کیا آدمی کو سمجھنا ضروری بھی ہے۔۔۔۔؟ کیا یہ کافی نہیں کہ وہ میرے پاس بیٹھا ہے اور کم از کم گزرتے ہوئے وقت کے اس حصے میں میرا ہے۔۔۔؟

تمثیل گھر کی اس حسین لڑکی کا نام امبیکا تھا، یہ بڑی مشہور اداکار تھی۔ بڑے بڑے امیر زادے اور بانکے اس کے نام کی مالا جپتے تھے مگر وہ ریجھی بھی تو کس پر۔۔۔ایک مفلس برہمن طالب علم جس کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔

تب گوتم ایک اور حقیقت سے آگاہ ہوا، تم جس کو چاہتے ہو تمہاری پروا نہیں

کرتا اور جو تم پر جان دیتا ہے اس میں تمہارے لیے کوئی کشش نہیں۔ یہ بھی زندگی کا ایک ایسا تجربہ تھا جو اس سے پہلے ہزاروں کر چکے تھے مگر اس کے لیے نیا تھا۔

امبیکا میں روپ وتی ہونے کے علاوہ وہ ساری خوبیاں اور ہنر موجود تھے جو ایک رقاصہ اور اداکار کے لیے لازمی تصور کیے جاتے تھے، وہ سنگیت کار تھی۔ شاعری کرتی تھی۔ پھولوں کو سجانے کا فن جانتی تھی۔ ضلع جگت کی استاد تھی۔ فن باغبانی، تیر اندازی اور منطق کی ماہر تھی۔ اس کی آنکھیں بادام کی ایسی تھیں۔ اس کا رنگ خزاں کے پتوں کی مانند پیلا تھا۔ کستوری کی پنکھڑیوں کا غازہ چہرے پر مل کر، کم کم اور کاجل سے آراستہ ہو، نفیس مینا کاری کے گہنے پہن کے جب وہ تماشا گاہ میں نمودار ہوتی تھی چاروں اور تہلکہ مچ جاتا تھا۔

پر گوتم ان تمام اوصاف کے باوجود اس پر ملتفت نہ ہوا، وہ امبیکا کی منڈلی کے ساتھ سارے میں گھوما۔ موریہ سلطنت میں خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ فنون لطیفہ کو زبردست مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ اب گوتم بھی امیر زادوں کے سے ٹھاٹھ سے رہتا۔ شرابیں پیتا۔ نت نئی لڑکیوں پر ڈورے ڈالتا اور پھر فوراً ان سے اکتا جاتا۔ امبیکا، اس کی پجارن، اس کی ان ساری بری عادتوں کے باوجود اس کی پرستش کیے گئی، وہ اس کی محبت کے جواب میں اس سے انتہائی بے رحمی کا برتاؤ کرتا اور اس کو دکھ پہنچا کر دل ہی دل میں خوش ہوتا۔

اب اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ اس کی بدمزاجی، اس کے اکل کھرے پن، اس کے غرور اور اس کی عشرت پسندی کے قصے بھی مشہور ہو چکے تھے۔

یہ سب تھا مگر ایک خیال دل و دماغ پر برابر مسلط تھا، اس کی روح کی گہرائیوں میں تان پورے کے سروں کی طرح گونجتا رہتا تھا۔ چمپک۔۔۔ چمپک۔۔۔چمپک۔۔۔۔

اس نے چمپک کی تلاش میں دور دراز کی یاترائیں کیں، شاید وہ زندہ ہو۔ مارے جانے سے بچ گئی ہو۔ شاید کسی پرانے مٹھ و یہار میں دکھائی دے جائے، وہ شاکیہ منی کی بھکشنوں کی ٹولیوں کو غور سے دیکھتا، وہ ہر پنگھٹ، ہر بزاز کی دکان، ہر سنگیت منڈلی میں، ہر اس جگہ چمپک کو تلاش کرتا جہاں لڑکیاں جمع ہوتی تھیں مگر وہ کہیں نہ ملی۔

تب اس نے تھک کر اپنی کھوج ختم کر دی اور امبیکا کی محبت کے آگے اپنی ہار مان لی۔ اب وہ صرف امبیکا کے ساتھ ہی رہتا۔ اس نے دوسری لڑکیوں کی طرف توجہ بھی کم کر دی۔ امبیکا کے ساتھ اس کی زندگی میں ایسا سکون آ گیا تھا جو صرف ایک گرہست ہی کو میسر ہوتا ہے۔ بعض دفعہ وہ امبیکا کو افسوس سے دیکھتا، یہ بے چاری میرے لیے کیوں اپنا وقت خراب کر رہی ہے۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب اس کے بال سفید ہو جائیں گے، اس کی آنکھوں کے نیچے لکیریں پڑ جائیں گی۔ خوبصورت عورت کی اصل موت اس کا بڑھاپا ہے۔ بیوقوف امبیکا کیوں نہیں ان لوگوں کی طرف دیکھتی جو سچ مچ اس کی قدر کرتے ہیں۔

مگر برس اسی طرح نکلتے گئے۔ گوتم نیلمبر اب اڑتیس سال کا ہو چکا تھا۔ اس کے بھنورا ایسے کالے بالوں میں چاندی کے تار جھلملانے لگے تھے، وہ اب بھی اسی طرح ہنستا تھا۔ مشرقی ونگا کی ملائم ململ اور قیمتی ریشم میں ملبوس اپنے منقش رتھ میں

امبیکا کے ساتھ ہوا خوری کے لیے نکلتا تھا۔

آج وہ پاٹلی پتر میں موجود تھا اور حسب معمول تمثیل کے دوران میں امبیکا کے ساتھ مکالمہ ادا کر رہا تھا اور تماشائی اسے عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ تماشائی جو بہروپ کے عاشق ہیں، جو اصل گوتم نیلمبر کو کبھی نہیں دیکھ پائیں گے۔

۱۶

خواتین نے تاسف کی شدت سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ خواب پرست لڑکیوں نے حیرت اور دکھ سے اپنے دانتوں تلے انگلی داب لی۔

انہیں خواتین کی صفوں میں ایک طرف چمپک بیٹھی تھی۔ اس نے نقرئی پھولوں والی اودے رنگ کی ریشمین ساری پہن رکھی تھی اور اپنی سہیلی سے باتیں کرنے میں مصروف تھی۔

جب اس نے نظریں اٹھائیں تو اسے گوتم نیلمبر نظر آیا، وہ لرز اٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند تیرنے لگی اور اس دھندلکے میں گوتم کا چہرہ اس کے سامنے جھلملاتا رہا۔

گوتم نے گرج کر کچھ سناتے ہوئے دیکھا اور تماشائیوں کے اس ہجوم میں اسے وہ دکھلائی دی، وہ چند لمحوں تک اپنا مکالمہ فراموش کر کے وہ مبہوت اسے دیکتا رہا۔

پھر یکلخت اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

کیونکہ چمپک جو اودی ساری پہنے اس کے سامنے بیٹھی تھی، جو اتنے انتظار، اتنی تلاش کے بعد اسے یوں اچانک نظر آ گئی تھی۔ گوتم نے اسے اس وقت دیکھا جبکہ اس کی مانگ میں سیندور تھا اور پیروں میں سرخ مہندی اور بچھوے اور اپنے چھوٹے سے بچے کو گود میں لیے تماشا گاہ کے فرش پر سہیلیوں کے ساتھ آلتی پالتی مارے اطمینان سے بیٹھی تھی۔

اور آن کی آن میں وہ دوسرے کنارے پر پہنچ گیا کیونکہ پہلے وہ مقدس تھی اب مقدس تر ہو چکی تھی، وہ ماں تھی اور اب یک بیک اس پر انکشاف ہوا کہ شکنتلا، دمینتی، ساوتری اور سیتا کیسی رہی ہوں گی، کیسی لگتی ہوں گی۔

اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتفاقات، حادثے، وقت کے انوکھے کھیل بھی بہت بڑی حقیقت ہیں۔

وہ سنبھل کر پھر اداکاری میں مصروف ہو گیا۔

وہ آپ ہی آپ چپکے چپکے آنسو پیتی رہی۔ ایک شخص نے دنیا تیاگی پھر بھی اس کی یاد دل سے نہ ہٹا سکا، وہ ہری شنکر تھا۔ ایک شخص نے اس کی یاد سے بچنے کے لیے تیاگ کی بجائے دنیا میں پناہ ڈھونڈی اور پھر بھی ویراگی رہا گو ظاہر میں مکمل دنیا دار بنا، وہ گوتم نیلمبر تھا، وہ خود، وہ دکھیاری نہ دنیا تیاگ پائی نہ دنیا میں زندگی کی مسرتوں ہی کو حاصل کر سکی۔ یہ سب مایا کے کھیل تھے۔

اسے وہی کرنا پڑا جو عورت کی حیثیت سے اس کے بھاگ میں لکھا تھا اور جو غالباً اس کا فرض تھا۔ راجن کے قتل کے بعد اسے دوسری شہزادیوں کے ساتھ پکڑ کر پاٹلی پتر لایا گیا۔ ایودھیا کے راج گھرانے کی ساری لڑکیوں سے فاتحین نے

شادیاں رچائیں۔ اس کا بیاہ بھی چانکیہ مہاراج کے ایک افسر سے کر دیا گیا جو پچاس سالہ، موٹا، گنجا اور نہایت چالاک برہمن تھا جو مالیات کے محکمے میں ملازم تھا اور ہر وقت ننانوے کے پھیر میں پڑا رہتا تھا۔

چمپک کا دھرم تھا کہ اس کی پرستش اور اس کی خدمت کرے کیونکہ وہ اس کا شوہر تھا اور وہ اس کی خدمت کرتی تھی۔ جیسے پاٹلی پتر کی اور ہزاروں گرہ پتنیاں تھیں ان میں سے ایک وہ بھی تھی، اس میں کوئی خاص بات نہ تھی اور اس کی گود میں اس کا بچہ تھا اور وہ اپنی سہیلی سے ادھر ادھر کی عام باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ فلسفوں کے تذکرے کا وقت نکل چکا تھا۔

اس نے احتیاط سے اپنے آنسو پونچھے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ پتی ورتا عورت ہونے کی حیثیت سے اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

کچھ دیر بعد جب تمثیل کا پہلا باب ختم ہوا اور پردہ گرا تو اس نے آہستہ سے اپنی داسی کے کان میں کچھ کہا۔ داسی ادھر ادھر دیکھتی ہوئی سرعت سے باہر چلی گئی۔

۱۷

پہلے باب کے خاتمے پر گوتم بھی تنگ بھومی کے پیچھے سنگھار کمرے میں گیا جہاں دوسرے اداکار آ کر جمع ہو رہے تھے۔

''ایک داسی تم سے ملنا چاہتی ہے۔'' امبیکا نے آئینے کے سامنے اپنی مالائیں اتارتے ہوئے مڑ کر اس سے کہا۔

''کون ہے؟'' گوتم نے پوچھا۔ اس کی آواز میں سے ساری درشتی، سارا چڑچڑاپن غائب ہو چکا تھا۔ امبیکا اس کی اس اچانک تبدیلی پر ہکابکا رہ گئی، وہ کس قدر شانت معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہرا سکون تھا۔

''پتا نہیں۔'' امبیکا نے ذرا ہکلا کر جواب دیا، ''تم خود دیکھ لو۔'' اور پھر وہ اپنے ملبوسات اٹھا کر دوسری رقاصاؤں کی طرف چلی گئی۔

گوتم سنگھار کمرے کی سیڑھیوں پر آیا جو باہر باغ میں اترتی تھیں۔

نیچے ایک سانولی سی خادمہ کھڑی تھی۔ اس نے جھک کر گوتم کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور اس نے کہا: ''میری رانی نے تم کو پرنام کیا ہے اور کہا ہے کہ کیا تم جاتے وقت ان سے مل کر نہ جاؤ گے۔''

وہ ایک سیڑھی اتر کر نیچے آیا اور چند لمحوں تک گم سم کھڑا رہا۔ پھر اس نے جواب دیا: ''نہیں۔ اپنی رانی سے کہو، جو جاگتا ہے اسے ایک دن نیند آ جاتی ہے اور جو سوتا ہے وہ ایک روز جاگ اٹھتا ہے۔ ان لوگوں کی طرف دیکھو جو برابر جاگتے رہتے ہیں۔ ان سے کہنا، اب میں بھی جاگ رہا ہوں اور اب کوئی شے میرے راستے میں نہیں آ سکتی۔ اور ان سے یہ بھی کہنا کہ کیا وہ بھول گئیں کہ پتی ورتا عورت کے لیے دوسرے مرد سائے کے سمان ہیں۔۔؟ اب تم جا سکتی ہو۔''

وہ چھاجھن بجاتی تمثیل گاہ کے اندر گئی اور چند لمحوں بعد واپس آ گئی اور اسے یہ دیکھ کر ذرا بھی تعجب نہ ہوا کہ وہ اب تک وہیں سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ اس نے قریب آ کر کہا: ''میری رانی کہتی ہیں تمہارا خیال ٹھیک ہے، اگر اب جاگ گئے ہو تو یہ بھی بہت اچھا ہے۔ دوسری بات کا جواب یہ ہے، انہوں نے کہا ہے کہ تم پتی

ورتا کے معنی کیا جانو، لیکن ٹھیک ہے، کسی شے کو تمہارا راستہ روکنے کا کوئی حق نہیں ہے، اب تم بھی جا سکتے ہو۔۔۔"

اتنا کہنے کے بعد وہ جلدی سے منہ پر گھونگھٹ کھینچ کر تماشائیوں کے ہجوم میں غائب ہو گئی جو دوسرا باب شروع ہونے کے لیے اندر جا رہے تھے۔

تمثیل ختم ہونے کے بعد گوتم تماشائیوں پر نگاہ ڈالے بغیر رنگ بھوم سے باہر نکلا۔ سنگھار کمرے میں جا کر اس نے اپنے ریشمیں کپڑے اور گہنے اتارے۔ ایک سفید چادر کندھے پر ڈال کر ننگے پاؤں وہ ہجوم کی نظروں سے بچتا تماشا گاہ سے باہر آ گیا اور اس قدر تیز رفتاری سے شہر کے پھاٹک کی طرف بڑھنے لگا جیسے کوئی مجرم قید خانے سے نکل بھاگا ہو اور ڈرتا ہو کہ پہرے دار اسے پھر سے نہ پکڑ لیں۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سرایوں میں تیز روشنی جل رہی تھی۔ طعام خانوں میں سے کھنکھنے قہقہوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ شفاخانوں میں مریض لیٹے موت کا یا تندرستی کا انتظار کر رہے تھے۔ بازاروں میں چاندی اور تانبے کے سکے کھنک رہے تھے۔ سوتی ساریاں پہنے مزدور عورتوں کی ٹولیاں کپڑا بننے کے سرکاری کارخانوں میں کام کر رہی تھیں۔ ہتھیار خانوں میں اسلحہ گھڑے جا رہے تھے۔ دریا کی بندرگاہ پر جہاز بن رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ ویشیاؤں کے علاقے میں سے گزرا جہاں ٹھگوں، جواریوں، مداریوں اور نقلی جادوگروں کے اڈوں پر جوا ہو رہا تھا۔ دور سے راج محل کے بلند کنگورے نظر آ رہے تھے۔

اس وقت سمراٹ اپنے دیوان خانے میں لیٹے چانکیہ مہراج کے ساتھ چتر

رنگ (شطرنج) کھیل رہے ہوں گے۔ یہ سوچ کر بھی وہ مسکرایا۔

ایک ویشیا اس کے قریب سے اسے بغور دیکھتی ہوئی گزر گئی۔ غالباً یہ بھی دوسری قابل ویش ناریوں کی مانند جاسوسی کے محکمے میں ملازم تھی۔

سوال یہ ہے، چانکیہ مہراج سے کوئی پوچھے، اس نے دل میں کہا، کہ کون کس پر جاسوسی کرے گا؟ وہ پھر مسکرایا۔

اب اندھیرا چھا رہا تھا اور تاروں بھرے آسمان کے نیچے فصیل کے برجوں میں پہرے دار للکار رہے تھے، وہ ایک پھاٹک کے قریب پہنچ کر ٹھٹھک گیا۔ اس شہر پناہ کے چونسٹھ پھاٹک ہیں۔ کونسا پھاٹک میری منزل کے راستے پر کھلتا ہے۔۔؟

پہرے دار نے اسے کوئی غریب باعزت برہمن سمجھ کر خاموشی سے باہر جانے دیا۔ وسیع خندق عبور کر کے وہ شاہراہ پر آ گیا جو پریاگ کی سمت جاتی تھی۔

سون ندی عبور کرنے کے بعد کئی دن تک وہ سرگرم سفر رہا۔ راستے میں اندھیرے جنگل پڑتے تھے اور ندیاں نالے۔ ندیوں کے کنارے سادھو تپسیا میں مصروف تھے۔ ون پرستھ، جو گرمیوں میں چلچلاتی دھوپ میں بیٹھے، برسات میں بارش میں شرابور ہوتے، جاڑوں میں بھیگے کپڑے پہنتے تاکہ جسم کی تکلیف زیادہ ہو۔ اسے یاد آیا وہ ابھی ایک بار ببول کے کانٹوں پر سویا تھا، پانی میں ایک ٹانگ سے رات بھر کھڑا رہا تھا۔

ون پرستھ کے بعد سنیاس کا دور آتا ہے جب تارک الدنیا انسان مستقل سفر میں رہتا ہے۔ غالباً میرا ابھی یہی دور ہے، وہ زمانہ جس میں نہ موت کی تمنا رہتی

ہے نہ زندگی کی، وہ چلا گیا۔ راہ میں شہر تھے، سرکاری کھیت، آشرم، مور پالنے والوں کے گاؤں۔ اس کا ٹھکانہ کدھر ہے؟

لیکن ڈرنے کی کیا بات تھی، وہ زمین کے ساتھ تھا۔ زمین اس کی ماں تھی، وہ اس کا ساتھ دے گی۔

گھاس کی بھینی خوشبو، پتھروں کی خنکی اور مٹی کی قوت اس نے اپنے تلووں کے نیچے محسوس کی۔ اس نے بازو پھیلا کر ہوا کو چھوا اور آہستہ آہستہ دہرانا شروع کیا: زمین (رگ وید کی ایک حمد) تیری پہاڑیاں، برفانی پہاڑ اور جنگل مسکرا رہے ہیں۔ میں تیری سطح پر کھڑا ہوں، میں مغلوب نہیں ہوا، مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا مجھے زخم نہیں لگے۔ میں سالم ہوں، مجھے کوئی ختم نہ کر سکا۔

زمین تیرے اندر کیا کچھ ہے۔ تو جو بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے انسانوں کو اپنے اوپر لادے ہے، جس نے ہزاروں ندیوں کی صورت میں مجھے دولت عطا کی ہے۔ کون گاؤں، کون جنگل، کون سبھائیں زمین پر ہیں، جہاں ہم تیری تقدیس کرتے ہیں۔ زمین مجھے ٹھکانہ دے۔ مجھے کہیں ٹھکانہ دے۔

اسے چلتے چلتے کئی دن گزر گئے۔ طرح طرح کے پودوں اور پھولوں کی ٹہنیاں اس کے راستے میں جھک جھک آئیں پرندے اس کے ہمراہ سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ساون کی بوندیں کنول کے پتوں پر جل ترنگ چھیڑ رہی تھیں۔

کھیتوں پر بادل جھکے کھڑے تھے۔ لڑکیوں کی چنریاں ہوا میں اڑ رہی تھیں۔

وہ ایک منڈیر پر کھڑا ہو گیا اور بھیگی آنکھوں سے اس نے اس منظر کو دیکھا۔ بڑھتی جاؤ۔۔ بڑھتی جاؤ، او جو کی بالیو۔ تاکہ ہمارے گھڑے بھر جائیں۔ طوفانوں

سے محفوظ رہو۔ جو کی الوہی بالیو۔ سمندر کی طرح اتھاہ رہو، وہ سب امر رہیں جو تمہاری خدمت کرتے ہیں۔ تمہارے کھلیان امٹ (رگ وید کی ایک حمد) رہیں۔

اس نے چپکے سے اپنی پلکوں کو خشک کیا۔ پھر آسمان کی اور دیکھا۔ بادلوں میں سے ایک قطرہ ٹپ سے اس کی پلکوں پر آن گرا۔ جس طرح سیپی میں بہار کی بوندیں ٹپک جاتی ہیں۔

وہ منڈیر پر سے اتر کر پھر پگڈنڈی پر آ گیا اور سڑک پر چلنے لگا۔ افق پر سیاہ بادل گرج رہے تھے، وہ خوشی سے سرشار تھا۔ اس کے دل میں طوفانی دریا لہریں مار رہے تھے۔ اس کے دماغ میں سریلے آبشار گیت گا رہے تھے۔ اس نے اندر کو اپنی معیت میں کھڑا پایا۔ رور اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ مسرت میں ڈوب کر اس نے بادلوں پر نگاہ ڈالی۔ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بوندیں پتوں میں سے چھن چھن کر اس کے بالوں کو بھگوتی رہیں۔ بارش کے قطرے اس کے خوبصورت اداس چہرے پر جھرنے کی طرح گرا کیے۔ اس نے آہستہ آہستہ رور کی تقدیس کی:

رتھ بان (رگ وید کی حمد) کی طرح جو اپنے گھوڑوں کو کوڑے لگاتا ہے، وہ بارش کی آمد کی اطلاع دے رہا ہے۔ آسمان پر بادل امنڈ آئے ہیں اور دور سے شیروں کے دھاڑنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ ہوا تیز ہے اور بجلی چمکتی ہے۔ پودے تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور آسمان پر دھند چھائی ہے۔ زمین پر بیج گرے ہیں اور زرخیز بارش سب کے لیے برسے گی۔ گرج اور دھاڑ۔ دھاڑ اور گرج۔ بیج بو۔ پانی کے زوردار چھینٹے اڑاتے رتھ میں اڑتا ہوا، برستا ہوا آ، تاکہ جل اور تھل

ایک ہو جائیں۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ پھر صبح ہوئی اور بارش تھمی اور روشنی پھیلی۔ کنجوں میں شنکھ پھونکے جارہے تھے۔ ندیوں کے کنارے برہمن اوشا کی حمد الاپ رہے تھے۔

روشنی پھیل گئی۔ برہمنوں نے کہا۔

ان گنت آنے والی صبحوں میں سب سے پہلی، گزری ہوئی صبحوں کے راستے پر چلتی ہوئی اوشا زندہ انسانوں کو اٹھا رہی ہے لیکن جو مر چکا ہے اسے وہ نیند سے نہیں جگائے گی۔

تو، جس کے رتھ میں اودے گھوڑے جتے ہیں، پروہت اور شاعر تیری تقدیس کرتا ہے۔۔ برہمنوں نے کہا۔

دولت مند لڑکی، آج کے دن ہم پر اپنا فضل کر۔

بہادر بیٹے اور گائیں اور گھوڑے عطا کرنے والی اوشا، شاعر اپنی حمد وایو (ہوا) سے بلندتر آواز میں ختم کر رہا ہے۔

خداؤں کی ماں، جگمگائے جا اور ہمیں قوموں میں بلندترین مرتبہ عطا کر۔۔ اور ایسا ہو کہ مترا اور ورونا اور سندھو اور زمین اور آسمان ہماری حفاظت کریں۔ برہمنوں نے کہا۔

گوتم ہوا کے نرم جھونکوں کی زد میں چلتا آگے بڑھتا گیا۔

خداؤں کی ماں۔ جگمگائے جا اور ہمیں قوموں میں بلندترین مرتبہ عطا کر۔

برہمنوں کی آواز اس کے پیچھے دریا پر پھیلتی گئی۔۔ وہ مندروں کی قطار کے

سامنے سے گزر کر پھر جنگل کے راستے پر آ گیا۔

سامنے ایودھیا تھا۔

تب وہ بھیگی مٹی پر دوزانو بیٹھ گیا اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور خلا ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازلی اور ابدی انسان۔ تھکا ہوا شکست خوردہ۔ بشاش۔ پر امید۔ انسان جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے اور سامنے ایودھیا کا سنہرا شہر تھا، جو بارش کے دھندلکے میں یوں جگمگا رہا تھا مانو سارا کا سارا سونے کا بنا ہوا اور اس میں سے جگر جگر کرتی تیز کرنیں نکل رہی تھیں۔

پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی آواز میں یقین تھا اور شان اور غرور۔ اس نے اپنے خدا کو للکار کر مخاطب کیا۔ اس نے کہا:

خداوند۔ تو جو آگ ہے، تو سورج ہے، ہوا، چاند، ستاروں والا آسمان، تو برہما ہے، پانی ہے، پرجاپتی ہے۔

تو عورت ہے، تو مرد ہے، تو نوجوان ہے، تو لڑکی ہے، تو وہ بوڑھا ہے جو اپنی لاٹھی ٹیکتا لڑکھڑاتا ہوا جا رہا ہے، تو اپنے چہرے کا رخ ہر سمت کیے پیدا ہوتا ہے۔

تو گہری نیلی مکھی ہے، تو سرخ آنکھوں والا سبز طوطا ہے، تو طوفانی بادل ہے، تو سارے موسم ہے، تو سمندر ہے۔

۔۔ دو پرند، چہیتے دوست، ایک درخت پر بیٹھے ہیں۔ ایک پھل کھا رہا ہے دوسرا اسے ٹکر ٹکر دیکھتا ہے۔ اسی درخت پر انسان بیٹھا ہے۔ اداس، اپنی کم طاقتی پر متحیر، لیکن وہ جو دوسرے کو مطمئن دیکھتا ہے اور اس کی عظمت پہچانتا ہے اس کا اپنا دکھ ختم ہو جاتا ہے۔ جو رگ وید کی اس امٹ ہستی کو نہیں جانتا جس کے اندر خدا

رہتے ہیں رگ وید کا اسے کیا فائدہ ہوا۔؟ وہ جو اسے جانتے ہیں مطمئن بیٹھے ہیں۔

وہ جو اسے پہچان گیا، جو لطیف سے لطیف تر ہے، جس کے بہت سے روپ ہیں، جو شیو، یعنی سرور ہے۔

اور جب روشنی بلند ہوتی ہے تو نہ دن باقی رہتا ہے نہ رات، نہ وجود، نہ عدم وجود۔ صرف شیو باقی ہے، وہ ابدی روشنی ساوتری کی ہے، جس روشنی سے عقل پیدا ہوئی۔

اس کا حسن دیکھا نہیں جاتا۔ اس کے جلال اور عظمت کی شبیہ نہیں بن سکتی، وہ دل میں موجود ہے۔

تو جو پیدا نہیں ہوا، ان الفاظ کے ساتھ کوئی تھر تھر کانپتا تیرے نزدیک آتا ہے۔ او رور میری حفاظت کر۔

وہ دنیا میں تنہا پرندہ ہے، وہ آفتاب کی مانند ہے۔ جو سمندر میں ڈوب چکا ہے۔ انسان جو اسے جان جائے موت پر سے گزر جائے گا۔

کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ سفر کا نہیں۔

پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کا جسم مرتعش تھا، جس طرح تان پورے کے تار جھنجھناتے ہیں۔ اس کے قدموں کے نیچے پانی کے بہنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ سرجو بے نیازی سے رواں تھی۔

پھر اسے لگا جیسے اسے کوئی دور سے آواز دے رہا ہے بارش کی وجہ سے دریا کا پاٹ بیحد وسیع ہو چکا تھا۔ اس نے غور سے سنا لیکن آواز اس کے کانوں تک صاف

نہیں آ رہی تھی۔ اس نے بہت غور سے، ماتھے پر ہاتھ کا سایہ کر کے دیکھنے کی کوشش کی، اسے کچھ نظر نہ آیا۔ ندی کے دوسرے کنارے پر نارنجی پوشاک میں ملبوس ایک ہیولے سا ڈول رہا تھا۔

تب اس نے گھاٹ پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی (اس لڑکی نے کیسری ساری پہن رکھی تھی اور اس کے بالوں میں چمپا کے پھول تھے) سے پوچھا: ''کچھ جانتی ہو، ندی کے اس پار کون رہتا ہے؟''

''کچھ بھکشو لوگ ہیں۔'' لڑکی نے بے پروائی سے جواب دیا اور پیر دھونے میں مصروف رہی۔ ''وہ ان میں سے ایک سامنے کھڑا تو ہے۔''

''تم اسے جانتی ہو؟''

''میں اسے جان کر کیا کروں گی۔۔؟'' لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔

''اچھا ذرا میں اس سے مل آؤں۔''

''ایسی طوفانی ندی کو پار کرو گے؟ ۔۔ اس وقت تو یہاں کوئی ناؤ بھی نہیں ہے۔''

''کیا حرج ہے۔۔ ندیاں پار کرنے کے لیے ہی تو ہیں۔''

موسم بے حد سہانا ہو چکا تھا۔ مور جھنکار رہے تھے، پپیہے چلاتے تھے بھنورے گونج رہے تھے۔ بہت سے پھول ڈال سے ٹوٹ کر اس کے قدموں پر آن گرے۔ اس نے جھک کر انہیں اٹھایا اور ندی میں بہا دیا۔ پھر وہ پانی میں کود گیا اور دوسرے کنارے کی طرف پیرنے لگا۔

دوسرے کنارے پر ایک ادھیڑ عمر کا بھکشو، نارنجی پوشاک میں ملبوس، دیر سے

اس کی راہ تک رہا تھا۔ گوتم کو اپنی اور آتے دیکھ کر اس کا چہرہ انبساط سے جگمگا اٹھا۔

وہ ندی آدھی سے زیادہ عبور کر چکا تھا تب اس نے بھکشو کی آواز سنی:

''بھائی گوتم۔''

''ہاں بھائی ہری شنکر۔۔۔ پہنچتا ہوں۔۔۔ ٹھہرے رہو۔۔'' اس نے زیادہ تیزی سے پیرنا شروع کر دیا۔

اتنے میں پانی کا ایک زوردار ریلا آیا جس کے تھپیڑے سے وہ کنارے کے بہت قریب پہنچ گیا مگر اب پانی کی لہریں اونچی ہو چکی تھیں۔ اس نے پوری طاقت سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے مگر پانی میں اس سے زیادہ طاقت تھی۔ اسی کشمکش میں اسے ایک چٹان ایسی نظر آئی جو پانی کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ یہ چنڈی کے شکستہ مندر کا ایک حصہ تھا جو باہر کو جھک آیا تھا۔ اس نے جلدی سے اس کی ایک کگر کو پکڑ لیا۔ اب وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ پتھر کو پکڑ کر اس نے ذرا کی ذرا آنکھیں بند کیں۔ وقت کا ریلا پانی کو بہائے لیے جاتا تھا۔ چاروں اور وسعت تھی لیکن پتھر کو اپنی گرفت میں لے کر اسے ایک لحظے کے لیے اپنی حفاظت کا احساس ہوا کیونکہ پتھر، جس کا ماضی سے تعلق ہے، آنے والے زمانوں میں بھی ایسا ہی رہے گا۔

لیکن اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں اور وہ پل بھر سے زیادہ پتھر کو اپنی گرفت میں نہ رکھ سکا۔

سرجو کی موجیں گوتم نیلمبر کے اوپر سے گزرتی چلی گئیں۔ ابوالمنصور کمال الدین نے کنارے پر پہنچ کر اپنا شیام کرن گھوڑا برگد کے درخت کے نیچے باندھا

اور چاروں اور نظر ڈالی۔ اس کی تھکی ہوئی آنکھوں کو یہ جگہ بڑی سہانی معلوم ہوئی۔ سامنے ندی بہہ رہی تھی۔ دور جھونپڑے بنے تھے۔ شوالوں میں سے گھنٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ برگد کے درخت کے نیچے کسی پیر کا مزار تھا۔ گاؤں کی عورتیں گھونگھٹ کاڑھے آتیں اور مزار پر پھل پھول چڑھا کر آگے چلی جاتیں۔ اس نے جھک کر پانی میں انگلیاں ڈبوئیں اور پانی کی خنکی اسے بہت اچھی لگی۔ پتھروں کے نیچے، جہاں لہروں کا بھنور ایسا بنا تھا، اس میں اسے اپنا چہرہ نظر آیا اور ایک لمحے کے لیے وہ متعجب سا ہو گیا، وہ یہاں آ کر کیا کر رہا ہے؟

چمپا اب تک نہ آئی تھی۔ اس نے دوبارہ ندی کی طرف دیکھا۔ شاید کشتی میں آتی ہو، مگر کشتی میں چند دیہاتی بھجن گاتے اپنی دھن میں مگن ایک سمت کو چلے جا رہے تھے۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر ایک جھاڑی پر پھیلی ہوئی امر بیل کا ایک پتا توڑا۔ کدم کی ٹہنی پھولوں سے لدی تھی۔ چند پھول ٹپ ٹپ اس کے سر پر آ گرے۔ اس نے پگڑی اتار کر ان پھولوں پر ہاتھ پھیرا اور اپنی تلوار کے منقش قبضے کو چھوا۔ پھولوں کے اس ہجوم میں تلوار اسے بہت بے تکی معلوم ہوئی۔ اس نے آہستہ آہستہ تلوار کمر سے علیحدہ کر کے گھاس پر رکھ دی۔

تب پانی میں پیرتی ہوئی چمپا گھاٹ پر آ گئی۔

''ہم تو سمجھے تھے تم کہیں اور مارنے مرنے کے لیے چک دیے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ابھی تک تو نہیں۔ پر اب شاید چلا جاؤں۔ کچھ عرصے بعد۔''

''کہاں۔'' لڑکی نے گھبرا کر پوچھا۔

''بہار۔۔اوراس سے بھی آگے، بنگال۔۔''

''وہاں جا کر کیا کرو گے۔یہیں رہو۔''

''وہاں میرے بھائی بند ہیں۔''

''جھوٹ مت بولو۔تمہارے بھائی بند کہیں پہاڑوں میں لوٹ مار مچاتے ہوں گے۔گوڑ کے دربار میں ان کا کیا کام۔''

''تم میرے بھائی بندوں سے بہت خفا ہو اور دوسری بات یہ کہ وہ لوٹ مار نہیں مچاتے۔یہ ترکوں اور افغانوں کا مشغلہ ہے۔میں عرب ہوں۔میرا کام فلسفہ دانی ہے اور۔''اس نے ذرا رک کر کہا،''میری ماں ایرانی تھی اور ایران والے، او بیوقوف لڑکی، شعر کے پرستار ہیں، خون نہیں بہاتے۔''

وہ اسی طرح ہنستی رہی۔اب وہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھی اپنے بال سکھا رہی تھی۔

''ہنستی رہو۔ایک روز زبردستی اڑا کر لے جاؤں گا۔پھر بعد میں جو چاہنا کہنا۔''

''ہے ہے۔ایسا اندھیر نہ کرنا۔شکر کرو یہ گاؤں ہے جہاں تم سے بات کر لیتے ہیں تو کوئی برا نہیں مانتا۔جونپور میں اگر اس طرح تم گھنٹوں ہم سے باتیں کرتے تو دیکھتے اپنا حشر۔''

''جونپور میں تو میں تم کو قطعی بھگا لے جاتا۔لے جا کر سیدھا اپنی حویلی میں بند کر دیتا۔''

''رام رام۔کیسی باتیں کرتے ہو۔جونپور میں ہمارا ایسا مہاتما سان بادشاہ

رہتا ہے، مجال ہے جو تم ایسی حرکت کرتے۔''

''اجی دیکھے ہیں تمہارے مہاتما سان بادشاہ۔''

''کیوں۔ایسے ایسے گیت بناتا ہے۔ جو انسان اتنا بڑا سنگیت کار ہو وہ دیوتا نہیں تو اور کیا ہوگا۔ایک روز بھین نے مجھے ایک بڑا پیارا گیت حسینی کانڑا میں سنایا تھا۔بھین کہتے تھے کہ یہ سلطان کی سنگیت ہے۔اسے خیال کہتے ہیں۔''

''اب تم موسیقی پر تقریر کرو۔اور کل تم اپنے برآمدے میں بیٹھی کس کو حسینی کانڑا سنا رہی تھیں؟ تم کتنے آدمیوں سے ملتی ہو۔؟''

''تم کو اس سے مطلب۔کمل جی تم اپنا رعب مجھ پر مت جھاڑو۔صوبیدار رہو گے اپنی فوج کے ہوگے مجھ پر کاہے کی دھونس ہے۔''

میں صوبیدار نہیں ہوں۔لاحول ولاقوۃ۔۔۔ویسے سپاہی کا پیشہ ہی مرد کو سجتا ہے۔''

''قاتل کا پیشہ۔۔''

''پھر تم نے کمینی باتیں شروع کیں۔''

''اچھا اب نہیں کہنے کے، مگر ہو تم قاتل ضرور۔۔۔جانے کتنی ماؤں کے بیٹوں کو اس تلوار سے مارا ہوگا۔۔ہائے ہائے۔''

''پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ، کتنی بار سمجھایا ہے کہ میں فوجی نہیں ہوں۔ سلطان کے کتب خانے کا نگران ہوں۔''

''وہ کیا ہوتا ہے۔''

''اس میں کتابیں لکھی جاتی ہیں، پستکیں، جنہیں سمجھدار لوگ پڑھتے ہیں۔یہ

جو ٹیڑھی میڑھی لکیریں تمہارا بھائی صبح سے شام تک چوکی پر بیٹھا بائیں سے دائیں طرف کھینچا کرتا ہے ان کی کتابیں بنتی ہیں۔ سمجھیں۔''

''جانتی ہوں، مگر پھر یہ تلوار کیوں باندھتے ہو۔۔یہ بڑی خوفناک چیز ہے۔''

''چمپا رانی اسے مردوں کا زیور کہتے ہیں۔ اس کے اور پگڑی کے بغیر لباس مکمل نہیں ہوتا۔ تم اودھ والوں نے افسوس کہ چتوڑ اور قنوج اور مالوے اور بندھیل کھنڈ کے راجپوت نہیں دیکھے۔ دیکھے ہیں کبھی! ایک مرا یار ہے اودے سنگھ راٹھور۔ قنوج کا راجپوت ہے۔ کیا بانکا آدمی ہے۔ آج کل جانے کہاں ہوگا۔ سنا تھا گوالیر کے کرت سنگھ کی فوج میں ہے۔ پتا نہیں شاید مالوے میں کہیں لڑبھڑ رہا ہوگا۔'' کمال الدین چند لمحوں کے لیے اپنے میدان جنگ کے ساتھیوں کی یاد میں ڈوب گیا۔ ''تم پورب والوں کا اس کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں کہ بس گائیں بجائیں گے، پوجا پاٹ میں لگے رہیں گے۔ ارے لڑکی زندگی کا اصل لطف تو میدان جنگ میں آتا ہے۔''

''ابھی تو تم کہتے تھے کہ مارنا مرنا خالی افغانوں کا کام ہے، تم کویتا لکھتے ہو۔''

وہ جھنجھلا گیا: ''تم عورتوں سے بحث کون کرے۔'' اس نے امر بیل کا ایک پتا اور توڑا۔

''دیکھو'' لڑکی گھاٹ پر سے اٹھی اور اپنے سیاہ لمبے بالوں میں سے پانی جھٹک کر ان کا جوڑا بناتے ہوئے بولی، ''جنگ کی باتیں مت کیا کرو۔ میں جب تم کو دیکھتی ہوں اور یہ تلوار دیکھتی ہوں تو مجھے بڑا وہم آتا ہے۔''

وہم۔۔وہ کیا چیز ہے؟''

''تم کو سمجھانا بیکار ہے۔'' وہ پھر سیڑھی پر بیٹھ گئی۔

کمال الدین نے درختوں کے سائے کی اور دیکھا جو ڈھلتے جا رہے تھے۔

''اچھا چمپاوتی تم کو خدا کے حوالے کیا۔'' وہ اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔

''ایودھیا سے تم ابھی چلے جاؤ گے؟''

قریب سے درویشوں کی ایک ٹولی گزری، ان میں سے ایک نوجوان نے چمپا اور کمال کو دیکھا اور پھر نظریں نیچی کرلیں اور سر جھکائے آگے چلا گیا۔

''یہ بھی کیا مسخرے لوگ ہیں۔'' کمال نے اظہار خیال کیا۔

''مسخرے نہیں ہیں۔ بڑے پیارے لوگ ہیں۔ ان کا مذاق مت اڑانا۔'' چمپا نے یکلخت غصے سے کہا۔ ''ایک روز یہی تمہارا ساتھ دیں گے۔''

''تمہارے بھائی نے تمہیں اچھی خاصی پنڈتائن بنا رکھا ہے۔ میں کسی روز اس سے مناظرہ کروں گا۔''

''وہ کیا ہوتا ہے۔''

''اس میں یہ ہوتا ہے کہ۔۔'' کمال الدین نے جاتے جاتے مڑ کر رکاب میں سے پیر نکال کر اسے سمجھانا شروع کیا، ''کہ جیسے دو مذہب ہیں نا۔۔ایک تمہارا۔۔ ایک میرا۔۔''

''میرا اور تمہارا کوئی الگ الگ مذہب ہے۔۔؟ میں تو ایک ہی سمجھتی ہوں۔''

''پھر تم نے خرقہ پوشوں والی باتیں شروع کر دیں۔۔تو مطلب یہ۔۔'' اس نے پھر سمجھانا شروع کیا۔۔ ''کہ دو فریق اپنے اپنے مذہب کی سچائی ثابت کرنے کی کوشش کریں، اسے مناظرہ کہتے ہیں۔''

''سچائی ثابت کرنے والے ہم اور تم کون۔۔وہ تو ستیہ پیر ہے جو سب جھوٹ سچ کا فیصلہ کرتا ہے۔کہے کبیرا ک رام چپوری۔ہندو ترک نہ کوئی۔''

''پھر تم نے تقریر شروع کی۔تم کاشی جا کر اپنے کبیر کی چیلی کیوں نہیں بن جاتیں۔مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے میں اپنا وقت کیوں خراب کرتی ہو۔''

''کاشی تم کو بھی ساتھ لے جائیں گے مگر اس سے پہلے تم کو اپنی تلوار اتارنا پڑے گی۔''

''یہی شرط ہے؟''

''بالکل یہی شرط ہے!''

''تم کو تو جونپور کا قاضی ہونا چاہیے تھا۔۔اچھا خدا حافظ۔۔''

وہ دریا کی طرف بڑھا۔''اس پار وہ ٹوٹے پتھروں کا اونچا ڈھیر ایسا کیا ہے؟''

''وہ۔۔ارے وہ تو بہت پرانے مندر کے کھنڈر ہیں۔سینکڑوں ہزاروں برس پرانے۔۔''

''اور اس کے ادھر وہ جھونپڑیاں ایسی ہیں،ان میں کون رہتا ہے۔''

''ان میں بھی صوفی لوگ رہتے ہیں۔۔۔بھگت۔۔۔''

''تب تو تمہارا وقت بہت اچھا کٹتا ہوگا۔۔صوفیوں کی سنگت۔۔مسئلے مسائل ،ذکر اذکار۔۔ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کے لیے کس قدر دلچسپ مشغلے ہیں۔''

''اور کیا کریں۔۔تمہارے جونپور کی شہزادیوں کی طرح محل سرا میں بیٹھ کر شطرنج کھیلا کریں۔''

''بالکل۔۔لیکن میری محل سرا میں شطرنج کے علاوہ کتابیں بھی ہیں۔

سینکڑوں۔۔اورتم اس قدر عالم فاضل پہلے ہی سے ہو۔ میں تم کو عربی فارسی بھی پڑھا دوں گا۔'' وہ دفعتاً جھینپ کر سرخ ہوگئی۔کمال نے اسے تبسم کے ساتھ غور سے دیکھا۔''مگرتم عربی بولتی عجیب مسخری لگو گی۔۔نہیں بھائی۔تم چمپا وتی ہی رہو۔تمہارے روپ میں میں نے عورت کا حسین ترین روپ دیکھا ہے۔۔اچھا خدا حافظ۔۔'' وہ دوبارہ گھوڑے پرسوار ہوا۔

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے: ''تمہارا پڑاؤ یہاں ختم ہوا۔۔اب کہاں جاتے ہو؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''بہرائچ۔۔وہاں جانے کتنے دن لگ جائیں۔''

''بارشیں شروع ہونے والی ہیں، اپنا خیال رکھنا۔''

''ہاں۔میں اپنا خیال رکھوں گا۔خدا حافظ و ناصر بیوقوف لڑکی!''

وہ اسے بیوقوف لڑکی کہا کرتا تھا اوراس خطاب میں کتنا اتھاہ پیار چھپا تھا۔وہ آنسو پی کر مسکرائی۔کمال الدین نے گھوڑے کی باگیں موڑیں اور سڑک پر پہنچ کر غبار میں غائب ہوگیا۔

لڑکی گھاٹ پر اسے اٹھ کر اپنے مکان کی طرف روانہ ہوگئی جس کی کھپریل پر نیلے پھولوں کی بیلیں چڑھی تھیں اور جس کے سبز رنگ کے کواڑوں پر دیوی دیوتاؤں کی رنگ برنگی تصویریں منقش تھیں۔برآمدے میں اس کا بڑا بھائی چٹائی پر بیٹھا کبیر کی نئی بانی کاغذ پر نقل کر رہا تھا۔اس کے قریب دو تین دوست اور بیٹھے تھے۔دروازے طاق پر بھوانی کی چھوٹی سی مورتی رکھی تھی جس کے سامنے رکھی ہوئی دھوپ کی پتلی سی لکیر لہرائی ہوئی اوپر اٹھ رہی تھی۔چمپا نے دروازے کے

قریب کھڑے ہوکر اس پرسکون منظر کو دیکھا اور اپنے آنسوؤں کو خشک کرتی ہوئی اندر چلی گئی۔

۱۸

بہرائچ کی چھوٹی سی آبادی میں پیلے رنگ کے کچے مکان ادھر ادھر بکھرے تھے۔ خاک آلود راستوں پر سے بیل گاڑیاں گزر رہی تھیں اور اداسی کی بے رنگ، بے نام کیفیت سارے میں طاری تھی۔ سنا تھا کہ کسی زمانے میں یہاں ایک بے حد عظیم الشان شہر آباد تھا جسے شراوستی کہتے تھے۔ اس کے سوم ونشی بادشاہ بڑے جاہ وجلال والے تھے اور نجومیوں نے شراوستی کے سوہل دیو سے کہا تھا کہ ایک وقت آنے والا ہے جب اتر سے دیوزاد بلند وبالا ترک آ کر تمہارا خاتمہ کر دیں گے اور غزنی کے محمود کا ایک سپہ سالار ادھر آیا جس کا نام مسعود غازی تھا اور اس مسعود غازی نے سوہل دیو کا خاتمہ کر دیا اور دلی میں قطب الدین ایبک آیا اور اس کے سپہ سالار احمد بختیار نے کوشل دیس اور مگدھ اور بنگال کے سارے بت پرست بادشاہوں کا خاتمہ کر دیا۔

اور شراوستی اور نالندہ اور وکرم شالا کے سارے برہمچاری اور بھکشو اپنے اپنے پوتھی پترے وہیں چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگ گئے یا مر کھپ گئے یا نیپال اور تبت کی اور نکل گئے۔

لیکن جس طرح شاکیہ منی پچھلے دو ہزار سال میں وشنو کے اوتار بنا دیے گئے

تھے اور مہایان بدھ مت کے مندروں میں ہزاروں دیوی دیوتا آباد ہو چکے تھے اور سارا بنگالہ اور سارا بہار تانترک منتروں اور دیبی تارا کے بھجنوں کی سریلی آوازوں سے گونج رہا تھا اسی طرح بت شکن سالار مسعود غازی پچھلی دو صدیوں میں بالے میاں کے روپ میں کوشل دیس کے سنواسیوں کے لیے ایک اور دیوتا بن چکے تھے۔ ان کے مزار پر گھی کے چراغ جلائے جاتے۔ ان کے جھنڈے اٹھائے جاتے۔ ہر سال دھوم دھام سے ان کی بارات نکلتی۔

یہ کیسی عجیب باتیں تھیں۔

ابوالمنصور کمال الدین، جو پہلی دفعہ بہرائچ آیا تھا، سالار مسعود کی زیارت گاہ کی دیوار سے لگ کر درخت کے سائے میں بیٹھ گیا اور اچنبھے سے عورتوں کی ایک ٹولی کو دیکھنے لگا جو ہاتھوں میں پیتل کی تھالیاں سنبھالے سامنے مزار پر چڑھاوا چڑھانے کے لیے آ رہی تھیں۔ یہ ہندو عورتیں تھیں۔

اور گونالندہ اور وکرم شیلا اور اجین اور امراوتی کے عظیم الشان بین الاقوامی دارالعلوم اب اجڑ چکے تھے اور شراوتی کے پرانے آشرم سنسان پڑے تھے اور ان پوتھی پتروں کو سمجھنے والا اب کوئی نہ تھا جو عجیب وغریب زبانوں میں لکھے گئے تھے اور عجیب وغریب باتیں ان میں لکھی تھیں، ناقابل فہم فلسفے اور عقل سے بالاتر الہیات۔

مگر کچھ لوگوں کو پیدائشی سنک ہوتی ہے اور کشمیر کے زین العابدین اور گوڑ کے علاؤ الدین حسین شاہ کی طرح جونپور کا حسین شرقی بھی انہی سنکی لوگوں میں سے تھا۔ ان بادشاہوں نے مزید بت شکنی کے بجائے ان پوتھی پتروں میں دلچسپی لینا

شروع کردی۔

حسین شرقی کو جب بھی دلی کے سلطان بہلول اور سلطان سکندر سے جنگ کرنے سے فرصت ملتی وہ اپنا طنبورہ لے کر بیٹھ جاتا۔ راگوں کی دنیا کی نئی نئی سیاحتیں کرتا یا قدیم نسخوں کی ورق گردانی میں مصروف رہتا۔ پچھلے دنوں اسے ایودھیا کے چند پنڈتوں سے معلوم ہوا تھا کہ بہرائچ کے کسی مٹھ میں ڈیڑھ پونے دو ہزار سال پرانے سنسکرت کے کچھ تانب پتر موجود ہیں۔ اس نے اپنے کتب خانے کے جواں سال نگران ابوالمنصور کمال الدین کو ان پنڈتوں سے ملنے کے لیے ایودھیا بھیجا۔

کمال الدین ایودھیا چند دنوں کے لیے گیا تھا لیکن اس کا وہاں اتنا جی لگ گیا کہ اسے تقریباً یاد ہی نہ رہا تھا کہ اسے وہاں سے آگے ترائی کی طرف بھی سفر کرنا ہے کیونکہ ایودھیا میں اسے انہی پنڈتوں میں سے ایک کی بہن نظر آئی جو چمپاوتی کہلاتی تھی۔

اپنے دقیانوسی فلسفوں کو چھوڑ کر سلطان کے حکم کے مطابق، جن کی تلاش میں کمال ان کے پاس گیا تھا، سرجو کے کنارے رہنے والے یہ پنڈت لوگ ایک نئے چکر میں پڑے ہوئے تھے۔ اس چکر کا نام انہوں نے بھگتی رکھ چھوڑا تھا، وہ لوگ دن رات نرگن رام، نرگن رام جپو رے بھائی کی رٹ لگایا کرتے۔ ان ہی کے یہاں کمال الدین شنکر اچاریہ اور رولبھ اور رامانند کے ناموں سے آشنا ہوا اور اب وہ سب کے سب کاشی کے بھگت کبیر کے پیچھے دیوانے ہوئے جا رہے تھے لیکن کمال کو بھگت کبیر یا کسی اور بھگت یا سنت یا اچاریہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ

اپنے آپ کو فلسفی نہیں سمجھتا تھا، وہ مورخ بننا چاہتا تھا۔ اسے دنیا کی قوموں کی تاریخ بڑی عجیب لگتی۔ سلطان نے اسے مختلف مبہم قسم کی تاریخیں لکھنے پر مامور کر رکھا تھا اور اس کا وقت بہت اچھا کٹ رہا تھا۔ لیکن اب سلطان کا حکم تھا کہ پنڈتوں کی مدد سے سنسکرت اور پالی اور پراکرت اور اردھ مگدھی میں لکھی ہوئی ان بے تکی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرے۔ یہ کام بھی زیادہ غیر دلچسپ نہ تھا گو وہ جلد از جلد جونپور واپس پہنچنا چاہتا تھا جہاں شاہی محل میں سلطان کی بھانجی رہتی تھی جس کے لیے اس نے بہت سی نظمیں لکھی تھیں اور جس کے تصور میں اس نے بہت سی چاندنی راتیں کتب خانے کی برجیوں میں بیٹھ کر جاگتے ہوئے گزار دی تھیں۔

لیکن ایودھیا میں اسے ایک برہمن زادی ملی جو اس سے ہر وقت کبیر کی باتیں کیا کرتی، اس سے الٹی سیدھی بحثیں کرتی اور کچھ عرصے کے لیے وہ جونپور کی شہزادی کو بھول گیا۔

اب وہ چمپاوتی ہی کے خیال میں کھویا رہتا کیونکہ وہ بڑی انوکھی، بڑی نئی سی چیز تھی۔ ناجیہ اور رام رباب اور شہزادی سلیمہ بانو بیگم سے بالکل مختلف۔

مرد ہمیشہ تنوع پسند کرتا ہے۔

پرانی کتابوں کی جستجو میں وہ سارے مٹھوں میں گیا جو پانچ چھ سو سال قبل یہاں شنکر اچاریہ کے چیلوں نے قائم کیے تھے۔ شراوستی کے کھنڈروں میں گھوما جو بہرائچ کی بستی سہت مہت کے علاقے میں پڑے سائیں سائیں کر رہے تھے اور جہاں دن میں الو بولتے تھے اور رات میں چمگادڑیں اپنے پر پھیلاتی ہیں۔ ایک روز اسے انہی کھنڈروں میں پتھروں اور شہتیروں کا ایک بہت بڑا انبار نظر آیا جس

کے چاروں طرف گلیاں تھیں۔ یہاں کبھی شاندار بازار رہا ہوگا اور اونچی اونچی حویلیاں بنی ہوں گی، وہ حیرت اور اشتیاق کے ساتھ اس عمارت کے اندر گیا۔ اس کے سارے کمروں میں گھوما۔ گودام، نشست کے ایوان، جن کی دیواروں میں آتش دان تھے، کوٹھڑیاں، غسل خانے، آنگنوں میں بنے ہوئے کنویں اور تالاب۔ مکان کے شمالی مشرقی حصے میں چھوٹا سا مندر تھا۔ جنوبی مشرقی کونے میں باورچی خانہ تھا۔ پندرہ سولہ کمرے سارے میں پھیلے تھے۔ چاروں طرف برآمدے تھے۔ اوپر کی منزل میں جھروکے تھے۔ وسط میں آنگن کے گرداگرد جو برآمدی تھا اس کے ستون ٹوٹے پھوٹے بکھرے پڑے تھے۔ ان ستونوں کے اختتام پر ہاتھی کے سر ترشے ہوئے تھے۔ یہ جانے کس کا مکان رہا ہوگا، کمال نے سوچا۔ پھر اس نے ایک دیہاتی کو آواز دی جو گھاس کا گٹھا سر پر اٹھائے سامنے کی شکستہ گلی میں سے گزر رہا تھا۔ دیہاتی رک گیا اور اسے پر اسرار، سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ کمال کو ایک پھریری سی آئی۔ اس نے ہمت کر کے حلق صاف کیا اور بولا: ''اے بھائی۔۔ جانتے ہو یہ کس کا مکان ہے؟ یہاں کے راجا کا تو نہیں۔۔''

''راجا کا۔۔'' دیہاتی کھلکھلا کر ہنسا گویا بہت بڑا لطیفہ اس نے سنا ہے۔ ''ارے راجا کا مکنوا اتنا چھوٹا۔۔؟ راجا کے محلوا پر تو ہل چل گئیں۔ ای تو ہجارن برس پرانی حویلی ہوئے۔ پرکھن سے سنے ہن ای ما کوؤ باہمن پروہت رہت رہے۔ ان کا لڑکوا ہو بڑا او دوان رہا۔''

''اس لڑکے کا نام جانتے ہو۔۔؟''

''ہم کا جانی۔۔ ہم نیچ نام نا ہیں یاد رکھت ہن۔ نام مٹ جات ہیں۔ کھالی

کھدائے کا نام امر ہو۔'' اتنا کہہ کر وہ اپنا گٹھا سنبھال کر آگے بڑھ گیا۔

کمال کو بڑی جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی۔ سلطان کا فرمان ہے اس ملک کی تاریخ لکھو۔ ایسے ابدیت پرست لوگوں کی تاریخ کس طرح لکھی جا سکتی ہے جو اپنے نام یاد رکھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے!

پھر اس نے مٹھ میں جا کر ایک پنڈت سے پوچھا: ''کھنڈروں میں سے جو سب سے بڑا کھنڈر ہے وہ کس کا ہے۔''

اس نے بھی کمال کو بڑی پراسرار نظروں سے دیکھا گویا یہ غیر ملکی عالم کیسا فضول سوال کر رہا ہے۔ ''یہاں ان گنت چکرورتی راجہ ہو کر گزر گئے ہیں۔ چندر گپت موریہ، اشوک پریہ درشن، سمدر گپت۔ چندر گپت موریہ سے قبل یہاں بڑے بڑے چتر کار رہتے تھے اور سنگتر اش اور لیکھک لیکن ان کے نام ہم کو معلوم نہیں۔ نام مٹ جاتے ہیں انسان زندہ رہتا ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ۔'' کمال نے دل میں کہا۔ تاریخ لکھنا ناممکن ہے، ان تانب پتروں کے مصنفوں کا نام بھی موجود نہیں تھا جن کا ترجمہ کروانے کے لیے وہ یہاں آیا تھا، وہ گھوم پھر کر اسی کھنڈر میں واپس آ گیا اور ایک ٹوٹے ہوئے ستون پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب کیا کرے۔

یکلخت اسے بغداد اور نیشاپور کی یاد نے بے طرح ستانا شروع کر دیا۔

۱۹

کمال اس ملک میں تازہ وارد تھا، اسے جونپور میں رہتے صرف چند سال گزرے تھے۔ بائیس سال کی عمر تک اس نے بغداد کے مدرسے میں بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ بہت سے نظریوں پر غور وفکر کیا تھا، وہ بخارا کے ابن سینا، الفارابی اور ایران کے فخر الدین رازی اور اندلس کے ابن رشد اور ابن العربی کا مفصل مطالعہ کر چکا تھا۔ ابن خلدون کو وہ اپنا گرو سمجھتا تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ عرب اقوام کی تاریخ لکھنا شروع کرے۔ ابن خلدون کے مکتب سے تعلق رکھنے والے چند مفکروں سے ملنے کی غرض سے وہ مغرب کی طرف روانہ ہونے والا تھا جب قاہرہ میں اسے اطلاع ملی کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ واپس لوٹا اور وہاں سے ایران چلا گیا۔ نیشا پور میں اس نے اپنے ایک دوست سے سنا کہ اہل سیف کے ساتھ ساتھ اہل علم بھی اب ایک نئے ملک کا رخ کر رہے ہیں جس کا نام ہند ہے۔ کمال نے اپنی محبوب کتابیں اپنے ساتھ لیں اور وسط ایشیا، کشمیر اور لاہور سے ہوتا ہوا تغلق آباد پہنچا۔

دنیا عجیب ہنگاموں کے دور سے گزر رہی تھی بلکہ کمال کو تو یاد تھا کہ تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جب بے چارے انسان پہ کوئی نہ کوئی قیامت نہ گزری ہو۔ پچھلی صدیوں میں تاتاریوں کی یلغار نے ملکوں کو تہ و بالا کر دیا۔ عیسائی سطوریوں اور ایران کے آتش پرستوں اور اندلس کے یہودیوں اور عرب کے مسلمانوں نے مل جل کر علم کا جو دھوم دھام سے چراغاں منایا تھا وہ صحرائے گوبی سے اٹھنے والی زرد آندھیوں نے سارا کا سارا بجھا کر رکھ دیا۔ بنو امیہ کا دمشق، بنو عباس کا بغداد، عبدالرحمٰن کا اشبیلیہ۔ آنکھوں کے سامنے کیسی کیسی تصویریں کھنچتی تھیں۔ اس

قیامت کے بعد بچا کھچا علم جو باقی رہا تھا وہ مسلمان اقوام کی آپس کی تفرقہ اندازیوں اور تنازعوں کی نذر ہوا۔ خیالات کا ایتھنز، جسے دوبارہ آباد کیا گیا تھا، بغداد کے ساتھ ساتھ اجڑا۔ اسکندریہ کی خانقاہیں سنسان ہوئیں، صرف ایک خیال باقی رہا۔ دنیا ناپائدار ہے، دنیا فانی ہے، دنیا قابل نفرت ہے۔ فلسفہ اب محض شیعوں کا پیشہ سمجھا جاتا تھا اور شیعہ ہمیشہ بڑی گڑ بڑ پھیلاتے تھے، ہر قسم کی نظریاتی اور سیاسی فتنہ پردازی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔

اب سلجوقی ترکوں کا دور دورہ تھا۔ ان جہانبانوں کو نت نئے ملک تسخیر کرنے سے ہی کہاں فرصت تھی کہ وہ فلسفے کی ریشہ دوانیوں میں اپنا سر کھپاتے اور بہر حال وہ بھی راسخ العقیدہ کٹر سنی مسلمان تھے، عجمی شیعوں کی طرح بدعتی تھوڑا ہی تھے۔

عربوں کا ذہن، ایرانیوں کے فنون لطیفہ، تاتاریوں کے حملے سے سب کا خاتمہ بالخیر ہو چکا تھا مگر اس کے ایک سو سال بعد سمرقند اور ہرات میں پھر روشنی ہوئی۔ مصوری میں چین اور ایران کے نقوش ہم آہنگ ہوئے۔ یہ تخریب پسند تاتاری مغرب میں مسلمان ہوئے مشرق میں انہوں نے بدھ مذہب اختیار کیا۔ سبکتگین کے دور میں کابل کے ہندو ترکی شاہیہ بادشاہ مسلمان ترکوں میں تبدیل ہوئے۔

گو انسان کو اب بھی چین نصیب نہیں تھا۔ محمود کے متعلق البیرونی نے کہا کہ ہندو اس حملے سے ریت کے ذروں کی طرح بکھر گئے۔ ان کی کہانی داستان پارینہ میں شامل ہو چکی ہے، جو باقی ہیں وہ مسلمانوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔

جس طرح بغداد اور اسکندریہ تباہ ہوا تھا اسی طرح متھرا اجڑا اور نالندہ، قنوج

اوراجین۔ یہ سب انسانوں کی بستیاں تھیں جن میں عام مرد اور عورتیں رہتے تھے اور جنھوں نے ان کو ختم کیا وہ بھی عام انسان تھے۔

مگر اس افراتفری، اس قتل و غارت، ان جنگوں اور معرکوں کے گرد و غبار کے پیچھے علم کے چراغ ٹمٹماتے رہے، کتابیں لکھی جاتی رہیں۔ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ انسانیت کا چراغ کبھی نہ بجھ سکا!

اور اسی خونریز دور میں جنوب کے پرسکون ساحلوں پر خوبصورت کلیسا تعمیر کیے جا رہے تھے اور یہودیوں اور عیسائیوں کی شاداب بستیوں میں پھولوں کے تہوار منائے جاتے تھے اور عرب تاجروں کی آبادیوں میں رات کے وقت قانون، عود، نے اور نفیر کی آوازیں بلند ہوتی تھیں اور مہابلی پورم کے مندروں میں رقص ہوتا تھا۔

یہ لوگ بھی عام انسان تھے مگر امن سے رہنا جانتے تھے۔

انتشار اور بدامنی کے اس دور میں صوفیوں کی خانقاہوں میں علم محفوظ رہا اور خرقہ پوش قلندر اب ایک ایک کر کے اس نئے ملک کی طرف آ چکے تھے اور آ رہے تھے جسے محمود نے تسخیر کیا تھا۔ ان قلندروں نے بنگال، بہار، اودھ، راجستھان، دکن اور گجرات، سندھ اور پنجاب میں نئے ویہار آباد کیے۔

محمود یہ نہ جانتا تھا کہ خیالات کے صنم خانے ہمیشہ آباد رہیں گے۔ دنیا کا نقشہ بدل چکا تھا۔ قرطبہ کی مسجد میں عیسیٰ ابن مریم کے مجسمے سجا دیے گئے تھے۔ قسطنطنیہ کے کلیسائے صوفیہ کے میناروں سے اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ تموچن کا پوتا، ترچھی آنکھوں اور پیلی رنگت والا چغتائی ترک، دلی کو تہس نہس کر کے سمرقند واپس

جا چکا تھا۔

شرقیہ سلطنت ہند میں تہذیب کا عظیم الشان مرکز بنی ہوئی تھی۔ جونپور شیراز ہند کہلا رہا تھا۔ اس سلطنت کو قائم ہوئے ابھی فقط ستر سال گزرے تھے۔ صاحبقراں کے حملے کے بعد کی گڑبڑ سے فائدہ اٹھا کر ملک الشرق خواجہ جہاں نے اس کی بنیاد ڈالی تھی، اس کے سلاطین اپنے آپ کو غیر ملکی نہیں گردانتے تھے۔ دکن کی بادشاہتوں کی مانند ان کی حکومت بھی خالص ہندی حکومت تھی، انہوں نے خوبصورت عمارتیں بنائی تھیں، گلاب کے باغ لگائے تھے۔ دور دور سے اہل علم آ کر جونپور میں جمع ہو رہے تھے۔

ابوالمنصور کمال الدین نے بھی دلی میں چند روز ٹھہرنے کے بعد جونپور آ کر دم لیا۔

اس کے سامنے ایک بالکل نئی عجیب و غریب دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ جونپور، کاشی، ایودھیا اور بہرائچ اور ان سب جگہوں کے مسلمان ان سے بالکل مختلف تھے۔ یہ لوگ جو بت پرستوں کے طریقے سے رہتے سہتے تھے۔ پشمین پوشوں اور جوگیوں کے ساتھ درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر گیت گاتے اور جھومتے تھے۔ ان کی عورتیں عبائیں پہننے کے بجائے عجیب طویل سی سفید یا رنگین چادر جسم سے لپیٹ لیتی تھیں اور ان کی آنکھوں میں بڑی حیا تھی۔

پچھلے چند سال سے اس کی زندگی سلطان حسین شاہ کے ساتھ یا میدان جنگ میں کٹتی تھی یا محفل چنگ و رباب میں۔ کتابیں اس کا اوڑھنا بچھونا تھیں لیکن حال و قال سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے امام غزالی اور ابن رشد دونوں کو اپنے

اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا اور مسلسل خانہ جنگیوں، بغاوتوں، سیاسی شورشوں اور بدامنیوں کے باوجود، کہ یہ ہنگامے زندگی کا لازمی جزو تھے، وہ ناامید نہیں تھا، وہ ہر شے کو استعجاب سے دیکھتا۔ وہ بہت سے ملک گھوم چکا تھا۔ ہند میں آ کر بھی اس نے اپنے سیاہ گھوڑے پر بڑی دور دور تک سیاحت کی تھی۔ ناموں میں، جگہوں میں، انسانوں میں جو اسرار تھا اس نے اس کو بہت مسحور رکھا۔ شیراز اور بدخشاں کے لالہ زار، کاشغر، یارقند اور بخارا کی گلیاں جن کی دیواروں پر چینی گلابوں کی بیلیں جھکی ہوئی تھیں اور جہاں ترچھی آنکھوں اور لمبی لمبی چوٹیوں والی لڑکیاں رقص کرتی تھیں اور دریائے جیحوں کا ساحل اور سنہرے بالوں والے ترکمانوں کی خیمہ گاہیں۔ شمال مغرب کے کوہستان جہاں یونانیوں، سیتانیوں، ترکوں، چینیوں اور ایرانیوں نے مل جل کر سنگتراشی کی ایک نئی دنیا آباد کی تھی اور پھر ہند کے جنوب میں مہاندی کے سرسبز کنارے اور آندھرا دیس، اور کیرالا، ٹامل ناڈو اور کورومنڈل کی ہری گھاٹیاں اور سلطنت وجے نگر کے خوبصورت باغات اور لرزہ خیز مندر جن کے آنگنوں میں تاڑ کے درختوں کے نیچے بادامی آنکھوں والی دیوداسیاں ہیرے کی لونگیں پہنے بھرت ناٹیم ناچتی تھیں۔

خداوندا! کیسے کیسے لوگ تھے، کیسی کیسی قومیں! دنیا کتنی عجیب، کتنی دلکش، کتنی خوفناک، کتنی قابل قدر چیز تھی۔

ہند کتنا حسین ملک تھا۔

لیکن یہ بہر حال اس کا وطن نہیں تھا۔

اور گو اس کے بہت سے حصوں پر مسلمانوں کی حکومتیں قائم تھیں لیکن بہر حال

یہ مجموعی طور پر دارالحرب تھا کیونکہ کافروں کی یہ بڑی زبردست آماجگاہ تھی۔

اور اگر یہ دارالحرب نہ بھی ہوتا تب بھی اس کا وطن نہیں تھا۔ یہ سامنے لہریں مارتی ہوئی سرجو بھلا دجلے کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی۔ آم کے سائے میں وہ سکون میسر نہیں جو کسی نخلستان میں چشمے کے کنارے کھجور کے تلے بیٹھ کر الفارابی کے نظریات پڑھنے میں حاصل ہوتا تھا۔

گو آم بھی اپنی جگہ پر خوب درخت ہے۔

غریب الوطنی کے احساس نے اسے بہت رنجیدہ کیا، اس نے کھنڈر کے ستون سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں یہاں سے آخر واپس کیوں نہیں چلا جاتا۔ اس نے طے کیا کہ وہ جونپور واپس جا کر سلطان سے معذرت چاہے گا اور دمشق لوٹ جائے گا۔ دمشق؟ اسے یکلخت یہ نام بھی بے حد اجنبی سا لگا، وہ دمشق جا کر کیا کرے گا؟ نیشا پور میں اس کا کیا رکھا ہے؟ بغداد کو اس سے اب کیا واسطہ؟ یہ سوچ کر بھی اسے بڑا دکھ ہوا۔

اور اس قدر بے تکے لوگوں سے اس کا سابقہ پڑا ہے۔ اس نے ایک آنکھ کھول کر اس کسان کو دیکھا جو انگوچھا سر پر لپیٹے زور زور سے بارہ ماسا الاپتا بستی کی اور لپکا جا رہا تھا۔

وہ جس کے پس منظر میں سارا عبرانی تمدن تھا اور کلدانیوں اور قبطیوں اور اسوریہ والوں کی روایات اور یونان تھا اور روم، اور مقدس سلطنت روم کی مشرقی مملکت جسے ورثے میں ملی تھی، اور عجم کے گلستان، اور نیل کے ساحل اور مغرب کے لامحدود پہاڑی سلسلے، وہ ایک بالکل مختلف کائنات تھی اور اس کائنات سے اس

کا کوئی تعلق نہ تھا جس میں سنا تھا کہ جوگی ہوا میں اڑتے تھے اور جہاں کامروپ کی ساحرائیں آدمیوں کو بکرا بنا دیتی تھیں اور جہاں بنگال اور بہار کے تانترک معبدوں میں لرزہ خیز جادو ٹونے ہوتے تھے اور جہاں گورکھ ناتھ کے چیلوں کے گورکھ دھندے عقل کو چکرا دیتے تھے۔

لیکن ابو ریحان البیرونی نے اس ملک کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے تھے اور ضیاء الدین برنی کی تاریخ کمال نے پڑھ رکھی تھی جو فیروز شاہ کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔ غزنی اور ہرات میں یہاں کی دولت کے متعلق کیسی کیسی حکایات مشہور تھیں اور کتنی عجیب بات تھی کہ فلک کی گردش نے اسے واقعی اس بے تکے ملک میں لا ڈالا تھا جہاں یہ سارے روایتی ہیرے جواہرات وہ دن رات اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا، اس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے درباروں کی جگمگاہٹ کا نظارہ کیا تھا۔ اس نے اس دیس کی حسین مہ جبین عورتوں کو دیکھا تھا جو چلتی تھیں تو ان کے پاؤں کے زیور چھن چھن بولتے تھے۔ اس نے یہاں کی عجیب مدہوش کن موسیقی سنی تھی۔ غیر ملکی سیاحوں نے یہاں سے لوٹ کر بغداد میں اس سے تذکرہ کیا تھا کہ یہاں کے مرد شراب نہیں پیتے اور عورتیں وفادار ہوتی ہیں۔

عورتوں کی وفاداری سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جس دنیا سے نکل کر وہ آیا تھا، جس دنیا میں وہ رہتا تھا، اس میں عورت اسی وقت داخل ہو سکتی تھی جب خود اسے عورت کی رفاقت کی ضرورت محسوس ہو۔ عورت کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ اس سے کسی قسم کی رفاقت کا مطالبہ کر سکے۔ عورت کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

کمال نے عورت کو ہر روپ میں دیکھا تھا۔ سمرقند اور قاہرہ کے بازاروں میں

بکنے والی کنیزیں، مالِ غنیمت کے طور پر حاصل کی ہوئی لڑکیاں، سلاطین کی حرم سراؤں میں مقید مہ جبینیں۔ عورت جو ہمیشہ ہر حالت میں مرد کی جائیداد تھی، اس کے رحم وکرم پر زندی تھی۔ اس کی خوشنودی کے لیے جس کی تخلیق کی گئی تھی۔ اس کی اپنی کوئی رائے نہ تھی، کوئی تمنائیں، کوئی زندگی۔

مگر بہر حال خداوند تعالٰی کی یہ مخلوق بہت دلچسپ چیز تھی۔ ایک حد تک زندگی میں اس کی اہمیت بھی تھی، مگر اس کے آگے اور بہت سی دنیائیں تھیں جن میں پہنچ کر عورتوں کا ساتھ چھوٹ جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ذہن کی دنیا، روح کی دنیا۔ گو جذبات کی دنیا میں ایک حد تک کمال اسے شریک کرنے کے لیے تیار تھا مگر کسی گہرے جذباتی تجربے میں کسی عورت نے اب تک اس کی رفاقت نہیں کی تھی کیونکہ دراصل یہ محض اس کا حق تھا کہ وہ مختلف عورتوں کو پسند کرے، وقتاً فوقتاً ان سے محبت کرتا رہے۔ اس کی محبوبہ کو یہ حق کہاں سے پہنچتا تھا کہ وہ بھی اس سے وفا کا مطالبہ کرے۔ اس کا تو صرف یہی کام تھا کہ گڑیا کی طرح سجی بنی بیٹھی رہے۔ کمال جس زبان میں شاعری کرتا تھا اس کی روایت تھی کہ شجاع سورما اپنی محبوبہ کے لیے جان پر کھیل جاتے تھے۔ یہ بڑا دل آویز تصور تھا۔ غزالی آنکھوں والی شہزادی سرخ گلاب کا پھول ہاتھ میں لیے الکبیر کے کنارے محل کے جھروکے میں بیٹھی ہے۔ جھروکے کے نیچے سورما شاعر رباب بجا بجا کر اسے اپنے خطرناک عشق کے نغمے سنا رہا ہے۔۔ یہ نغمے جو چاندنی راتوں میں وادیوں اور پہاڑی راستوں پر گونجتے تھے اور جن کی گونج فرانس اور الپس کے اس پار تک پھیل چکی تھی۔۔سورما شاعر محبوبہ کو اونچے سے ستون پر بٹھا کر اس کی پرستش کرتا تھا اور جب چاہتا تھا

اسے اس ستون پر سے اتار دیتا تھا۔

اس اجنبی بے تکے ملک میں آن کر اس نے خدا کی خوبصورت بے زبان مخلوق کو ایک نئے روپ میں دیکھا: وہ تو خود ہاتھ میں رباب لیے محبت کے نغمے الاپ رہی تھی، رادھا بن کر کرشن کی پرستش کرتی تھی، لیکن یہ پرستش اتنی عظیم چیز تھی کہ اس کے قابل بننے کے لیے کرشن کو خدا کا درجہ حاصل کرنا پڑا تھا، وہ ہنستے ہنستے آگ کے شعلوں میں بھی کود جاتی تھی۔۔ اس کی وفا شعاری کی قسمیں بڑے بڑے ولی اللہ کھاتے تھے۔

کمال چپ چاپ کھنڈر کی سیڑھیوں پر بیٹھا سامنے کی اور دیکھتا رہا، اسے وہ سارے نغمے یاد آئے جو چند روز پہلے ایودھیا میں چمپا نے اسے سنائے تھے۔ یہ نغمے بھجن کہلاتے تھے اور کرشن اور رام کی بھگتی کا ان میں تذکرہ تھا اور ان سے زیادہ سرشاری کی کیفیت اس نے پہلے کبھی کسی زبان کی شاعری میں نہیں دیکھی تھی۔ پچھلے تین سال میں اس نے جونپور کے شاہی کتب خانے میں رہ کر اس ملک کی مختلف بولیاں سیکھی تھیں۔ اسے اپنے ہفت زبان ہونے پر بڑا ناز تھا مگر وہ ان لوگوں کے دل کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ یہ بڑے عجیب لوگ تھے۔ بڑے انوکھے مرد اور عورتیں تھیں۔ ان کی تاریخ، ان کی روایات، ان کے فلسفہ کائنات کو سمجھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

وہ اجنبی، اس پرائے دیس میں، سرد غیر مانوس پتھروں پر بیٹھا رات کے سایوں کو دیکھا کیا۔

۳۰

مدھم سی روشنی سارے میں پھیل گئی۔

پورنیما کا چاند کھنڈر کی ٹوٹی ہوئی چھت میں سے نیچے جھانک رہا تھا اور اس کی کرنوں نے سنگ سرخ کے شکستہ فرش پر عجیب عجیب زاویے بنا دیے تھے۔ فرش پر طرح طرح کے مبہم نقش و نگار بنے تھے جن کو سینکڑوں برساتوں نے مٹا کر بے حد مدھم کر دیا تھا۔۔ یہ ترشول، اور زندگی کا درخت، اور زمین کا کنول اور کائنات کا پہیہ اور کنول کا سنگھاسن، اور آگ کا ستون۔ جانے ان انوکھی علامتوں کا کیا مطلب ان لوگوں کے ذہن میں رہا ہوگا۔ معنی کیا ہوتے ہیں؟ کمال حیرت سے ان نقوش کو دیکھ کر سوچتا رہا۔۔ باہر مہوے کے باغ پر ہولناک، ہلاکت خیز سناٹا منڈلا رہا تھا۔

اور پھر اس سناٹے میں عجیب و غریب آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ ایسا لگا جیسے تاریک ویران گلی میں سے بھاری بھاری رتھ گزر رہے ہیں اور ان رتھوں پر زرتار چھتروں کے نیچے، کانوں میں سونے کے کنڈل اور دوشالے اوڑھے اجنبی انسان بیٹھے اسے جھانک رہے ہیں۔ اندھیرے میں ان کی آنکھیں فاسفورس کی طرح چمک رہی تھیں اور وہ بڑے خوفناک طریقے سے ہنستے تھے۔ اس کا منہ چڑاتے ہوئے گویا کہتے ہوں، دیکھو جس طرح ہم ختم ہوئے ہیں تم بھی نیست و نابود کر دیئے جاؤ گے۔ اس کے سامنے ٹوٹے ہوئے دروازے میں چندر گپت نری چندر کھڑا تھا۔ انسانوں کا چاند، ہند کا سمراٹ، مگر وہ یہاں کہاں سے آیا؟ کمال

نے لاحول پڑھی، وہ تو عیسیٰ کے پیدا ہونے سے تین سو سال پہلے ہی جہنم واصل ہوا تھا۔ کم بخت نے آخر دنوں میں جین سنیاسی بن کر اپنے آپ کو فاقے دے دے کر مار ڈالا، مگر وہ تو وہاں موجود کھڑا مسکرا رہا تھا، پھر اس کے پیچھے سے ایک اور آدمی نے اپنا سر نکالا اور بندر کی طرح کود کر اس کے سامنے آ گیا اور مخاطب کیا۔۔۔ دیکھو میرا نام اشوک ہے۔ اشوک پریہ درشن۔ میں سارے بھارت ورش کا شہنشاہ تھا اور جب میں مرا تو صرف ڈیڑھ آنولے کا مالک تھا، اس نے مٹھی کھول کر آدھا آنولہ نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا۔

اس کے بعد ان پلید روحوں کی یلغار شروع ہوگئی، وہ رتھوں سے اتر اتر کر سارے میں پھیل گئے۔ بندروں کی طرح شہتیروں سے لٹک گئے، ستونوں پر جا چڑھے، آنگن کے خشک حوض میں قلابازیاں کھانے لگے۔ ان سب نے مل کر باریک آواز میں کووں کی طرح کائیں کائیں شروع کر دی، وہ سب کمال کے چاروں طرف ناچ ناچ کر ایک ساتھ چلا رہے تھے:

میں بھرت منی ہوں۔ میں نے رقص اور تمثیل کے قوانین بنائے تھے۔
میں ٹکشلا کا وشنو گپتا ہوں، میں نے ارتھ شاستر لکھی تھی۔
میں راجہ بھوج ہوں۔
میں محض گنگوا تیلی ہوں۔
اندھیرے آسمان پر بادل گرج رہے ہیں، میں کالی داس ہوں۔
میں قنوج کا راج شیکھر ہوں۔
مجھے بھبھوتی کہتے ہیں۔ میں کانیا کبج میں رہتا تھا۔ میں نے ''مالتی مادھو'' لکھا

تھا۔

میں بھرتری ہری ہوں، میں نے کہا تھا نا کہ دنیا میں محض ایک رنگ بھومی ہے اور ہم سب اداکار ہیں۔تم نٹ ہو، میں نٹ ہوں، ہم سب نٹ ہیں۔

مٹی کی گاڑی ہانکتا ہوا شدرک (ڈرامہ ''مٹی کی گاڑی'' کا مصنف) صحن سے باہر چلا گیا۔

پھر چھن چھن کرتی بہت سی چھل پائیاں ایک قطار میں آن کھڑی ہوگئیں اور اٹھلانے لگیں۔

ہم کشمیر، اڑیسہ اور آندھرا پردیش کی رانیاں ہیں جو بڑی شان سے خود حکومت کرتے تھے۔

میں شہزادی راجیشری ہوں، میں نے اپنی بحثوں سے چین کے عالموں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔

میں کمار دیوی ہوں۔

میرا نام پربھاوتی تھا۔ہائے تم مجھ کو بھی نہیں جانتے؟

میرا نام ہرش نے رتناولی رکھا تھا۔ بے چارہ ہرش۔۔۔

اپنا ذکر سن کر ہرش وردھن نے، جو کان میں قلم اڑسے اب تک مراقبے میں محو تھا، زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ ہم سری پرتھوی ولبھ کہلاتے تھے۔ اس نے مقرر کی طرح ہاتھ ہوا میں بلند کر کے کہا۔

ہم جو گویا دھن اور دھرتی کی دیویوں کے چہیتے تھے اور ہم سب کو ملیچھ ترکوں نے آ کر ٹھکانے لگا دیا۔۔ٹھکانے لگا دیا۔۔ٹھکانے لگا دیا۔

اب بڑے زور سے تلواروں کی جھنکار گونجی اور ان کی چمک سے نیم تاریکی میں اجالا سا ہو گیا اور سر کٹ کٹ کر چاروں طرف گرنے لگے۔ ہم چند یلے راجپوت ہیں، ہم بھگیلے ہیں، ہم پر مارسورما ہیں، ہم راٹھور ہیں، ہم چوہان ہیں، ہم آلہا ہیں، ہم اوول ہیں۔

سب نے ایک ٹانگ پر کودکود کرنا چنا شروع کر دیا۔ وہ سب چیخ چیخ کر آلہا اوول گا رہے تھے، اس قدر غل مچا کہ ابوالمنصور کمال الدین کا دماغ چکرا گیا، وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ افق پر صبح کی سپیدی نمودار ہو چکی تھی اور باہر مہوے کے باغ میں چند کسان آلہا اوول گاتے ہل کندھوں پر اٹھائے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔

اس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا اور اسے یاد نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔

یہ بہرائچ تھا اور وہ بت پرستوں کے زمانے کے ایک کھنڈر میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کا شام کرن گھوڑا باہر ایک ستون سے بندھا ہنہنا رہا تھا اور بارش جھکی کھڑی تھی اور بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔

اس نے دوبارہ لاحول پڑھی اور انگڑائی لے کر اٹھا اور فجر کی نماز پڑھنے کے ارادے سے آہستہ آہستہ قدم رکھتا ندی کی اور چل دیا۔

۲۱

دن بھر پنڈتوں کے ساتھ تانبے پتروں پر سر کھپانے کے بعد کمال مٹھ کے باہر

گھاس پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کل صبح سویرے وہ ایودھیا کی طرف واپس لوٹ جائے گا۔ معاً بارش کا قطرہ اس کے چہرے پر آن گرا، اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ افق پر گھنگھور گھٹائیں امنڈ کر اٹھی تھیں۔ بہت جلد ندیاں نالے چڑھ جائیں گے۔ مینڈک ٹرائیں گے، جل تھل ایک ہوگا۔ کمال نے ایک چھپر کے نیچے جا کر پٹکا کھولا اور کچے فرش پر لیٹ گیا، پھر اس نے ایک زوردار انگڑائی لی۔ مدتوں بعد یہ پہلا موقعہ تھا جب کمال کو لگا تار تین چار مہینے بعد اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا۔ شرقی سلاطین کی دلی کے بادشاہوں سے مستقل جنگیں چھڑی رہتی تھیں۔ کمال کو کوئی دن ایسا یاد نہ تھا جب کسی نہ کسی نئے معرکے کی وجہ سے اس کے کتب خانے کے کام میں خلل نہ پڑتا ہو۔ پہلے سلطان محمد شاہ اور اس کے بھائی شاہزادہ حسین میں جنگ ہوئی، پھر شہزادہ حسین نے جونپور کا سلطان بن کر خود دلی پر چڑھائی کر دی۔ ان معرکوں میں کمال سلطان کے ساتھ کالپی اور اٹاوے اور سنبھل میں مارا مارا پھرتا۔ مہینوں اس نے بدایوں، کویل، مارہرہ، شمس آباد اور برن کی خاک چھانی۔

برکھا شروع ہوچکی تھی، ندیوں اور جھیلوں پر بارش کی بوندوں کی ہلکی ہلکی دھند چھا رہی تھی۔ بہرائچ ک پورب میں راپتی بہتی تھی۔ پچھم میں سرجو رواں تھی۔ یہ دونوں ندیاں بڑی دور نیپال دیس سے نکل آئی تھیں اور کس بے پروائی سے اپنی منزل کی طرف رواں تھیں۔ یہ سامنے والی سرجو، جو بت پرستوں کی نظروں میں بڑی مقدس تھی، (یہ دریاؤں کا مقدس ہونا کمال کی سمجھ میں نہ آیا!) اسی طرح گاتی گنگناتی کچھ آگے جا کر گھاگھرا سے مل جاتی تھی اور گھاگھرا کے کنارے ایودھیا

آباد تھا جہاں چمپاوتی رہتی تھی اور بارش ہورہی تھی اور اس وقت وہ اسی سرجوندی کے کنارے کہیں کسی درخت میں جھولا جھولتی اور ساون گاتی ہوگی کیونکہ کمال کو اچانک خیال آیا کہ لو ساون کا مہینہ آن پہنچا۔ یہ موسموں کا سحر۔ ہر مہینے کے نام کے ساتھ اس کی اپنی کیفیت تھی۔ اس مناظر، اپنے رنگ، اپنے راگ۔ چند ماہ قبل ویساکھ تھی۔ سارے میں بسنت رت چھائی تھی، پھر جیٹھ اور اساڑھ کا مہینہ آیا جب مہوا کے باغ میں لوئیں چلتی تھیں اور بیل درختوں سے ٹپ ٹپ گرتے تھے، پھر بھادوں آئے گا، پھر کوار اور کاتک جب اداس چاندنی خنک زرد رنگ سارے میں گھول دے گی۔

یہ اس کا وطن نہیں مگر وہ کم از کم موسموں کے سحر سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔

اس نے پگڑی سر کے نیچے رکھ کر کروٹ بدلی اور معاً چمٹا بجنے کی آواز اس کے کان میں آئی، اس نے کاہلی سے آنکھ کھول کر دیکھا ایک سادھو بارش سے بچنے کی خاطر چھپر میں آن بیٹھا تھا اور بڑے اطمینان سے دھونی رمانے میں مشغول تھا۔ کمال کی موجودگی کی اس نے کوئی پروانہیں کی اور اپنی کھٹر پٹر میں لگا رہا۔ کمال اٹھ بیٹھا اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

یہ موسم کا اثر تھا، وہ چاہ رہا تھا کہ ساری دنیا کو، ان عجیب سادھوؤں کو، ان موروں کو گلہریوں کو، ان چرواہوں کو، جو جلدی جلدی قدم اٹھاتے جنگل میں سے گزر رہے تھے، ان سب کو گلے سے لگا لے۔ خوب چلا چلا کر ساون گائے۔ دنیا کتنی پر سکون، کتنی آرام دہ تھی، وہ طوطے، یہ سادھو، وہ کسان جو مینہ سے پناہ لینے کے لیے بھاگے بھاگے چھپر کی اور آرہے تھے۔ یہ سب اس کے دوست تھے، اس

کے لیے تھے، وہ ان سے علیحدہ کب تھا؟ ''جے رام جی کی۔۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ اسے اپنی آواز سن کر، اپنی زبان سے یہ الفاظ نکلتے پا کر خود بڑا تعجب ہوا۔

سادھو نے مسکرا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ ''جے رام جی کی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کھو سپاہی۔۔کہاں سے آنا ہوا۔۔''

''میں۔۔سپاہی نہیں ہوں۔''

''سلطان کے آدمی تو ہو۔۔''

''ہاں۔۔مگر میں کتابیں لکھتا ہوں۔''

''اچھا۔۔'' سادھو نے اسی اطمینان سے جواب دیا اور پھر چمٹا اٹھا کر رام نام کا ورد شروع کر دیا۔ گویا کمال کے ساتھ اس کا یہ مکالمہ بالکل ضمنی تھا۔

''بابا۔۔تم یہیں رہتے ہو۔۔'' کمال نے پھر بات شروع کی۔

''نہیں۔ہم جونپور کے رہنے والے ہیں۔''

''ارے!'' کمال نے بے اختیار ہو کر خوشی سے کہا، ''تب تو تم میرے ہم وطن ہو۔۔''

دوسرے لمحے اسے اپنے اس انجانے جذبہ مسرت پر بڑا تعجب ہوا۔ ہم وطن؟ مگر جونپور اس کا وطن کہاں تھا؟ وہ تو بغداد کا باشندہ تھا۔۔۔ اسے سخت جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی۔

''نرگن رام۔۔نرگن رام جپو رے بھائی۔'' سادھو آنکھ بند کیے یکسانیت کے ساتھ رٹ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کمال کو خود ہی مخاطب کیا: ''آج کچھ قلندر بالے میاں کے مزار کے لیے جھنڈے لے کر راپڑ سے ادھر آئے ہیں۔''

''اچھا۔۔''

''وہ کہتے تھے کہ ہمارے سلطان اور دلی والے میں پھر ٹھن گئی۔۔۔اب کی دفعے ہمارا سلطان بچتا نظر نہیں آتا۔۔مقابلہ بڑا کٹھن ہے۔۔نرگن رام۔۔۔نرگن رام۔''اس نے پھر ٹرانا شروع کر دیا۔

کمال چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اور سادھو کے قریب گیا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟۔۔۔بابا پھر سے بتانا۔''

چھپر میں سات آٹھ کسان جمع ہو چکے تھے اور ان سب نے مل کر سادھو کے ساتھ رام نام کی رٹ لگانا شروع کر دی تھی۔کمال کے سوال کا کسی نے جواب نہ دیا۔

وہ جلدی سے پٹکا کمر سے باندھ کر برستی بارش میں باہر نکلا اور سرائے کی طرف روانہ ہو گیا۔

سرائے کے برآمدے میں اودے سنگھ راٹھور اس کا منتظر تھا۔

''تم۔۔تم یہاں کہاں۔۔''کمال نے بھونچکا ہو کر اسے دیکھا۔''تم تو گوالیر میں تھے۔''

''میں گوالیر ہی سے آ رہا ہوں،میرے ساتھ چلو۔۔۔عالم پناہ نے تمہاری کھوج میں مجھے بھیجا ہے۔''

''مجھے کھوجنے اتنی دور آئے ہو،میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔''

''عالم پناہ بھی یہیں بہرائچ میں موجود ہیں اس وقت۔۔۔''اودے سنگھ نے کہا،تم یہاں گیان دھیان میں لگے ہو،ادھر دنیا بدل چکی ہے۔۔سلطان بہلول

نے تمہارے مالک پر راپڑی میں حملہ کر دیا۔ آؤ، یہاں بیٹھ جائیں تو میں تم کو سارا ماجرا سناتا ہوں۔'' وہ بڑے اطمینان سے کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ ''جب اس پر حملہ ہوا تب وہ جمناجی پار کر کے ہمارے راجا سے مدد لینے کے لیے گوالیر آیا، ہمارے راجا نے اسے کمک پہنچائی۔ میں اس کی فوجوں کو لے کر کالپی کی اور بڑھا۔۔ گھمسان کا رن پڑا۔'' اودے سنگھ نے خالص فوجیوں والی تفصیل سے سنانا شروع کیا، پھر وہ جھک کر تنکے سے برآمدے کے کچے فرش پر نقشہ بنا کر کمال کو سمجھانے میں منہمک ہو گیا۔ ''یہ دیکھو۔۔ ادھر بہلول کی فوجیں ہیں ادھر ہم ہیں۔ بیچ میں جمنا میا ہیں۔ اب نہ ہم ندی پار کر سکتے ہیں نہ وہ۔۔۔ سے بیتتا جاتا ہے۔ تب ایک دن کیا ہوتا ہے کہ ترلوک چند سلطان بہلول کو ندی پار کروا دیتا ہے۔۔'' پھر وہ ٹھٹھک گیا۔

''ترلوک چند کو جانتے ہو؟''

''نہیں۔''

''بکسر کا حاکم ہے۔۔۔ بکسر گئے ہو؟''

''نہیں۔'' کمال جھلا گیا۔ ''اصل واقعہ بیان کرو۔''

''ہوتا کیا۔۔ دلی کی فوجیں برابر ہمارا پیچھا کرتی رہیں، ہم جونپور کی طرف لوٹے، وہاں بھی دلی والوں نے ہمارا مقابلہ کیا۔ ہم جونپور کو خدا حافظ کہہ کر بہرائچ آ گئے۔ تمہارا جونپور اب سنسان پڑا ہے۔ اس میں دن کے وقت الو بولتے ہیں۔ چلو میرے ساتھ۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''عالم پناہ نے کہا تھا تم کئی مہینے سے یہاں ہو۔۔ صبح سے تم کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ مٹھ کے پنڈتوں سے تمہارا ٹھکانہ معلوم ہوا۔''

کمال نے تلوار کمر سے باندھی اور راود ھے سنگھ کے ہمراہ لشکر کی سمت روانہ ہو گیا جو راپتی کے کنارے ٹھہرا ہوا تھا۔

ادھر جدھر جیت ون تھا۔

۲۲

بہرائچ سے وہ لوگ قنوج گئے جو کالندی اور گنگا کے سنگم پر آباد تھا، وہاں بھی انہیں بہلول لودھی سے شکست کھانا پڑی اور بالآخر سلطان حسین تھکا ہارا بہار میں پناہ گزین ہوا۔

بہار۔۔یہ ایک نیا علاقہ تھا۔ ہرا بھرا، خوبصورت، جہاں سون ندی بہتی تھی، جہاں چاندنی راتوں میں نالندہ کے دارالعلوم کے کھنڈر دل میں عجیب دہشت پیدا کرتے تھے۔ یہاں ابوالمنصور کمال الدین سلطان حسین کے دوسرے وفادار امراء اور افسروں کے ساتھ بیٹھ کر منصوبے بناتا تھا کہ جونپور کی سلطنت دوبارہ کس طرح حاصل کی جائے۔

جونپور میں اب دلی کا ایک شہزادہ تخت پر بیٹھا تھا۔ سلطنت شرقیہ کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ شیرازہند اجڑ چکا تھا۔

ابوالمنصور کمال الدین، قاضی شہاب الدین جونپوری کا جانشین، مورخ، محقق، اب سیاسی سازشوں کا بھی ماہر ہو گیا۔ دن رات وہ سلطان کے ساتھ سر جوڑے بیٹھا ترکیبیں سوچا کرتا۔۔دلی کے سلطان کو کس طرح زیر کیا جائے؟

اب سلطان بہلول مر چکا تھا اور اس کا خوبصورت اور شاندار بیٹا سکندر ہند کا بادشاہ تھا جس کی ماں کا نام ہماوتی تھا، جو شرع محمدی کا بڑا پابند تھا، جو اپنے باپ سے بھی زیادہ طاقتور بادشاہ تھا۔

بہار کے ان پناہ گزینوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر بساط جنگ پر ایک بار پھر پانسہ پھینکا۔

کیونکہ لڑنا مرنا، ہار جیت ہی مردوں کے مشاغل ہیں۔

سلطان حسین اپنی جوڑتوڑ کے ذریعے کئی بار جونپور میں باربک شاہ کے خلاف بغاوت کروا چکا تھا، اب کی مرتبہ اس نے جوکا سے مل کر ایک بڑی بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ کمال اس کا سفیر خاص تھا، دن رات وہ اپنے شیام کرن گھوڑے پر سوار ادھر سے ادھر سازشیں کرواتا تھا۔

ایک رات منزلیں مارتا وہ جوکا کے گاؤں پہنچا۔ گڑھی پر جا کر اس نے آواز دی۔ جوکا اس وقت اندر پوجا میں مصروف تھا۔ اس کا جوان بیٹا چراغ ہاتھ میں اٹھائے باہر آیا۔

''کون ہو تم؟'' اس نے شک سے پوچھا۔ باربک شاہ خود کمزور تھا لیکن جب سے اس کا بڑا بھائی سلطان سکندر دلی کے تخت پر بیٹھا تھا پرجا اپنی جان کی خیر مناتی تھی۔

''میں سلطان کے پاس سے آیا ہوں۔''

''کون سے سلطان کے پاس سے۔''

''تمہارا سلطان! حسین شاہ۔''

''آ جاؤ۔ اندر آ جاؤ بھائی۔'' نوجوان کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ چراغ کی روشنی میں کمال نے اسے دیکھا، وہ اسی کا ہم عمر رہا ہوگا، وہ سیڑھیاں اتر کر تہ خانے میں اسے لے جاتے ہوئے کہہ رہا تھا: ''میرا نام ہری شنکر ہے۔ میں جوکا کا بیٹا ہوں۔ میں سلطان کے لیے اپنی جان لڑا دوں گا۔'' وہ ایک زمین دوز کمرے میں داخل ہوئے جہاں بھوانی کی مورتی کے آگے مدھم سا دیا جل رہا تھا اور دیواروں پر ڈھالیں اور تلواریں آراستہ تھیں۔

بھوانی کی مورتی اسے بڑی ڈراؤنی معلوم ہوئی لیکن اسے اس وقت یہ احساس تھا کہ وہ بھی اب اس دیس، اس ماحول کے اسرار میں مکمل طور پر شامل ہو چکا ہے۔

''اچھا سنو۔'' اس نے تخت پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا، ''تمہارے پاس کتنے ہاتھی ہیں؟ کدھر سے حملہ کرو گے۔''

دوسرے لمحے وہ دونوں نہایت تندہی سے جنگ کا نقشہ سوچنے میں منہمک ہو گئے، ان میں سے ایک ہندو تھا دوسرا عرب اور یہ دونوں افغانوں سے لڑنے جا رہے تھے۔ ان کے درمیان قدر مشترک صرف ایک شے تھی۔۔ دو دھاری خون آشام تلوار اور ایک دوسرے فریق کو ختم کر دینا ان کا واحد مقصد حیات تھا۔

چند روز بعد انہوں نے بغاوت کا علم بلند کیا اور سلطان سکندر ان کی سرزنش کے لیے جونپور پہنچا اور حسین شرقی کو دوبارہ شکست ہوئی اور سنگیت کا رباد شاہ، جس کی آدھی عمر راگ تخلیق کرنے کے بجائے میدان کارزار میں لڑتے بھڑتے کٹی، ایک مرتبہ پھر بہار کی طرف واپس لوٹا۔

اب کمال کا جی اچاٹ ہو گیا۔

اس نے اس قدر خونریزی دیکھی تھی، اس نے اتنے انسانوں کو قتل کیا تھا، اس نے اتنی بے بس عورتوں کو دیکھا تھا۔ اس نے سلطان حسین کے دربار کے امراء کو اس حالت میں سلطان سکندر کے سامنے جاتے دیکھا تھا کہ عمامے ان کی گردنوں میں رسیوں کی طرح بندھے تھے اور وہ پا پیادہ قیدیوں کی مانند فاتح کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے۔ یہ لوگ، جو عالم، شاعر اور اہل قلم تھے، اور ان کا فاتح بھی علم دوست اور شاعر تھا، لیکن کتابیں بے کار تھیں، علم فضول تھا، فلسفے بے معنی تھے کیونکہ انسان کا خون ان سب چیزوں کے باوجود بہتا تھا۔ خداوند!۔۔۔ دکھی انسانیت کس طرح ساری کی ساری خون کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تاریخ سے اس کو جس قدر دلچسپی تھی اب اتنی ہی نفرت ہوگئی۔ اس نے سلاطین کے نسب ناموں اور ان کے ادوار اور ان کی سلطنتوں کے واقعات کو بھول جانا چاہا۔

اس نے یہ بھی فراموش کرنا چاہا کہ سلطان کی بھانجی جنگی قیدی کی حیثیت سے اب دلی میں تھی اور سلطان سکندر کے حرم میں داخل کی جا چکی ہوگی۔ اس کے دوست اودے سنگھ راٹھور نے اسے غیرت دلائی۔۔!

"کیسے بے شرم ہو، تمہاری شہزادی دلی میں ہے اور تم بہار میں چین سے بیٹھے ہو۔ اسے چھڑا کر لاؤ، جا کر سلطان سکندر کو قتل کرو یا مجھے اجازت دو میں اس کا کام تمام کردوں۔ شہزادی کو واپس لے آؤں۔" کمال یہ باتیں سنتا اور خاموش رہتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کون سا راستہ اختیار کرے۔

بہار سے غریب الوطن سلطان حسین نے بنگال کا رخ کیا۔ کمال اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ گوڑ کے سلطان حسین شاہ نے جونپور کے شکست خوردہ بادشاہ کو

اپنے یہاں پناہ دی جس کے سارے پرانے ساتھی بچھڑ چکے تھے، جس کا کتب خانہ تباہ ہوگیا تھا۔ خالی طنبورہ اب جس کا رفیق تھا۔ طنبورہ اس سے کبھی دغا نہیں کرے گا۔

اب میری روح کو کاہے کی تلاش ہے؟ گوڑ کے شاہی باغات میں بے مقصد ادھر ادھر گھومتے ہوئے کمال خود سے سوال کرتا۔ بنگالے کی لڑکیاں بے حد دلکش تھیں، یہاں کے مناظر بہت خوبصورت تھے۔ یہاں کی موسیقی بہت دلنواز تھی۔ اسے جونپور کی شاہزادی یاد نہیں آئی، اسے چمپاوتی کا خیال بھی کبھی نہ آیا۔ اسے خدا کی تلاش نہیں تھی۔ حد تو یہ تھی کہ اسے عورت کی تلاش بھی نہیں تھی۔ اس کا سارا وجود اس دہشت ناک خلاء میں ڈول رہا تھا جہاں محض عمیق سناٹا ہوتا ہے۔

اس سناٹے میں صرف ایک سوچ بار بار گونجا کرتی۔۔ میں جب تک اس چکر میں رہوں گا، مجھے دوسروں کو مارنا پڑے گا۔ دوسرے مجھے مارنے کے درپے رہیں گے۔ انسان دراصل انسان نہیں ہیں خونخوار بھیڑیے ہیں۔ انسان مجھے کہاں ملے گا۔۔؟

طرح طرح کی آوازوں نے اس سناٹے میں بہت سے بھنور پیدا کر دیے۔ میں اس سامنے والے انسان کو مار ڈالوں کیونکہ اس نے سر پر چوٹی رکھی ہے اور گائے کو پوجتا ہے اور اگر میں نے اس کو قتل کرنے میں سبقت نہیں کی تو وہ میرا کام کر دے گا کیونکہ میرے سر پر چوٹی نہیں ہے۔۔؟

خوبصورت شو پوری کی اس لیے مجھے اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہئے کیونکہ وہاں لاکھوں کروڑوں مورتیاں مندروں میں سجی ہیں، لیکن وہ مورتیاں میرا کیا

بگاڑتی ہیں؟

اگر ان مورتیوں کو میں گوارا کرتا ہوں تو کیا میں مسلمان نہیں رہا۔۔؟

اسلام کیا ہے۔۔؟

ان سوالات نے اسے دیوانہ کر دیا۔

ان سے بچنے کے لیے اس نے شراب میں پناہ لی، اس نے ملک کے سارے خطوں کی عورتیں دیکھی تھیں۔۔ خوبصورت مضبوط جسموں والی مراٹھنیں۔ گجرات اور کاٹھیاوار کی نازک اندام لڑکیاں جن کے چہروں کی رنگت کندنی تھی۔ بیجاپور کی خوش آواز طوائفیں۔ بنگالے کی جادوگرنیاں جن کی آنکھوں میں جادو تھا اور باتوں میں ٹونا، جن کے لیے مشہور تھا کہ راتوں رات درختوں پر بیٹھ کر آسام کی سمت اڑ جاتی تھیں! اور بندرابن کی شوخ وشنگ گجریاں، متھرا کی اہیرنیں، پورب کی سانولی سلونی کہارنیں۔ قنوج کے باغوں کی وہ مالینی، جس نے اسے ایک بار بیلے کے گجرے بنا کر دیے تھے۔

موسم بدلتے رہے، وہ دل کی ویرانی سے گھبرا کر راگ رنگ کی محفلوں میں شریک ہوا لیکن سارنگی کی تانت میں اسے موت کی ہچکیاں سنائی دیں۔ اس نے لکھنؤتی کی پاتروں کو ناچتے دیکھا مگر حسین رقاصاؤں کے بجائے اسے مردہ عورتیں دانت نکوستی نظر آئیں۔

طرح طرح کی آوازیں، عجیب وغریب گیتوں کے بول، مردہ زبانوں کے جملے اس کے دماغ میں ہر وقت شور مچاتے، وہ اس اندرونی شورش سے عاجز آ گیا۔ سناٹا اس قدر پرشور ہو سکتا ہے، یہ اسے معلوم نہ تھا، وہ، جو ہفت زبان تھا، اس

نے کوشش کی کہ ساری بولیاں، سارے الفاظ کسی طرح بھول جائے۔ حافظہ کس قدر اذیت دہ شے تھی!

ایک روز کسی نے چپکے سے اس کے کان میں کہا: ہیرا جنم امول تھا۔ کوڑی بدلے جائے۔ ہیرا جنم امول تھا، ہیرا جنم امول تھا، وہ جھنجھلا کر کسی دوسری رقاصہ کے یہاں جا پہنچتا۔ اس سے کہتا: گن کری چھیڑو۔ مدھو مادھوی سناؤ۔ للتا راگ الاپو، وہ طنبورہ اٹھاتی، وہ وہاں سے بھی بھاگ نکلتا۔ مغنیہ کے گیتوں کے بجائے کوئی دوسرے الفاظ اس کا تعاقب کرتے۔ سانس نقارہ کوچ کا، سانس نقارہ کوچ کا۔ باجت ہے دن رین۔ دن رین۔ دن رین۔ آخر اس نے لکھنوتی، گوڑ اور سنار گاؤں کی چہل پہل چھوڑ کر دیہات کا رخ کیا جہاں صرف گہرے رنگوں کی راجدھانی تھی اور تالابوں میں کنول کے سرخ پھول جگمگاتے تھے اور جہاں بڑ، ہل اور مولری کی چھاؤں میں ویشنو پجاری اور پجارنیں رادھا اور کرشن کی محبت کے گیت گاتے تھے۔ ویرانوں میں اسے اگلے وقتوں کے ونگا پتی اور گوڑیشور۔ مشرقی اور مغربی بنگال کے پال بادشاہ۔ بادشاہوں کے سنسان محل نظر آئے جن میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ ان کی دیواروں پر اس نے رقاصاؤں کے مجسمے دیکھے۔ ترچھی آنکھوں والی لڑکیاں جو یہاں سے مور پنکھی جہازوں پر بیٹھ کر جاوا کے شلیندر دربار میں رامائن کا سنگیت ناٹک دکھانے کے لیے جاتی تھیں۔ اس وقت ان کے خوبصورت بازوؤں اور طویل آنکھوں پر چھپکلیاں چل رہی تھیں۔ پال اور سین بادشاہوں کے محلات کے کھنڈروں کے سائے میں کوئی قدیم قبرستان تھا جس کی شکستہ دیوار کے نیچے ایک بوڑھا ہانپتا کانپتا بیٹھا کھانس رہا تھا، برابر کے

کھیت میں ہل چلایا جا رہا تھا۔ سامنے مہانند اور یا بل کھاتا بہہ رہا تھا۔ تب اچانک اس کے دماغ کا شور تھوڑا سا مدھم ہوا۔ اس بانی کا مطلب اس کی سمجھ میں تارے کی طرح روشن ہونا شروع ہوا جو مدتیں گزریں ایودھیا میں اسے کسی نے سنائی تھی۔ اس سے کسی نے کہا تھا: آج کال کے بیچ میں جنگل ہوگا باس۔ اورے اورے ہل چلیں گے، ڈھور چریں گے گھاس۔۔ ڈھور چریں گے گھاس۔ ڈھور چریں گے۔۔۔

آخر جب دل کی وحشت نے زیادہ زور باندھا تو اس نے بنگال سے نکل بھاگنے کا ارادہ کیا۔ حسین شرقی کو گوڑ میں اس طرح تنہا چھوڑ کر بھاگتے ہوئے اسے اپنے آپ سے بڑی شرم آئی۔

مگر جذبے سب اضافی ہوتے ہیں، اس نے اپنے آپ سے کہا اور ایک روز خاموشی سے شاہی محلات سے نکل کھڑا ہوا۔ گنگا کے گھاٹ پر پہنچ کر وہ ایک جہاز پر بیٹھ گیا، اسے معلوم نہیں تھا کہ جہاز کس طرف جا رہا ہے۔

دریا پر روشنیاں جگمگا اٹھیں۔ لنگر اٹھایا گیا۔ ملاح بشاش آوازوں میں گا رہے تھے۔ کمال ایک کونے میں بیٹھا رہا، وہ جہاز پریاگ جا رہا تھا۔ پریاگ جو کاشی سے آگے تھا۔ عظیم گنگا بہت دور سے بہتی ہوئی آ رہی تھی، اس کے ایک سرے پر اتھاہ سمندر تھا۔ کمال نے آنکھیں بند کرلیں، دن گزرتے گئے۔ کشتی گنگا کی سطح پر آگے بڑھتی رہی۔ مسافروں سے بھری ہوئی کشتی میں بڑی چہل پہل تھی۔ بھاگل پور کے قریب ایک گاؤں سے براتی دلہن کا سرخ ڈولا لے کر کشتی میں سوار ہوئے۔ دولہا نے زرد جوڑا پہن رکھا تھا۔ دلہن لمبا سا گھونگھٹ کاڑھے تھی۔ اس کے پیروں

میں چاندی کے بچھوے تھے اور اس کے مہندی سے رچے ہاتھوں میں چوڑیاں اور ہاتھی دانت کے کڑے کھن کھن بولتے تھے اور وہ چھکو پھکو رو رہی تھی۔ براتی ہلڑ مچا رہے تھے۔

کمال کشتی کی دیوار کے سہارے بیٹھا خالی خالی آنکھوں سے یہ سب دیکھتا رہا۔

''سنو چمپاوتی مجھ سے بیاہ کرلو۔''

''ہوں۔''

''ہوں کیا۔ میں کہتا ہوں مسلمان ہو جاؤ، عاقبت سدھر جائے گی اور اس زندگی میں مجھ ایسا دلچسپ آدمی ملے گا۔''

''رام رام۔۔کیسی باتیں کرتے ہو! میں کیوں ہونے لگی مسلمان۔ مجھے تو تمہارے مولویوں کی داڑھیوں سے ہی ڈر لگتا ہے۔ جونپور کے قاضی بن کر تم بھی یہ لمبی سی داڑھی رکھ لوگے۔۔۔!''

اب بھی وقت ہے چمپا رانی، دیکھنا کسی دن کسی سر گھٹے پنڈے کے پلے باندھ دی جاؤ گی جو عمر بھر ٹہل کروائے گا اور جب مرے گا تو اس کے پیچھے پیچھے چتا میں دھکیل دی جاؤ گی۔ کبھی اپنے اس خوفناک مستقبل پر غور کیا ہے۔؟''

''میں تو تمہارے ساتھ بھی مرنے کے لیے تیار ہوں۔تم مر کے تو دیکھو!''

''سنو چمپا، سچ مچ، مجھ سے بیاہ کرلو۔''

''کاہے اپنی ذات بگاڑتے ہو،تم سید زادے ٹھہرے۔''

''تم بھی برہمن ہو اور ویسے تمہاری ذات اور اونچی ہو جائے گی،سیدانی کہلاؤ

گی! مجھ سے بیاہ کرلونا بھئی۔''

''مگر ہم تو تم کو یونہی اپنا پتی مانتے ہیں۔''

وہ سن کر چکرا گیا۔ ''وہ کیسے۔۔۔۔'' میرا تم سے بیاہ کہاں ہوا ہے۔ یعنی کہ۔۔۔ میں۔۔ تم۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے۔۔۔'' وہ ہنستی رہی۔ ''ہم تو تم کو اپنا مالک خیال کرتے ہیں، یہ بات تم نہیں سمجھ سکتے!'' وہ اسی طرح بے فکری سے ہنسا کی۔ ہم تو صرف ایک آدمی کو اپنا پتی سمجھیں گے اور وہ آدمی تم ہو، ہمارا تمہارا تو جنم جنم کا ساتھ۔''

''جنم جنم کا ساتھ، کیا خرافات ہے۔'' کمال نے بھنا کر کہا۔ ''پھر تم نے جادو گری کی باتیں شروع کیں۔''

''اس میں جادو کیا ہے؟'' چمپا نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا کوئی لڑکی کسی آدمی کو خود سے پسند نہیں کر سکتی، ہم نے تمہیں چنا ہے اور ہم تمہارے آگے جھکتے ہیں۔''

''کیا کفر بکتی ہو، میں نعوذ باللہ کوئی خدا ہوں۔''

''ہو تو سہی، دل ہی تو خدا کو جنم دیتا ہے۔'' وہ پھر زور سے ہنسی۔

اور پھر اس نے کہا تھا: ''اچھا یہ بتاؤ تم ہم سے بڑی محبت کرتے ہونا۔''

''کرتا کیوں نہیں ہوں۔''

''تو پھر اتنی گھبراہٹ کاہے کی۔ کبیر یہ گھر ہے پریم کا، خالہ کا گھر نا نہہ۔۔۔۔ کبیر یہ گھر ہے پریم کا۔۔ کبیر یہ گھر ہے پریم کا۔'' اور وہ زور سے قہقہہ لگا کر غائب ہوگئی۔

یہ ایودھیا کا کنج نہیں تھا، گنگا کی سطح تھی۔ اس کا جہاز سکون سے لہروں کو چیرتا آگے بڑھ رہا تھا اور براتی دھاری گا رہے تھے اور لڑکیاں ہنس رہی تھیں اور دلہن رو رہی تھی، دلہن، جو گوری رنگت کی دبلی پتلی بہاری لڑکی تھی، جانے کس دیس کو جاتی تھی، کس زندگی کی طرف، کس موت کی طرف اس کا رخ تھا۔ جہاز مونگیر پہنچا۔ براتی اس کا ڈولا لے کر کنارے اتر گئے۔ گھاٹ کے ہجوم میں سرخ رنگ کا ڈولا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جہاز نے دوبارہ لنگر اٹھایا۔ گنگا کے دونوں طرف سرسبز کھیت تھے اور گاؤں اور بارونق شہر اور دنیا اپنے حال میں مگن تھی۔

پٹنے کے گھاٹ پر بہت سے مسافر اترے، بہت سے سوار ہوئے۔ نئے مسافروں میں چند امیر زادے تھے، ایک جوگیوں کا گروہ تھا۔ ایک نارنجی لباس والا بھکشو تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا۔

پٹنے کے امیر زادے دن بھر چوسر کھیلنے میں مصروف رہتے۔ کاٹھیاواڑ کے دو تاجر، جو اپنا سامان لے کر دلی جا رہے تھے، اپنے ہی کھاتے میں لگے تھے۔ جوگی رام دھن میں منہمک تھے۔ کمال کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ بھکشو نے اس کا امیرانہ لباس دیکھا اور چپ چاپ جا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد ان جوگیوں میں سے ایک کمال کے قریب سے گزرا، وہ وضع قطع سے ہندو نہیں معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کے سر پر چوٹی نہیں تھی۔

''بھائی، تم مسلمان ہو۔'' کمال نے ہمت کر کے اس سے پوچھا۔

''انسان ہوں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''میں۔ میں بھی انسان ہوں۔'' کمال نے لڑکھڑاتے ہوئے گویا اپنا تعارف کرایا۔

''کیا چاہتے ہو۔''

''یہ پتا نہیں۔''

''اگر اپنے دل کا بھید خود نہیں جانتے تو ہمارے پاس تمہارا کیا کام۔۔۔ادھر جا کر بیٹھو۔''

اس نے امیر زادوں کی طرف اشارہ کیا، ایسا لگتا تھا جیسے جوگی اسے پہچان گیا ھتا۔

''تم کہاں جاتے ہو۔''

''کاشی۔''

''وہاں کیا ہے؟''

''وہاں کیا نہیں ہے؟ وہ شیو پوری ہے، وہاں مسرت ملتی ہے، وہاں میرا مرشد رہتا ہے۔ میرا شیخ، وہ جوگرو ہے میرا، لیکن افسوس کہ تم نے اتنی عمر گنوادی اور اس کو نہ جانا۔'' وہ ٹھٹھک گیا۔ ''تم جونپور کے کمال الدین ہو نا۔۔''

کمال مبہوت ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔

میں سلطان سکندر کا سپہ سالار تھا۔ میں چنار کے معرکے میں تم سے لڑا تھا بلکہ تم نے اپنی تلوار سے مجھے زخمی بھی کیا تھا، یہ دیکھو۔'' اس نے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھایا جس کی تین انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔ اپنا چکارہ، جسے وہ بائیں ہاتھ سے بجا رہا تھا، فرش پر رکھ کر وہ کمال کے پاس بیٹھ گیا۔ ''تم کو اور بتاؤں، جب تم گوڑ کے

دربار میں رنگ رلیاں منا رہے تھے وہ جنگلوں میں تمہارے انتظار میں روتی پھرتی تھی لیکن کوئی راج ہنس اس کا پیغام تم تک نہ پہنچا سکا۔"

کمال کا دل دھڑ کنے لگا، یہ جوگی کیا کیا کہہ رہا تھا۔ کیا یہ غیب کا علم جانتا تھا؟

"میں اپنی فوج لے کر ایودھیا سے گزر رہا تھا۔ راپڑی میں جو جنگ ہوئی تھی اس میں اس کا بھائی مارا گیا، وہی جو چتر ویدی پنڈت تھا اور وہ جنگلوں میں روتی پھرتی تھی۔ ہر سپاہی کو دیکھ کر وہ سمجھتی تھی کہ شاید تم ہی آ گئے۔ کیونکہ تم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے پاس ضرور واپس لوٹ کر آ ؤ گے۔ مجھے سپاہی دیکھ کر تمہارا پتا پوچھتی وہ میرے پاس آئی تھی۔ میں تو اسے تمہارے متعلق کچھ نہیں بتا سکا، پھر معلوم نہیں وہ کہاں گئی۔"

کمال کا دل دھڑکتا رہا۔ سناٹا اتنے زور سے گرجا کہ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے، وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "دنیا بہت بڑی ہے" جوگی کہہ رہا تھا۔ تم اس کو ڈھونڈ نہیں سکتے، وہ تم کو تلاش نہیں کر پائے گی۔ زندگی میں دو انسان صرف ایک مرتبہ ملتے ہیں، اگر بچھڑ جائیں تو ان کا دوبارہ ملنا ناممکن ہے۔ ملنے اور بچھڑنے کا مطلب جانتے ہو؟ اتنا کہہ کر جوگی نے پھر اپنا چکارہ اٹھا لیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف چلا گیا۔

گنگا بہتی رہی۔ چاندی کی وسیع چادر پر مسافروں سے بھری ہوئی کشتیاں چلا کیں۔ شاہی بجرے، تجارتی جہاز، مچھیروں کی ڈونگیاں، ان کے بادبان شام کو ڈوبتے سورج کے مقابل میں ہوا سے پھول کر یوں پھڑ پھڑاتے گویا بے شمار راج ہنس ماسر دور کی سمت اڑنے کے لیے پر تولتے ہوں۔ کشتیوں میں سے گانے کی

آوازیں بلند ہوئیں۔ جوگیوں کے سمرن فقیروں کے ذکر، ویشنو پجاریوں کے بھجن، تاجروں کے جہاز ملک کی منڈیوں کی طرف جا رہے تھے۔ گجرات اور بنگال کے سوتی کپڑے، بنارس کا ریشم، دکن کے ہیرے دور دراز کے ملکوں کے انسان ان کشتیوں میں سوار تھے۔ چین کے عالم، تبت اور کشمیر کے بھکشو، عرب سیاح، ایران کے نقاش، جاوا کے رقاص، ملک میں امن قائم تھا۔ دلی میں سلطان سکندر حکومت کرتا تھا زندگی میں بڑی گہما گہمی تھی۔

''خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں دل کا چین نصیب ہے، بھائی مجھے شانتی چاہیے۔'' کمال نے آہستہ سے کہا۔

بھکشو نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اس کے چہرے پر کامل سکون تھا اور لازوال مسرت، آج ویساکھ پورنیا تھی، آج کی رات دو ہزار سال ادھر، اسی گنگا کے اس پار، ترائی کی ایک بستی میں شاکیہ منی پیدا ہوئے تھے۔ آج ہی ویساکھ پورنیا کے روز انہیں گیان حاصل ہوا تھا۔ چودھویں کا چاند دریا کی لہروں پر ادھر ادھر تیرا کیا۔ اس کی تیز اور ٹھنڈی کرنیں کمال کے اور بھکشو کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ دریا پر مکمل سناٹا طاری تھا۔

''مجھے میرے خیالوں سے نجات دلاؤ۔'' کمال نے کہا۔

بھکشو اپنی پراسرار آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ ''خیال۔۔۔ خیال خود کو نہیں جان سکتا، خیال اپنے آپ سے باہر نہیں جا سکتا۔ کائنات سے باہر کوئی خدا نہیں ہے اور خدا سے باہر کوئی کائنات نہیں ہے۔ حق و باطل میں کوئی فرق نہیں، لیکن ان سب سے بالاتر ذات مطلق ہے جو سناٹا ہے۔'' اس نے گہری آواز میں کہا۔

''مجھے اس سناٹے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔'' کمال نے کہا۔

''شوینا۔۔سناٹا۔۔شونیتا۔۔جوذات مطلق ہے۔جو صفر کا تصور ہے۔''

''مجھے اس تصور سے وحشت ہوتی ہے۔'' کمال نے کہا۔''۔۔اس سناٹے میں میں اکیلا کدھر جاؤں گا۔تم بھی میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔'' اس نے مہایان مذہب کے بھکشو کو شک و شبے کی نظروں سے دیکھا۔

جہاز ایک گاؤں کے کنارے ٹھہرا۔ساحل پر چاندنی رات میں وسنت کے دیوتا کا تہوار منایا جا رہا تھا۔کمال گھاٹ پر پہنچ کر چاروں طرف دیکھتا رہا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کدھر کا رخ کرے۔دفعتاً اسے ویشنو پجاریوں کی ایک ٹولی نظر آئی جو اس کے جہاز سے اتری تھی، وہ ان کے پیچھے ہولیا، کسی نے اس پر نظر نہ ڈالی۔

بہت دن تک وہ اسی طرح ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔گاؤں گاؤں گھومتا وہ ایک ہرے جنگل میں پہنچا، اسے اس جگہ کا نام معلوم نہیں تھا۔قریب جولاہوں کی بستی تھی۔۔۔معطر ہوائیں درختوں میں امنڈ رہی تھیں۔سبزے کی شدت سے آسمان کا رنگ ہرا نظر آ رہا تھا۔ساون کا مہینہ شروع ہونے والا تھا۔بھنوروں کی ایسی کالی جامنیں ہری گھاس پر ٹپ ٹپ گرتی تھیں۔کسم رنگ کی ساریاں اور لہنگے پہنے لڑکیوں نے آم کی ڈال میں جھولے ڈالے تھے۔چاروں اور گھن بیلی اور روپ منجری اور سدرشن اور مالتی کھلی تھی۔

گلے میں تلسی مالائیں پہنے ویشنو جوگنیں کٹھل کے درخت کے نیچے بیٹھی کھڑتال بجاتی تھیں۔گلابی آنکھوں والے طوطے شاخوں پر بیٹھے تھے۔ترتی

بجاتے، کمنڈل ہاتھ میں لئے جوگی اپنی یاتراؤں پر جا رہے تھے۔ جھاڑیوں میں جنگلی تیتر بول رہے تھے۔

تالاب کے کنارے رس بیلی مہک رہی تھی۔ مہوا کے جھنڈ میں سے گیتوں کے خوبصورت سر بلند ہو رہے تھے۔ کمال ایک کھنڈ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر جنگل اور ساون کی ان صداؤں کو سنتا رہا۔

تب اس کو معلوم ہوا وہ سناٹے میں تھا، یہ سناٹے کے مختلف پرتو تھے، وہ عالم حیرت میں تھا۔ یہ سناٹا ذات مطلق تھا۔ بھکشو کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

پھر اس نے غور سے سنا۔ مہو کے جھنڈ میں ویشنو پجارنیں جو گیت گا رہی تھیں اس کے الفاظ اب اسے صاف سنائی دے رہے تھے۔ یہ تو بردوان کے جے دیو گوسوامی کی آواز تھی۔

اس نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ دھیان سے سنا۔ پجارنیں گا رہی تھیں۔

صندل کے گرم جنگلوں پر سے بہتی ہوئی ہوا اپنے ساتھ مہک لا رہی ہے۔ جہاں الائچی کی جھاڑیوں سے چرائی ہوئی خوشبو پھیلی ہے، جہاں شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔

ان کنجوں سے یہ پروائی آ رہی ہے جہاں وہ ناچتا ہے۔ یہ بہار کا مہینہ ہے اور اسی مہینے میں تنہائی بہت کھلتی ہے۔

کیتکی کی کلیاں اور زرد پھول کام دیو کے بان کی مانند جگمگاتے ہیں سپاتل کے شگوفوں پر بھنورے سوتے ہیں۔ مادھوی ہوا میں جھوم رہی ہے اور ریشمی موگرے اور اس سے وہ کنجوں میں ناچتا ہے۔ یہ بہار کا مہینہ ہے اور اس مہینے میں

تنہائی بڑی کھلتی ہے۔

جیسے گرم ہونٹ بند آنکھوں کو چھو لیں اسی طرح سورج کی کرنیں آم کی کیریوں پر پڑ رہی ہیں اور وہ پر سکون جمنا کے کنارے رقصاں ہے۔ موسم گل میں وہ تنہا نہیں ہے۔

وہ گوپیوں کے ساتھ ناچ ناچ کر یونہی اپنا سمے گنوا دے گا جب کہ رادھا اس کی منتظر ہے؟ پجارنوں نے گیت کا دوسرا انترہ اٹھایا۔

جیسے دور جانے والے مسافر کو کوئل کی آواز سن کر اپنے دیس کی ندی کنارے آموں پر گنگناتے بھنوروں کی یاد آجائے اس طرح یک بیک اسے رادھا کا خیال آیا۔

اور رادھا نے دیکھا زریں لباس پہنے، بالوں کو خود رو پھولوں سے سجائے، اپنے سرخ ہونٹوں کے رنگ کے یاقوت سے مزین، وہ گوپیوں کے ساتھ رقصاں ہے،

کمال کھنڈ کی سیڑھیوں پر بیٹھ سنتا رہا۔

پجارنوں نے گایا۔

کوئل کی آواز سے راہی کو تکلیف پہنچتی ہے۔

ان مسرتوں کا رنج جو حاصل نہ ہوئیں۔

ان سیاحتوں کا رنج جو کی نہ جا سکیں۔

ان محنتوں کا رنج جن کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

اور مسرتوں کے باوجود

مسرت میں کرب چھپا ہے کیونکہ کرب پیام ہے۔

کمال اٹھ کھڑا ہوا۔ پجارنوں کی آواز، جے دیو کے الفاظ رفتہ رفتہ دور ہوتے گئے۔

اور جے دیو نے کہا تھا: میں منتظر ہوں، محبت تو وہ بھی کرتا ہے جس نے محبت دیر میں شروع کی۔

مہری اور گوریا چڑیوں کی سنگت میں وہ جنگل کے سایہ دار راستوں پر ادھر ادھر بھٹکتا پھرا، اور تب دفعتاً درختوں کے جھرمٹ میں اسے گنگا کا پانی جھلملاتا نظر آ گیا۔

اسے معلوم نہ تھا کہ وہ اس طرح گھومتا پھرتا بنارس پہنچ چکا ہے۔ سامنے دوسرے کنارے پر شوپوری تھی جس کے شوالوں کے کلس دھوپ میں چمک رہے تھے اور سینکڑوں ہزاروں گھنٹے ایک ساتھ بج رہے تھے اور ہوا میں عود کی مہک تھی اور گلیوں میں عبادت کے پھول بکھرے پڑے تھے اور گھاٹ کی لاتعداد سیڑھیوں پر لوگ نہا رہے تھے۔ کاشی۔۔ ازلی اور ابدی شہر۔

وہ درختوں کی چھاؤں میں دن بھر بے مقصد پھرتا رہا، اب اس کے پیروں میں سکت باقی نہیں تھی اور وہ بے طرح تھک چکا تھا۔ جنگل کے اختتام پر جولاہوں کی بستی تھی، وہ تھکے تھکے قدموں سے اس کی چوپال کی طرف بڑھا۔

ایک اہیر نے اسے سر جھکائے جاتا دیکھ کر اس سے کہا: ''بھیا، لگت ہے تم بہوت دور سے آئے رہے ہو۔ تمرے پیرن ماماٹی کتنی لاگی ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے بہت لمبا سفر طے کیا ہے۔''

''آؤ بیٹھو۔ ستو کھاؤ۔'' اہیر نے کہا اور اسے ایک سائبان میں لے گیا۔

''کپڑوں سے تو بڑے دھنوان دکھلائی پڑت ہو۔ اس اچرچ میں کاہے پھرے ہو۔ سلطان کے منشی ہو؟''

''میں کسی سلطان کا منشی نہیں ہوں۔''

''لو آرام سے بیٹھو، یہاں چھاؤں ہے۔'' وہ جوتے اتار کر سائبان میں بیٹھ گیا اور چاروں اور دیکھنے لگا۔ سامنے آم اور جامنوں کا گھنا باغ تھا جس میں وہ دن بھر گھومتا رہا تھا۔ مہوے کے جھنڈ میں سے اب بھی ویشنو مغنیوں کے گانے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف دوپہری کھلی تھی۔

لو بھئی چمپاوتی، اس نے دل میں کہا، تمہاری شرط پوری ہوئی۔ تم نے کہا تھا کہ میں اپنی تلوار اتار پھینکوں تو تم مجھے اپنے ساتھ کاشی لے چلو گی، میں نے اپنی تلوار دریا کی لہروں کے سپرد کر دی ہے اور میں کاشی پہنچ گیا ہوں۔

لیکن تم کہاں ہو۔

سامنے سے قلندروں کی ایک ٹولی گزری۔ بہت سے سنیاسی کنڈل پہنے، ترسول ہاتھ میں لئے گھاٹ کی سمت جا رہے تھے۔ جولاہوں، اہیروں اور مفلسوں کا ایک ہجوم کھڑتالیں سنبھالے بھجن گاتا ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

چمپا نے کہا تھا: ان کا مذاق نہ اڑانا، یہ بہت پیارے لوگ ہیں۔ ایک روز یہی تمہارے کام آئیں گے۔

وہ آہستہ سے سائبان سے نکلا اور اس ہجوم کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

وہ لوگ اپنے مرشد کے پاس جا رہے تھے، وہ جولہر تارا تالاب میں سے نکلا

تھا۔ وہ اسی جگہ پر رہتا تھا جہاں مولری کے پیڑ تھے اور جہاں رس بیلی مہکتی تھی۔

۲۳

میاں کبیر صبح کے وقت کرگھے پر بیٹھ کر کپڑے بنتے، کپڑوں کا گٹھڑ بنا کر پیٹھ پر لا دتے، بنارس کی گلیوں میں جا کر پھیری لگاتے۔ شام کو ان کے مکان کے سامنے مولری کے جھنڈ میں مجمع لگتا۔ چکارے سنبھالے جاتے، کھڑتالیں بجتیں۔ بھجن گائے جاتے، یہ نقشہ برسوں سے قائم تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس دنیا میں جنگیں ہوتی ہیں۔ انسان ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ اسی دنیا میں آتما بھوت دانت نکوسے دلوں کے تعاقب میں ہیں۔

سارے میں میاں کبیر کی شہرت پھیلی تھی۔ ان کی بانیاں کسانوں اور جاہلوں کی زبان پر تھیں۔ دور دراز کے خطوں سے لوگ ان کی اور کھنچے آتے تھے۔

کاشی کے پانڈوں کو اور دلی کے مولاناؤں کو اور سلطان سکندر کو، جو بڑا اکٹر مسلمان تھا، یہ خرافات پسند نہ تھیں لیکن وہ سب کیا کر سکتے تھے؟ سارا دیس ایک نئے رنگ میں رنگا جا چکا تھا۔ پچھلے تین سو سال سے اس صوفی بھگتی مارگ پر ایک بڑا خوبصورت قافلہ رواں تھا۔ اس قافلے میں کیسے کیسے لوگ شامل تھے۔ اجمیر کے معین الدین اور اپٹے کے امیر خسرو اور دلی کے نظام الدین اور گجرات کے نرسنگھ مہتا اور بنگال کے بیر بھوم کا چنڈی داس اور بہار کی متھلا پوری کے ودیا پتی اور مہاراشٹر کا درزی نام دیو، پریاگ کے راما نند اور جنوب کے مادھو اور ولبھ اور

بادشاہوں اور چھتر پتی راجاؤں کے درباروں اور امراء، وزراء اور سپہ سالاروں کی دنیا سے نکل کر کمال نے دیکھا کہ اس دوسری دنیا میں مزدور اور نائی، اور موچی اور کسان اور غریب کاریگر آباد تھے۔ یہ جمہوری ہندوستان تھا اور اس ہندوستان پر ان خرقہ پوشوں کی حکومت تھی۔ کاریگروں کی منڈلیاں ان سے وابستہ تھیں۔ اسلام کی مساوات ان ہندو بھگتوں کو متاثر کر رہی تھی۔ اسلام تو امن پسند صوفی اس دیس میں پھیلا رہے تھے، یہاں تلوار کا ذکر کہاں تھا۔ ہزاروں برس کے ستائے ہوئے اچھوت ان سنتوں کے پاس بیٹھ کر رام کا نام لے رہے تھے۔ اونچی ذاتوں کے برہمنوں کا یہاں کون دخل تھا۔ یہ بڑی نرالی دنیا تھی۔ اس میں ہندو مسلمان کا سوال نہیں تھا۔ یہاں محبت کا راج تھا اور کمال، جو انسان کی تلاش میں سرگرداں تھا، اس نے دیکھا کہ دنیا میں بھیڑیوں کے علاوہ انسان بھی بستے ہیں۔ یہ اہیر، جس نے چوپال میں بٹھلا کر ستو حاضر کیا تھا، اس کی جان لینا نہیں چاہتا کیونکہ اسے کسی سلطنت کو حاصل کرنے کی تمنا نہیں۔ اسے تو دونوں وقت باجرے کی روٹی مل جاتی ہے اور وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے اسے ملکوں کی سیاست سے کیا مطلب؟ یہ کسان، جو اس کے سامنے خوش خوش منڈیر پر بیٹھا اپنی چھوٹی سی بچی کو بیر کھلا رہا ہے، اسے کیا پرواہ کہ دلی میں آئندہ کون حکومت کرے گا؟ سلطان حسین حاکم ہو تب بھی وہ اسی طرح ہل چلائے گا اور لگان ادا کرے گا اور سلطان سکندر بادشاہ ہو تب بھی۔ ان ''ترکوں'' سے پہلے جب پرتھوی راج بادشاہ تھا تب بھی اس کے باپ دادا یونہی جیٹھ کی دھوپ میں ہلکان ہوتے تھے۔ ساون میں گاتے تھے۔ قحط پڑتا تھا تو خاموشی سے مر جاتے تھے۔

تب کمال نے سوچا ۔۔ کہ گو مذہب کی حیثیت زندگی میں اہم سمجھی جاتی ہے لیکن محبت ظاہری مذہب سے برتر شے ہے۔

محبت اصل شے ہے۔

دور دور سے لوگ کاشی آ کر کبیر کے قدموں میں بیٹھ رہے تھے۔ کمال ان سب کی باتیں شوق سے سنتا، ان کی سیوا کرتا۔

کاشی میں ایک روز کوچین کا ایک اندھا برہمن وارد ہوا، وہ کبیر کا نام سن کر سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد یہاں پہنچا تھا۔ اس کا ایک بازو لڑائی میں کٹ چکا تھا لیکن وہ ایک ہی ہاتھ سے رام دھن پر کھڑتال بجاتا تھا۔ اسے دیکھ کر کمال کو احساس ہوا کہ وہ جنگوں اور تباہ کاریوں سے پناہ لینے کے لئے یہاں بھاگ آیا ہے مگر باہر کی دنیا میں لڑائیاں اسی طرح جاری تھیں۔

"بھائی تمہاری جان کس نے لینی چاہی تھی؟" کمال نے اس سے پوچھا۔

"فرنگیوں نے۔"

"فرنگی۔؟"

"ہاں۔ عیسائی۔۔ بہت دور پچھم سے آئے ہیں۔۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

اتنی مدت ہند میں رہ کر وہ نصاریٰ کے وجود کو بالکل بھول چکا تھا جو مسلمانوں کے جانی دشمن تھے اور بیت المقدس میں مسلمانوں سے کٹے مرتے تھے۔ تاریخ میں اس کی دلچسپی پھر عود کر آئی، وہ کھسک کر مالابار کے برہمن کے پاس بیٹھ گیا۔

"یہ عیسائی کدھر سے آئے ہیں؟" اس نے سوال کیا۔ صلیبی جنگوں کے

سارے واقعات اسے ازبر تھے۔

''پرتگال۔۔کوئی دیس ہے۔''

اس نام سے تو وہ واقف تھا۔دوسرے عربوں کی طرح علم جغرافیہ کا وہ بھی ماہر رہ چکا تھا۔پرتگال اندلس کے پاس تھا۔اندلس۔۔۔اس کے دل پر ایک برچھی سی لگی، وہ لوگ وہاں مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے بعد اب یہاں بھی آن پہنچے۔ کمال کو یہ معلوم نہ تھا کہ پرتگالیوں کو ان کے بادشاہ نے اور پاپائے روم نے حکم دیا تھا کہ جس طرح مسلمان ہسپانیہ سے نکالے گئے اسی طرح ساری دنیا میں جہاں جہاں ملیں چن چن کر ان کا قلع قمع کرو، ایک بھی زندہ نہ بچنے پائے۔

''انہوں نے گوا کی ساری مسجدیں ڈھا دیں، مندروں کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا۔'' اندھا برہمن کہتا رہا، ''گوا کے ایک ایک مسلمان کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ میں ہندو تھا اس لئے بچ گیا۔''

نوجوان برہمن۔۔۔جو اپنی نور سے عاری آنکھوں سے اسے تکتے ہوئے دو تارے پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔یہ کالی کٹ کے راجہ کی بحریہ کا افسر تھا اور راجہ کے امیر البحر قاسم اور میر حسن کے ساتھ جی توڑ کر پرتگالیوں سے لڑا تھا اور اپنی آنکھیں ان کی بارود کی نذر کر کے اور ایک بازو کٹا کر یہاں پہنچا تھا۔کمال کو سلطان سکندر کا وہ سپہ سالار یاد آیا جو اسی طرح جوگی کا روپ دھارے اسے جہاز پر ملا تھا۔

''ہماری ہار ہوئی یا جیت۔'' کمال نے آہستہ سے سوال کیا۔

''ہم نے ترکی کے راجہ سے مدد مانگی تھی۔ترکی کا جنگی بیڑا مصر دیس سے ہماری سہائتا کے لئے آیا مگر پرتگالی بڑے زبردست ہیں۔'' اس نے اپنی بے نور

آنکھیں بند کرلیں اور دوتارہ بجانے میں مصروف ہوگیا۔ اب شام ہو رہی تھی اور لوگ کیرتن کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ کمال اٹھا اور کوچین کے اس اندھے کا ہاتھ تھام کر اسے راستہ بتلاتا ہوا لوگوں کے گروہ میں مل گیا۔

بغداد اور جونپور کا ابوالمنصور کمال الدین، مورخ، محقق، سیاست دان، سپاہی، جسے تصوف اور معرفت سے کبھی کوئی سروکار نہ تھا، بالآخر کاشی کے بیچ گنگا گھاٹ پر پہنچ چکا تھا۔

۲۴

لیکن بہت سے بنیادی سوال، سوچنے والے ذہن کے لئے، ابھی باقی تھے۔ کبیر نے اس سے کہا: سنو بھائی سادھو، ہری سے پریم کرو، تمہارے دکھ آپ سے آپ مٹ جائیں گے۔ دکھ سنیہ۔۔۔ دکھ کی حقیقت اس کو جہاز پر اس تانترک سدھ نے بھی سمجھانا چاہی تھی، لیکن ہری کون تھا؟ یہ سوال بڑا اہم تھا۔ اس سوال پر ایتھنز میں اور اسکندریہ میں اور بغداد میں بڑی لمبی بحثیں کی جا چکی تھیں۔ ہزاروں برس قبل اسی گنگا کے کنارے کپل نے اور جیمنی نے اور شہزادہ سدھارتھ نے اس پر سوچ بچار کیا تھا اور سات سو سال گزرے مہاندی کے اس پار کیرالا میں ایک بہت بڑا عالم پیدا ہوا تھا، اس کا نام شنکر اچاریہ تھا۔ کمال نے عہد عتیق کے کپل کا مطالعہ شروع کیا اور کتاب بند کر کے سوچا: نوفلاطونیوں کی عقل فاعل پرش ہے جو عقل حیوانی، پراکرتی، پر اثر انداز ہوتی ہے؟ انسان کا خدا سے اتصال نروان ہے۔۔۔

طریقت اور مارگ دونوں رحیم تک پہنچتے ہیں جو رام ہے؟

گوتم سدھارتھ کے سنہرے راستے پر صدیوں تلک مسافروں کے قافلے گزرا کیے جنہوں نے دنیا میں اپنے چند روزہ قیام کے دوران میں بنارس اور سانچی، اور امراوتی اور اجنتا اور باغ کے نگارستان سجا ڈالے مگر زمانے نے ایک بار پھر پلٹا کھایا اور مالوہ اور قنوج اور مگدھ اور گوڑ میں پھر ہری کی بھگتی کا چرچا ہوا۔ کیدار ناتھ سے لے کر دوار کا تک شیو کے عظیم الشان مندر تعمیر ہوتے چلے گئے۔ شاکیہ منی کا راستہ مہایان مذہب اور تانترک اسرار میں تبدیل ہو گیا اور شاکیہ منی وشنو کے اوتار بن کر انہی مندروں میں براجنے لگے۔ نارنجی لباس والے وہ بھکشو جو موروں کے نشان والے بادشاہ چندر گپت نری چندر کے وقت سے بھی پہلے جنگلوں میں نمودار ہوئے تھے ایک ہزار سال کی الٹ پھیر کے بعد سدھ کہلاتے تھے اور بنگال اور بہار کے معبدوں میں جادو ٹونے کرتے تھے۔ مہایان مذہب کا مہا سکھ کا تصور خرافات میں تبدیل ہو چکا تھا۔

کہ ہر بڑا آدرش آخر میں یونہی تباہ کیا جاتا ہے۔

لیکن آدرش کیا شے ہے؟

یکلخت کمال کو محسوس ہوا کہ وہ بھی بال کی کھال کھینچنے کی عادت اختیار کر چکا ہے جس طرح اس نے آس پاس کی درگاہوں میں لمبی لمبی چوٹیاں رکھائے برہمن طالب علموں کو چھیوں فلسفوں کے مسائل کی مین میخ نکالتے سنا تھا۔

قرب و جوار کے گاؤں میں بنارس اور جھوسی اور مگھر میں اسے بے شمار فقراء ملے جن کی خانقاہوں میں جا کر اس نے تصوف کی باتیں سنیں۔ قصبوں اور شہروں

میں عظیم الشان مدرسے تھے جہاں ایک سے ایک جید عالم تیار کیا جا رہا تھا۔ بڑے بڑے عمامے پہنے شیخ الجامعہ جب اس کے سامنے پالکی میں بیٹھے ہوئے نکلتے تو اسے بغداد کی یاد آ جاتی۔ نیم تاریک مٹھوں میں پنڈت اپنے پوتھی پتروں سے سر کھپا رہے تھے۔ گنگا کے کنارے کنج میں کبیر اور ان کے چیلے پریم پریم کی رٹ لگائے جا رہے تھے مگر وہ ہمیشہ کا ضدی خود پسند عرب، اس نے تہہ تک پہنچنے کا تہیہ کیا اور جس طرح وہ سلطان حسین کے مستعد سپاہی کی حیثیت سے نئے معرکے سر کرنے کے لئے اپنی برق رفتار رہوار پر بیٹھا بیٹھا پرشور ندیوں میں کود پڑتا تھا، اسی طرح اب اس نے اندھیرے سمندر کو لبیک کہا جس میں اس سے پہلے ہزاروں لاکھوں روحیں ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔ بہت سے لہروں کے خلاف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ بہت سے کشتی کا بادبان اتار کر قناعت سے ایک طرف کو ہو بیٹھے تھے اور خود کو ہواؤں کے حوالے کر دیا تھا۔ بہت سے اپنے ٹوٹے پھوٹے جہاز کے تختوں پر بہتے چلے جا رہے تھے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو کب کے ڈوب چکے تھے۔ ساحل تک کوئی نہ پہنچا تھا۔ کیونکہ ساحل نظر نہیں آتا۔ سمندر بہت وسیع تھا اور اتھاہ اور چاروں طرف گھپ اندھیرا سارے میں چھایا تھا۔۔۔ بہت سوں کا خیال تھا کہ انہوں نے روشنی کے مینار تعمیر کر لیے ہیں۔ بہت سے سمجھتے تھے کہ جو چراغ انہوں نے اپنی اپنی کشتیوں میں جلائے ان کی روشنی میں وہ اس سمندر کو عبور کر لیں گے مگر یہ بھی ان کی خوش فہمی تھی، ساحل نظر نہیں آتا تھا۔

کنارہ کہاں ہے؟ وہاں پہنچ کر کیا ملے گا؟ صحیح عقیدہ کیا ہے اور خدا کا تصور؟ محبت؟ ویراگ میں کیا حاصل ہوتا ہے؟ نجات کیا ہے؟

پنڈتوں سے اس نے ان کے خدا کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی۔ گو کبیر نے اس سے کہا تھا: ''کاشی کے پانڈے تم کو اور باتیں بتائیں گے۔ میں کاشی کا جولاہا ہوں تم تو میرا گیان بوجھو۔'' مگر اس نے اس بات کی سنی ان سنی کر دی اور ان تاریک مٹھوں اور پر اسرار معبدوں کو اس نے باہر سے جھانک کر دیکھا جن کے اندر اسے قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ عود و لوبان کا دبیز دھواں، دیوی دیوتاؤں کے عجیب و غریب بت، مندروں کے اندھیرے پختہ آنگن، پیچ در پیچ گلیاں اور چبوترے اور موکھے جن کے اندر رکھی ہوئی کسی دہشت ناک مورتی کی جھلک اسے نظر آ جاتی۔ منتروں کا جاپ، پھولوں اور مٹھائیوں کے انبار بیلوں اور گایوں اور بندروں اور طوطوں کی یلغار۔ سیڑھیوں پر جمع پجاریوں کی بھنبھناہٹ، گھنٹوں کی آواز، کیا ان لوگوں کے ذہن، ان کے الٰہیات کے مسائل بھی ان ہی تنگ و تاریک ان گنت برجیوں، گلیوں اور کوٹھڑیوں والے مندروں کی طرح پیچ در پیچ گنجلک اور راورنا قابل فہم ہیں؟ یہ کون جناتوں کی قوم ہے جسے وہ نہیں سمجھ سکتا؟ اس کو تو اپنے ذہن پر بہت ناز تھا۔ کیا وہ مدرسہ نظامیہ کا زمانہ بھول گیا؟

یہ صحیح تھا کہ ہندو فلسفے اور الٰہیات کے چھ کے چھ مدرسے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ادق تھے اور اسے خود کبھی فلسفے اور مابعد الطبیعیات سے لگاؤ نہیں رہا تھا۔ لیکن وہ سارے بنیادی مسائل کی طرف سے آنکھ موند کر محض ہری پریم کی رٹ نہیں لگائے گا۔ ہری کون ہے؟ ہری کون ہے؟ یا رام یا رحیم؟ وہ خدا کو کس نام سے پوجے؟ کیا نام ضروری ہے؟ اور خدا کون سا ہے اور کیا وہ بھی ضروری ہے؟ دنیا بھر میں اہل بدعت اور شک پرستوں اور دہریوں کی کمی نہیں ہے لیکن اس کے

اسلام، اس کے ایمان میں خلل آ چکا تھا۔

اس نے ایک روز چپکے سے کبیر کے کنج سے نکل کر دریا پار کیا اور ایک زبردست جٹا دھاری پنڈت کے پاس جا پہنچا جن کے علم و فضل کا دور دور شہرہ تھا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ مناظرے کے لئے نہیں آیا ہے، وہ علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔

مگر علم اس قدر وسیع تھا، اسے اپنے غیر اہم ہونے کا شدت سے احساس ہوا اور وہ کہاں سے شروع کرے؟ زمانے کتنے پھیلے ہوئے تھے اور صدیوں کے دائرے۔ ملک اتنا وسیع تھا، وہ اس کے محض ایک حصے میں اس وقت موجود تھا۔ ابھی اس کو بنگال اور دکھن اور مہا گجرات اور تامل ناڈو کی بھی خبر نہیں تھی، وہاں کے علماء وہاں کے گیت کار، وہاں کی خانقاہوں اور فقیہوں کا اسے رتی بھر بھی پتا نہ تھا۔

وہ کون سے مدرسہ فکر کا مطالعہ پہلے شروع کرے۔ عمل اور علم اور محبت، تینوں رستے اس کے سامنے کھلے تھے، وہ کس پر پہلے چلنا شروع کرے؟

عمل کے راستے کا بیان قدیم ویدوں میں تھا اور کلپ شاستروں اور دھرم شاستروں اور مہابھارت اور پرانوں میں اس کا ذکر تھا۔ مہابھارت میں کرشن نے ارجن کو عمل کی راہ دکھائی تھی۔ ویدک خداؤں کا ملک پر ہزاروں برس سے راج تھا جو رفتہ رفتہ فلسفے کی علامتوں کے بجائے عوام کے ذہن میں دیوی دیوتاؤں کی حیثیت سے براج رہے تھے۔

اس کرم مارگ کے متعلق اس نے پڑھا کہ یہ علت و معلول کا رشتہ ہے جس کے ذریعے انسان اور کائنات ایک دوسرے سے بندھے ہیں اور بندش ہمیشہ

تکلیف دہ ہوتی ہے اور نجات کرم کے چکر سے آزاد ہو کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

دوسرا راستہ علم کا تھا۔ ویدک عہد کے بعد کے حکماء نے طے کیا تھا کہ محض عمل سے نجات ممکن نہیں۔ خود عمل کی ماہیت کیا ہے؟ یہ جاننا چاہیے، یہ کھوج لگانے کا رستہ بہت طویل تھا۔ اپنشدوں میں کسی ایسے طریقے کی تحقیق شروع کی گئی تھی جس سے علت و معلول کا چکر ٹوٹ سکے۔ اس تحقیق نے چھ مختلف مدرسہ ہائے فکر کو جنم دیا تھا۔ منطق کے اصول وضع کیے گئے۔ کپل نے کہا۔ پرش اور پراکرتی، روح اور مادہ ازل سے اکٹھے موجود ہیں۔ مادہ حرکت کرتا ہے اور تبدیل ہوتا ہے۔ روح کائنات سے علیحدہ ہے۔ کائنات کا اس کے بغیر بھی ارتقا ہوتا ہے، کیونکہ ذہن، شخصیت، خودی روح میں شامل نہیں لیکن پھر بھی روح مادے میں گھل مل جاتی ہے اور اس کی مکتی اسی وقت ہے جب مادے سے وہ خود کو جدا کر دے۔ مادے میں مبتلا رہنے کا نتیجہ دکھ ہے، اگر اسے اپنے اور پراکرتی کے فرق کا علم ہو جائے تو وہ آزاد ہو سکتی ہے۔ کپل دہریہ تھا۔ اس کے نزدیک تخلیق اور ارتقاء خدائی کارنامہ نہیں بلکہ مادے کی فطرت تھی۔

پھر کمال نے پتن جلی کے یوگ ستر پڑھے۔ اس کا ایشور خالق کائنات نہیں بلکہ روح ازلی تھی جو مادے میں مبتلا نہیں ہوئی۔ ویدانت والے وحدت الوجود کے قائل تھے۔

عہد عتیق کے برہمن قانون ساز گوتم کے فلسفہ علم میں اس نے وجود اور عدم وجود، بھاؤ اور ابھاؤ کی تفصیلات پڑھیں۔ گوتم نے ادراک، منطق اور استنباط کے ذریعے چیزوں کا کھوج لگانے کی سعی کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا خلاء میں سے

پیدا ہونے کے بجائے ابدی ذرات، زمان و مکان اور ذہن و دماغ نے تخلیق کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ مٹی اور پانی کی طرح ساری مرکب اشیاء کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور رہا ہوگا کیونکہ وہ نتیجے کی حیثیت میں موجود ہیں۔ زمان و مکان اور ذرے لامحدود ہیں۔ کسی سبب کا نتیجہ نہیں لہذا مرکب اشیاء کا سبب کوئی ذہین محرک ہے۔ ورنہ مرکب جوہر کے مادی اسباب یعنی ذروں میں وہ ضابطہ و تنظیم نہیں ہو سکتی جس کے ذریعے ان کے نتائج کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس ذہین محرک کو مادی اسباب کا براہ راست علم ہوگا اور نتائج کی کارفرمائی کی طاقت بھی۔ کوئی انسان اس علم اور طاقت کا حامل نہیں۔ لہذا برہمن قانون ساز گوتم نے کہا تھا کہ اس مرکب اشیاء کی دنیا کا مسبب الاسباب خدا ہے۔

وقت کے متعلق اس نے پڑھا کہ زمان و مکان اضافی ہیں اور محض ایسا خلا نہیں جس میں حقیقت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ وقت کے مسئلے پر کمال بہت گڑبڑایا، یہ مسئلہ بھی سامی نظریہ کائنات سے یکسر جداگانہ تھا جس میں ابتدائے آفرینش سے روز قیامت تک ایک مخصوص باضابطہ وقفہ تھا۔ جس کے بعد ابدیت ہی ابدیت ہو گی لیکن یہاں تو ابتدائے آفرینش کے بعد پھر ابتدائے آفرینش تھی اور کوئی ایسا مخصوص نقطہ نہ تھا جہاں سے وقت شروع ہوا ہو۔ یہ حکماء کہتے تھے کہ وقت کا لمحہ مختلف انسانوں کے لئے مختلف ہے۔ انسانی وقت دیوتاؤں کے وقت کا سواں اور برہما کے وقت کا دس لاکھواں حصہ ہے۔ لہذا چھونے اور محسوس کرنے کی دنیا ہی وجود کی ساری ممکنات سلب نہیں کر لیتی۔ اس نے پڑھا: ''زمان و مکان حقیقت کی جہت ہیں اور حقیقت وجود میں آنے کی کیفیت کا دوسرا نام ہے اور ابدی ارتقاء اور

اشکال اور ہیئتوں کے پر پیچ نمو اور دنیاؤں کے تسلسل کا ایک ایسا چکر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔“

پھر ایک گروہ کا کہنا تھا کہ پہلے خلاء تھا اور اس میں کائنات کو ظہور ہوا۔ یہ وحی اور الہام کے قائل خدا پرستوں کا گروہ تھا۔ حقیقت پرستوں کا نظریہ تھا کہ فطرت خدا کے ساتھ ابد سے موجود ہے اور آزاد ہے۔ خدا محض صانع اور آفریدگار ہے۔ عینیت پرستوں کے نزدیک خدا کے علاوہ اور کوئی شے حقیقی نہیں تھی۔ پنج راتریوں کا عقیدہ تھا کہ وشنو ذات حقیقی ہے اور لکشمی بحیثیت کریہ شکتی مشیت ایزدی اور بحیثیت بھوت شکتی کائنات کی ماں ہے۔ بدھ مت والوں کا قول تھا کہ خدا اور روح دونوں کا وجود نہیں۔

وہ کون سے مدرسہ فکر کا مطالعہ پہلے شروع کرے۔۔؟

ویدانت نے اسے اپنی طرف کھینچا اور وہ شنکر اچاریہ کے مطالعے میں پھر سے جت گیا۔

پانچویں صدی عیسوی کے بعد سے ملک میں بدھ مت کو زوال آ چکا تھا۔ گندھارا اور کاشمیر اور وادی سوات اور مکران اور بلوچستان اور مدھیہ پردیش ہر جگہ دوبارہ مہیش ور کی عبادت شروع ہو چکی تھی۔ ملایا اور سیام دیش اور چمپا کے دور دراز ملکوں میں نیل کنٹھ شیو کی آرتی اتاری جا رہی تھی جس نے ساری کائنات کا زہر پی کر اپنے گلے کو نیلا کیا تھا۔

یہ تصورات بے حد لرزہ خیز تھے۔ مہا بھیرو، آفاق کا خوفناک جوگی، جو اپنے ہاتھوں میں برہما کی کھوپڑی کا کشکول لیے ڈمرو بجاتا، تین ڈگ بھر کے تینوں

دنیاؤں کو عبور کر لیتا تھا اور فقیروں کی طرح اپنے بیل پر بیٹھا کائنات میں مارا مارا پھرتا تھا۔ مہا کال ۔۔۔ برہما وشنو مہیش کا تیسرا، تباہ کن روپ ۔۔۔شیونٹ راج ۔۔۔

مدھیہ پردیش اور دکھن میں لنگم کے معبد تعمیر کر لیے گئے تھے۔ گپتا عہد میں اب شیو مہاراج کی عمل داری تھی۔ عرب سیاح اپنے سفر ناموں میں اس عجیب و غریب مذہب کا تذکرہ کر رہے تھے۔ خداؤں کی فوج کی فوج تھی جو ہر طرف کودتی پھاندتی پھر رہی تھی، خوفناک عفریت نما دس ہاتھ والی سیاہ فام ڈائنیں، پریوں کی ایسی نرم و نازک دیبیاں۔ چاند اور سورج، آگ اور بادل، ہاتھی کی شکل والا اور بندر کی شکل والا، ناگ اور بچھوے اور تیرتھ اور میلے اور یاترائیں اور تہواروں کا غل غپاڑہ اور خونی قربانیاں اور جادو منتر اور ٹونے ٹوٹکے کا ایک ہنگامہ بپا تھا۔ سمندر پار کمبوج دیش اور یاوا اور ساٹرا میں نئی برہمن شاہنشاہیت کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ شیو کی ڈمرو سارے میں بج رہی تھی۔

ہندو مذہب کی تجدید اور نئی تنظیم میں اس اکیلے نوجوان کا کتنا بڑا حصہ تھا جو آٹھویں صدی عیسوی میں مالا بار کے ساحل پر الورندی کے کنارے شوگرو برہمن کے یہاں پیدا ہوا۔ علم کے راستے پر چل کر ایک طرف جس نے اپشدوں اور گیتا اور برہم ستر کی تفسیریں لکھیں اور دوسری طرف مذہب کو فلسفہ طرازیوں سے بے نیاز کر کے عوامی بنایا جو سارے ملک میں مٹھ قائم کرتا اور رندہب کا پرچار کرتا پھرا اور بتیس سال کی عمر میں مر گیا۔

ہندوستان کا عظیم ترین مفکر ۔۔۔ شنکر اچاریہ! اس کے فلسفے کا مرکز خدا کی وحدانیت تھی۔ خدا، جو خالص ذہن اور خالص وجود تھا ۔۔۔ نرگن ۔۔۔ اور دنیا جو

مایا تھی۔

لیکن جس طرح دنیائیں دو طرح کی تھیں۔۔۔ایک حقیقی اور ایک غیر حقیقی، اسی طرح علم دو طرح کے تھے۔۔اعلیٰ اور ادنیٰ۔ برہما اور ایشور۔ چنانچہ عوام، جو شنکراچاریہ کے ذہن کی بلندیوں کو نہیں پہنچ سکتے تھے، ان کو اس نے پروہتوں کے حوالے کر کے برہمن عملداری کی جڑیں مضبوط کر دیں۔

۔۔۔نیتی۔۔۔نیتی۔۔۔یہ نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں ہے۔ یعنی برہما کا تجربہ نہیں کیا جا سکتا۔۔اپنشدوں میں لکھا تھا۔ شنکراچاریہ نے اس کی تشریح کی۔۔نیتی نیتی کا مطلب عدم وجود نہیں۔ ذات حقیقی مکمل بھرپور وجود ہے، اور ست، وجود، چیت، شعور جو کائنات کو منور کرتا ہے برہما ہے اور ابدی ہے۔ ست چیت اور آنند برہما کی صفات ہیں بلکہ خود اس کی ذات ہے۔ علم برہما کا جوہر ہے۔ ساگن برہمایا ایشور زندہ خدا ہے۔ پراکرتی اور مایا کے ساتھ برہما ساگن بن جاتا ہے، وہ بیک وقت ایشور بھی ہے اور جیو یعنی شخصی خودی بھی، شنکراچاریہ وحدت الوجود کا قائل تھا۔

فلسفی مادھواچاریہ نے دوئی کے نظریے کا پرچار کیا۔ اس کے نزدیک برہما اور جیو کے علاوہ تیسری ہستی مادی دنیا کی تھی۔ رامانج نے کہا: برہما اور مایا الگ الگ نہیں بلکہ سب برہما ہے۔۔۔برہم مایا۔۔۔

کمال پنڈتوں سے برہم ستر کی تفسیر پڑھتا رہا۔ شنکراچاریہ نے کہا کہ حقیقت کو دو مختلف معیاروں سے جانچا جا سکتا ہے۔ ایک راستہ یہ علم کا تھا جس پر کمال خود گرتا پڑتا پشتم پشتم چلا آ رہا تھا، تیسرا راستہ ابھی باقی تھا۔ جانے اس میں اتنی ہمت باقی

رہ جائے گی کہ وہ اس راستے کو بھی آزما سکے۔

"مدرسوں میں جزا و سزا اور خیر و شر کے مسئلے پر طویل بحثیں جاری تھیں۔ مسلمانوں کے بہتر کے بہتر فرقے بزعم خود صحیح راستے پر تھے۔ صوفی اور درویش اپنے اپنے حلقے پھیلائے بیٹھے تھے اور خدا کی محبت میں آہیں بھر رہے تھے۔ اس نے معتزلیوں سے مباحثے کیے جو مذہب کو عقل سے پہچاننے کے مدعی تھے۔ شیعوں نے اسے اپنی جانب بلایا جن کا حلول کا فلسفہ اہل ہنوز کے فلسفوں سے ملتا جلتا تھا۔

ملامتیوں کے قصے بھی اس نے سن رکھے تھے۔ گنگا کے کنارے کنارے آم کے درختوں میں چھپی ہوئی خانقاہوں میں اس نے ان اللہ کے بندوں کو دیکھا جو لاہوت سے ناسوت تک سارے فاصلے طے کر چکے تھے یا تصور شیخ میں گم بیٹھے تھے۔ نروان اور فنا کی تلاش میں اس نے یوگیوں اور صوفیوں دونوں کو مراقبے اور سمادھی میں کھوئے ہوئے دیکھا۔ علم کا راستہ وہ طے کر رہا تھا مگر اس کا دماغ چکرا رہا تھا، یہ راستہ بل کھاتا جانے کتنی دور تک جاتا تھا۔ ابھی تو وہ پہاڑ کے دامن ہی میں پہنچا تھا۔ صوفیوں نے اسے اپنی اور بلایا۔ انہوں نے کہا: آخری حقیقت روشنی ہے۔۔۔ نور۔۔۔ نور۔۔۔ نور۔۔۔ نور۔۔۔ جو نور نہیں اس کا وجود نہیں۔ چند اور درویشوں نے اسے بتایا: آخری حقیقت خیال ہے۔ خدا کے جلال و جمال اور کمال کے ذکر کی گونج اس نے ان کنجوں میں سنی۔ کیونکہ یہ ہندوستان تھا۔ یہ فرید الدین عطارؒ اور ہجویریؒ اور شیخ جلال الدین تبریزیؒ اور بہاء الدین زکریاؒ اور جلال الدین سرخپوشؒ اور معین الدین چشتیؒ اور قطب الدین بختیار کاکیؒ کا ملک تھا اور کون

بدقسمت ہوگا جو اس ملک میں آکر بھی وہ نا پا سکے جس کی اسے تلاش تھی ۔

مگر ابھی تو وہ کپل اور شنکر اچاریہ کے ابواب بھی نہ پڑھ پایا تھا۔ کیا وہ یونہی خالی الذہن خالی دماغ لے کر ان سنتوں اور صوفیوں کے پاس چلا جائے ۔۔۔؟ دل میں شبہے رکھے اور ان معصوم لوگوں کو دھوکا دے؟

ایک رات وہ گھنٹوں بیٹھا مٹھ کی دیوار کے نیچے سوچا کیا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی ۔ پنڈت اشلوک پڑھ رہے تھے، وہ اندر نہ جا سکتا تھا۔ اسے یہ اشلوک بہت اجنبی لگے ۔ سارے جونپور کے علماء اور کاشی کے پانڈے اسے حلقہ باندھے دانت نکوستے نظر آئے ۔ وہ ان سے علیحدہ نیچے موجود تھا۔ کوئی اس کی بات ہی نہ سنتا تھا، وہ دیوار کے نیچے بیٹھا رہا۔

صاحبو مہربان ۔۔۔ صاحبو مہربان ۔۔۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

رات کی ہوا میں خنکی آ چلی تھی ۔ قریب سیڑھیوں پر چند پہاڑی آن بیٹھے تھے اور وہ اکتارے پر الاپ رہے تھے ۔۔ صاحبو مہربان ۔۔ صاحبو مہربان ۔۔ صاحبو ۔۔

اس نے انگڑائی لی اور اٹھ کھڑا ہوا ۔ کمال الدین ۔۔ اس نے اپنے آپ سے کہا ۔۔۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کبیر کا صاحب تمہیں واپس بلا رہا ہے، وہ جو بہت مہربان ہے ۔ دونوں راستے تم نے دیکھ لئے، لیکن ابھی محبت کا راستہ باقی ہے ۔ اس پر چل کر شاید تم اس تک پہنچ سکو ۔ ہاں ۔۔۔ ابھی محبت کا راستہ باقی ہے ۔

اس نے دوبارہ گھاٹ کا رخ کیا اور گنگا عبور کر کے کبیر کے کنج میں واپس جا پہنچا۔

اب تو لگتا تھا جیسے عمر بھر سے وہ انہیں فضاؤں میں سانس لیتا آیا تھا۔ جہاں ڈھاک کے جنگلوں سے قرنے کی صدائیں بلند ہوتیں۔ جہاں گورکھ ناتھ کے جوگی شیر کی کھالیں اوڑھے کانوں میں کنڈل ڈالے سینگی اور نرسنگھے بجاتے جسم پر بھبھوت ملے ان جنگلوں میں گھومتے تھے۔ جہاں ڈھاک پھولتی تھی۔ یہ کیسی انوکھی فضائیں تھیں جہاں نوے قسم کے ناتھ اور چوراسی قسم کے سدھ پہاڑوں کی گپھاؤں اور نیم تاریک مٹھوں اور لرزہ خیز معبدوں میں اپنے اپنے دائرے پھیلائے بیٹھے تھے اور کپالک اور کالا مکھ بدن پر راکھ ملے، کھوپڑیوں کے ہار پہنے، کڑا بجاتے چاروں اور گھومتے تھے۔ ایک سے ایک پرم ہنس اور یوگی ندیوں کے کنارے کٹیوں میں بیٹھا تھا۔

یہ سکون بخش ماحول جہاں گیت تھے اور ڈھول اور منجیرے کی صدائیں، بسنت رت آتی تو سارے میں زرد اور دھانی رنگ پھیل جاتے۔ گریکھم رت میں درختوں سے مہوہ ٹپکتا اور آم کے درخت بور سے لد جاتے۔ رنگیلی برکھا رت میں چندریاں ہوا میں لہراتیں، لاونیاں گائی جاتیں، لڑکیاں پکوان پکاتیں۔

بھادوں کے مہینے میں گنگا مائی کا جوش اور غصہ دیکھنے والا ہوتا۔ شرو کے موسم میں پیلی چاندنی سارے میں پھیلتی اور اداس سہاگنیں اپنے پردیسی شوہروں کی یاد میں برہا الاپتیں، چرخہ کاتتیں اور ساس نندوں سے لڑتیں۔

ہیمنت رت آتی۔ اگہن اور پوس کی سرد ہوائیں چلاتیں، الاؤ جلتے، آلھا اودل گایا جاتا۔ ماگھ اور پھاگن کے مہینوں میں کھیتوں پر پالا برستا۔ چنے اور ارہر کے پودوں پر اوس کے قطرے جگمگاتے کسانوں کے جھونپڑوں سے چکی کی گھر گھر کی

صدائیں بلند ہوتیں۔

آوازوں اور رنگوں کی اس دنیا میں وہ مکمل طور پر رس بس چکا تھا۔

یہ سب تھا مگر چمپا نہیں تھی، اسے کون زمین نگل گئی؟ کون آسمان کھا گیا؟ کون چتا کے شعلوں کی وہ نذر ہوئی؟ کس ندی کی لہروں نے اسے اپنی اور کھینچا؟

یہ کون بتا سکتا تھا؟ ان گنت تہوار آئے اور نکل گئے۔ رکھشا بندھن اور بھیا دوج اور جنم اشٹمی اور ہولی اور دیوالی اور محرم اور رام لیلا۔ کسی ہنگامے کسی میلے کسی گاؤں کسی بستی میں وہ نظر نہ آئی، وہ سارے میں مارا مارا پھرا، ایک دو بار وہ ایودھیا گیا، اس کا جی چاہتا تھا کہ عمر انہیں سبزہ زاروں، سرجو اور گنگا کے ان ہی ساحلوں پر گزار دے۔

چمپا کی یاد اب ایک عجیب حیثیت سے اس کے دل میں رہتی تھی۔ بھگتی مارگ میں اس نے دیکھا تھا کہ وشنو، انتریامی ایسا خدا ہے جو دلوں کے اندر رہتا ہے، وہ باپ ہے، شوہر ہے، ماں ہے، دوست ہے، رادھا کے لئے کرشن ہے، کرشن کے لئے رادھا ہے۔ اس نے سوچا کہ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا فاصلہ تو بہت طے کرتے ہیں مگر چمپا ان گنت اندھیروں میں میرے لئے اجالا کرتی جاتی ہے۔ جب وہ ساون کی راتوں میں لڑکیوں کے گیت سنتا تو دنیا بالکل نئی شکل میں اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی کیونکہ اب اسے معلوم تھا کہ الفاظ کے معنی کیا ہیں۔ ویراگن جو پیا کی تلاش میں اندھیری رات میں نکل کھڑی ہوئی، برہا کی رات فراق تھی۔ جوگن، گوری، سہاگن، خدا کا بندہ تھا۔ پتی، منوہر، گردھر گوپال، خدا تھا جس کی کھوج میں گوری راج پاٹ چھوڑ بنوں میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ عرب و

نجم کی شاعری کی تصوراتی کائنات سے جواس کا رشتہ اب تک رہا تھا وہ اس رشتے سے بالکل مختلف تھا جو اس نے ان الفاظ، ان سروں مدھم رنگوں سے قائم کیا۔

خدا ساتی نہیں تھا، خدا چتیم تھا۔ ہری، شیام، کنہیا اور رام۔۔۔ موہے رام سے کوئی ملا دے۔ موہے رام سے۔ کوئی کہے وہ بسے اودھ میں کوئی کہے بندرابن میں۔۔۔ کوئی کہے وہ بسے اودھ میں۔۔

وہ مہینوں یونہی ادھر ادھر پھرا کیا۔ ایک بار وہ ایودھیا سے کئی مہینے تک واپس نہ آیا۔ کاشی میں اس کی ڈھنڈیا مچی۔ لاابالی سیلانی آدمی ہے بغداد لوٹ گیا ہوگا۔ کسی نے کہا مگر اسے بغداد سے کیا مطلب؟ وہ تو گھاگرا کے کنارے کنارے گھومتا پھرتا تھا، جب وہ لوٹ کر آیا اسے جولاہوں کی بستی واپس جاتے ہوئے ڈر سا لگا۔ گرو اسے ڈانٹیں گے تو نہیں کہ تم اب تک کس چکر میں مبتلا ہو، لیکن میاں کبیر اسے دیکھ کر مسکرا دیے۔ تال سوکھ کر پتھر بھیو، ہنس کہیں نہ جائے۔ پچھلی پیت کے کارنے کنکر چن چن کھائے انہوں نے کچھ دیر سوچ میں ڈوبنے کے بعد کپڑے کا تانا تیار کرتے ہوئے کہا۔

کمال وہیں مٹی سے لپے ہوئے فرش پر بیٹھ گیا اور کرگھے کی آواز سننے لگا۔ ہنس کہیں نہ جائے ہنس کہیں نہ جائے، وہ یہاں سے کہاں جا سکتا تھا پچھلی پریت کا ناطہ تو بہت گہرا ہوتا ہے۔ وفا کا مطلب اس کی سمجھ میں آیا۔ وفا کا راستہ تو اسے چمپا ہی نے سمجھایا تھا، وہ کبیر کے ساتھ ساتھ ایسے رہتا جیسے گنگا کے جلو میں جمنا جی بہتی ہیں اور چمپا اس کے ساتھ ساتھ اس طرح تھی جیسے سنگم کے ساتھ سرسوتی جو مادی آنکھوں کو نظر نہیں آتی۔

مگر یہ ساتھ بھی چند روزہ تھا۔ کاشی کے پنڈتوں اور مولویوں نے سلطان سکندر سے فریاد کی یہ بدعتی جولاہا عوام کو گمراہ کر رہا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر لوگوں نے گنگا میں ڈبو دیا مگر وہ ضدی جولاہا، جل تھل راکھت ہیں رگھوناتھ، کا نعرہ لگاتا پانی سے باہر نکل آیا۔

دلی کا سلطان بڑا دیالو اور دین دار مسلمان تھا، اس نے میاں کبیر سے کہلوایا کہ وہ شر سے محفوظ رہنے کے لئے کاشی سے کہیں دور چلے جائیں۔

۲۵

میاں کبیر بنارس سے جلاوطن ہوئے۔ شو پوری کا جنگل اجڑ گیا جہاں مولسری مہکتی تھی اور سدرشن کے پھول کھلے تھے۔ میاں کبیر کا کرگھا سنسان پڑا تھا، ان کے مکان پر خاموشی چھائی تھی۔ کمالی، ان کی چھوٹی سی بچی بستی کی گلیوں میں روتی پھرتی تھی۔ کاشی نواسیوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ کمال نے ایک بار پھر اپنا رخت سفر باندھا اور گنگا کے گھاٹ پر پہنچ کر بنگال جانے والے جہاز پر سوار ہو گیا، اس کے ایک سرے پر یہاں سے سینکڑوں میل دور گوڑ تھا جہاں وہ آج سے کئی سال ادھر اپنے سلطان کو تنہا چھوڑ کر چلا آیا تھا۔

چند ہفتوں بعد جہاز پٹنہ پہنچا۔ پٹنے میں اسے معلوم ہوا کہ سلطان حسین شرقی گوڑ سے بھاگل پور آ گیا تھا اور یہاں چند سال گزرے اسی جلاوطنی کے عالم میں خدا کو پیارا ہوا۔

سلطان حسین شرقی جس نے موسیقی کی دنیا میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا تھا۔ جنگوں میں لڑا بھڑا، جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا اور ختم ہو گیا۔

لیکن حسینی پیا، جس کی سلطنت چند روزہ تھی اور جسے زندگی میں امن نصیب نہ تھا، سر میں ڈوب کر زندہ رہا۔

سر کی لہروں پر بہتے ہوئے اب کمال نے نئی نئی دنیاؤں کی سیر شروع کی۔ نغمہ جو سب سے پہلے پیدا ہوا۔ نغمہ حق جسے کبیر انہد ناد کہتا تھا۔ باجت انہد ڈھول رہے۔ تجھے ہری ملیں گے، تجھے ہری ملیں گے، تجھے ہری ملیں گے۔

موسیقی کی یہ ساری دنیا اس کی اپنی تھی۔ جے دیو اور ودیا پتی اور چنڈی داس کے بھجن، ماہی گیروں اور کسانوں کے گیت، کوچہ گرد فقیروں کے لحن۔ اس دنیا میں حملوں اور شب خونوں اور فوجوں کی یلغار، سیاسی تلاطموں، جلاوطنی اور موت کا کھٹکا نہ تھا۔ موسیقی کی وحدت خدا کی وحدت تھی۔

بنگال پہنچ کر وہ گنگا کے کنارے ایک ایسے گھاٹ پر اترا جس کا نام اس کو معلوم نہ تھا۔ یہاں پان کی بیلیں پھیلی تھیں اور دھان کے کھیت تھے اور جھیلوں میں نیلے پھول کھلے تھے۔ برگد کے درخت کے نیچے کسی مرشد کی خانقاہ تھی، اس نے وہیں رہنا شروع کر دیا۔ بنگال جو سریلی آوازوں کا وسیع بھنور تھا۔ باول گانے والوں کی ٹولیاں اک تارہ بجاتی گلی گلی گھومتیں۔ داستان گو گا گا کر روپ کتھائیں سناتے۔ مانجھی اور سپیرے اور ہاتھی پکڑنے والے ہر سمے گاتے رہتے۔ کرشن اور رادھا کی محبت میں ہر انسان سرشار نئے راگ الاپتا پھرتا تھا۔ اس سحر انگیز سرزمین کے باسیوں کی رگ رگ میں موسیقی رچی تھی۔ کمال ان کوچہ گرد شاعروں کے ساتھ

سارے میں گھومتا پھرا۔ پورب میں دریاؤں کی لہروں پر اپنی ناؤ کھیتا وہ چاٹگام کی پہاڑیوں اور اراکان تک جا پہنچا۔ یاتریوں کے ساتھ وہ سیتا کنڈ گیا جہاں اونچی پہاڑی پر، جس کے دونوں طرف گہرے کھڈ تھے اور جن میں باگھ گھومتے تھے، سیتا مہارانی کا مندر تھا۔ پہاڑی کے گھنے پرخطر جنگلوں میں صدیوں پرانے مٹھ تھے اور پہاڑی کے دامن میں سنگ سرخ کے تالاب کے کنارے کنارے معبد بنے تھے اور برگد کے درختوں کے نیچے لڑکیوں کی ٹولیاں بیٹھی کیرتن گاتی تھیں۔

چاٹگام کا علاقہ دلفریب تھا۔ بل کھاتے تند رو عظیم دریا، خطرناک بن، خوشبودار پھول اور پھل، سرسبز پہاڑی راستے، بانس کے گھنے جھنڈ جن کے اندر عمیق تاریکیوں میں خانقاہیں تھیں۔

ایک روز وہ ان جنگلوں میں سے گزر رہا تھا اسے ایک تالاب کے کنارے چند لوگ اکتارہ بجا کر گاتے دکھلائی دیے، وہ ان کے قریب پہنچا۔ یہ نظام ڈاکو کا گیت تھا جو وہ لوگ لہک لہک کر انتہائی عقیدت کے ساتھ گا رہے تھے، اس کی دھن کیرتن کی ایسی تھی۔ ایسی نعمت کمال نے آج تک نہ سنی تھی، وہ دلچسپی سے کان لگا کر سننے لگا۔ اس گیت کا مصنف ان علاقوں کا بہت بڑا ڈاکو تھا جو سو سال گزرے یہاں لوٹ مار مچایا کرتا تھا اور پھر صوفیوں کی سنگت میں پڑ کر خود بھی بہت بڑا اولی اللہ بن گیا تھا۔

اگر محمدؐ اوتار جنم نہ لیتے ۔۔۔ کیرتن منڈلی نے گایا ۔۔۔

تو اللہ کی حکومت ترلوک میں قائم نہ ہوتی۔

نمو نمو ہے عبداللہ او رآمنہ

جے ہو مکہ نگری کی اور سارے اولیاء کی اور بی بی فاطمہ کی جو سارے جگ کی ماتا ہیں۔ جے ہو اتر میں ہمالیہ کی جس کے قدموں میں ساری کائنات پھیلی ہے۔

جے ہو پورب سے نکلتے سوریہ کی

اب میں وندرابن کے سامنے جھکتا ہوں۔

بھگوان کرشن اور شری رادھے کو اور چاروں کھونٹ ندیوں اور ساگروں کو میرا پرنام

جے ہو مسلمانوں کے فرقوں کی

جے ہو دھرتی ماتا اور پوتر سنکھا ندی کی

نو پاڑا کی مسجد کو میرا پرنام

کیونکہ وہ بڑا پیر ایک باران خطوں سے گزراتھا

اب میں آگے بڑھ کر سیتا گھاٹ پہنچتا ہوں۔ آدرش استری سیتا دیوی اور ان کے

مہاراج رگھوناتھ کو میرا پرنام

جے ہو۔۔ جے ہو۔۔ جے ہو۔۔

کمال حیرت زدہ بیٹھا یہ عجیب و غریب نعت سنتا رہا اور پھر گانے والوں کی آواز میں آواز ملا کر خود بھی گانے میں شامل ہو گیا، اب وہ بغداد سے ہزاروں لاکھوں میل دور نکل آیا تھا۔۔ مذہب اپنے گرد و پیش، اپنے ماحول اور پس منظر سے کس طرح متاثر ہوتا ہے، کس طرح اس کی جڑیں ایک اجنبی سرزمین میں پھیلتی ہیں۔ کمال گاتا رہا۔ جے ہو جے ہو۔۔ جے ہو۔

اب وہ ایک نئی زبان سیکھ رہا تھا، یہ بنگالی زبان تھی جو اودھ اور بہار کی بولیوں سے زیادہ مختلف نہ تھی اور سنسکرت سے قریب تر تھی اور ملک کی دوسری جدید زبانوں کی طرح تیزی سے اس کی نشوونما ہو رہی تھی۔

یہ بڑی میٹھی زبان تھی۔ اب وہ اسے اپنی زبان سمجھنے لگا۔ اسی میں بات چیت کرتا، اسی میں سوچتا، اسی میں لکھتا۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ دربار جونپور کے ایک امیر کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔ گو وہ دربار اس وقت لٹ چکا تھا لیکن حسین شرقی اور اس کے ساتھیوں کی شان و شوکت بہر حال باقی تھی لیکن دنیا تو اب مدتیں ہوئیں جونپور کے ابوالمنصور کمال الدین کو بھول چکی تھی۔ کسی کو کیا معلوم کہ یہ خوبصورت نوجوان، جس کے سر کے بال کنپٹیوں پر سے تھوڑے سفید ہو چکے ہیں اور جو چمپا کے درخت کے نیچے بیٹھا ایک باول سے کنچن مالا کی کہانی سن رہا ہے۔ یا اک تارہ بجا بجا کر کبیر داس کی کوئی بانی الاپ رہا ہے یا کاغذ قلم لئے بنگال زبانی میں کوئی لوک کہانی قلمبند کرنے میں مصروف ہے، یہ کون ہے؟

گاؤں کے اور باول گانے والوں سے گیت کتھائیں سنتے اس سر زمین کے بہت سے مناظر اس کی نظروں کے سامنے سے گزرے۔ پال بادشاہوں کا بنگال جب گوتم بدھ کے پجاری یہاں موتی رولتے تھے۔ جب پدما اور بھاگیرتی اور مدھومتی پر میور پنکھی جہازوں کے بجرے تیرتے تھے۔ جب ان سایہ دار راستوں پر سے پھولوں سے ڈھکے پشپ رتھ گزرتے تھے جن میں بیٹھی چترنی ناریاں مدھر مدھر ہنستی تھیں۔ جگمگاتے محلوں میں رہنے والی ملکہ مینامتی۔ زرنگار چتر ڈولوں کے

سرخ پردوں سے جھانکتی دلہنیں، وہ سب کہاں گئیں؟ وہ شان وشوکت کا زمانہ کیسے ختم ہوا؟ بدھ بنگال جو ہیرے جواہرات اور سونا اور چاندی اور موتی رولتا تھا وہ سب کیا ہوا؟ اب تو سین بادشاہوں کے محلوں میں بھی الو بولتے تھے۔ گوتم بدھ اور دیبی تارا اور درگا بھوانی اور وشنو کے پجاری دھڑا دھڑ مسلمان ہوتے جا رہے تھے۔ تاریخ کے نقشے کس طرح بدلتے ہیں، کمال آنکھیں بند کر کے سوچتا۔

کئی سال تک وہ اسی طرح کہانیاں اور گیت لکھتا رہا، وہ۔۔۔ مورخ، محقق، سیاستدان، سپاہی، صوفی، کبیر کا چیلا۔۔۔ اب گیت کار بن چکا تھا۔

اسی طرح گھومتے پھرتے وہ سونار گاؤں پہنچا اور وہاں اس نے شادی کر لی۔ اس لڑکی کا نام شنیلا تھا، وہ ذات کی شودر تھی۔ ایک روز جب وہ تالاب کے کنارے گاگر لے کر آئی تھی کمال اس کے لمبے بالوں اور سیاہ پلکوں پر عاشق ہو گیا، یہ عمر اور ذہنی پختگی عشق کرنے کی نہیں تھی لیکن روح اور دل کی کائناتوں کی ساری مسافتیں طے کرنے کے بعد اس نے اندازہ لگایا کہ زندگی میں اصل چیز سکون ہے، ایسا سکون جس میں پر خطر طوفانوں اور آندھیوں کی گنجائش ہی موجود نہ ہو۔ یہ سکون اسے اس سیدھی سادی ان پڑھ دیہاتی لڑکی سے شادی کر کے حاصل ہو گیا۔ گویا یہی اس کی منزل تھی۔ جونپور کی شہزادی ایک بہت دھندلا سا خواب تھا جو اسے یاد بھی نہیں رہا تھا۔ ایودھیا کی برہمن زادی اس کی روح اور دل کے اس تہہ خانے میں موجود تھی جس کے دروازے مقفل کر کے اس کی کنجی اس نے خودندی میں پھینک دی۔

کیونکہ یاد زندگی کا سب سے بڑا عذاب ہے۔

شنیلا اب اس کی بیوی تھی، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ شودر ہونے میں کیا قباحت ہے۔ اس نے شنیلا کا نام آمنہ بی بی رکھا اور اس کے ساتھ ایک خوبصورت بانس کے جھونپڑے میں رہنے لگا۔

گزر اوقات کے لئے وہ کھیتی کرتا، اس کے کھیت میں دھان بوئے تھے اور اس کے جھونپڑے کے سامنے چھوٹا سا تالاب تھا جس میں سنگھاڑے تھے اور کنول کے پھول اور جس میں روپہلے پروں والی بطخیں تیرتی تھیں۔ جب آسمان پر اندر کی کمان نکلتی اور جوہی کے پھولوں پر بھونرا گنگناتا تو وہ اپنے چھوٹے سے مکان کے برآمدے میں اپنے ساتھی گیت کاروں کے ساتھ بیٹھ کر آنند لہری بجاتا۔ آمنہ اپنے لوچدار جسم پر تیز جامنی یا تیز سبز رنگ کی ساری لپیٹے پیتل کا گھڑا کمر پر سنبھالے تالاب کی اور جاتی نظر آتی۔

دن گزرتے گئے۔ دکھی بنگال نے، جس کے سلاطین ہمیشہ آپس میں کٹتے مرتے رہتے تھے، اب چند دنوں سے چین کا سانس لیا تھا۔ گوڑ کے تخت پر سید السادات علاءالدین ابوالمظفر حسین شاہ براجمان تھا۔ وسط ایشیا کے شہر ترمذ سے آئے ہوئے خاندان کا یہ غریب سید، جو سلطان ابن سلطان نہیں تھا اور جس کی شرافت اور قابلیت کی بنا پر عوام نے اسے خود منتخب کر کے اپنا بادشاہ بنایا تھا، اس کے عہد میں دودھ کی ندیاں بہتی تھیں۔ قتل و غارت کے بازار سرد ہو چکے تھے، ایک نئی زبان کو پروان چڑھایا جا رہا تھا۔ بنگال کا یہ عظیم ترین مسلمان بادشاہ جس کے دور میں ودیا پتی ٹھاکر اور مہاپربھو چیتن سری کرشن کے عشق کے سریلے نغمے الاپ رہے تھے۔ راج محل کی پہاڑیوں سے پتھر بہا بہا کر گوڑ لائے جا رہے تھے اور نئی

نئی خوبصورت عمارتیں تعمیر کی جارہی تھیں۔ دربار میں علمی مجلسیں آراستہ ہوتی تھیں۔

کئی برس بیت گئے۔ کمال کے بچے جوان ہو چکے تھے، اس نے اپنے لڑکوں کے نام جمال اور جلال رکھے تھے، اس کی لڑکی کا نام سکینہ بی بی تھا، وہ اپنی اولاد کی صورت دیکھ کر جیتا تھا۔ اس کے دونوں لڑکے ماہر تعمیرات تھے اور گوڑ اور ستار گاؤں میں عمارتیں بنوانے میں مصروف تھے۔ گوڑ کی چھوٹا سونا مسجد اور گن منت مسجد کا نقشہ جمال نے تیار کیا تھا۔ جمال گوڑ کا میر عمارت تھا۔ بڑا سونا مسجد کی سبز اور نیلی اور سفید اور زرد اور نارنجی پچی کاری میں بنگال کے سارے رنگ سمیٹ لیے گئے۔ ان کے ستون، ان کی محرابیں اور گنبد خالص دیسی تھے۔ یہ عمارتیں بھی پال اور سین عہد کی تعمیرات کی روایت میں شامل ہو گئیں۔ یہ بنگالی طرز تعمیر تھا۔ کمال کی لڑکی کی شادی بردوان کے مرشد زادوں کے یہاں ہوئی تھی۔ اس کی بی بی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے آمنہ کو اپنے ہاتھوں سے اسی تالاب کے کنارے دفن کیا تھا۔ اب اس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اب بھی وہ دن بھر برآمدے میں بیٹھا مرشدی اور معرفتی نغمے لکھتا اور گاتا، اس کے بیٹے گوڑ سے اپنے گاؤں واپس آتے اور اسے ملک کی سیاست کی خبریں سنایا کرتے، لیکن یہ خبریں اب ایس بالکل کسی دوسرے سیارے کی باتیں معلوم ہوتیں۔

کیونکہ بغداد کا ابوالمنصور کمال الدین، جو پچاس سال ادھر عراق سے ہند آیا تھا، کوئی دوسرا انسان تھا۔ یہ کوئی مختلف انسان تھا جو بالوں کی لٹیں اور داڑھی بڑھائے چارخانہ تہمد باندھے ہاتھ میں ایک تارہ لئے ویشنو نغمہ الاپ رہا تھا۔

ابو المنصور کمال الدین بنگالے کا باشندہ تھا۔ بنگالی تھا، چنانچہ جب دور پچھم دلی میں ایک بار پھر سلطنت بدلی اور سلطان ابراہیم ہارا اور ترچھی آنکھوں والا منگول ظہیر الدین جیتا اور دنیا کا بوجھ سہارنے والی گائے نے اپنا سینگ تبدیل کیا تو اپنے بڑے لڑے جمال سے یہ سارے سنسنی خیز واقعات سن کر اس نے ذرا سی بھی حیرت کا اظہار نہ کیا۔ اس کے بیٹے جلال نے اس سے کہا کہ وہ مغلوں کے لئے عمارتیں بنانے دلی جا رہا ہے تب بھی وہ خاموش رہا، اس نے ساری دنیا گھوم کر اپنی منزل تلاش کی تھی۔ اب دنیا اس کے بیٹوں کے سامنے پھیلی تھی، وہ بھی اپنی منزلیں خود تلاش کریں گے۔

مگر اب امن کے دن ختم ہونے والے تھے۔ بنگالے پر سید علاء الدین حسین شاہ کے بیٹے ناصر الدین نصرت شاہ کی حکومت تھی۔ مغلوں سے ہارنے کے بعد دلی کے افغان، جو کل حکمرانی کرتے تھے، آج پناہ گزینوں کی حیثیت سے گوڑ اور لکھنوتی کے گلی کوچوں میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مرتبہ جونپور کے حکمران انہی افغانوں سے مار کھا کے یہاں پناہ لینے آئے تھے۔ یہ افغان کمال کو ہر جگہ ملتے اور گوڑ کے بازاروں میں راستہ چلتے چلتے لوگوں کو روک روک کر انہیں اپنی گزشتہ عظمت اور جاہ وجلال کے قصے سناتے۔ گوڑ کی گلیوں ہی میں کمال نے ایک روز ایک پرتگالی دیکھا جو اکڑتا ہوا ایک سمت کو چلا جا رہا تھا۔ کمال اپنی لاٹھی کے سہارے کھڑا اچنبھے سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے برسوں پہلے کا وہ اندھا برہمن یاد آیا جو ان سے ہارنے کے بعد کوچین سے کاشی آیا تھا۔ اس وقت پرتگالیوں کا جہازی بیڑا چاٹگام کی بندرگاہ میں موجود تھا اور وہ لوگ گوڑ میں بھی

دندنا رہے تھے۔

وقت تیزی سے نکلتا گیا۔ گوڑ کے سیاسی حالات بگڑنا شروع ہوئے۔ اب وہاں ناصرالدین کا بھائی غیاث الدین راج گدی پر بیٹھا تھا۔

ایک روز کمال نے خبر سنی کہ بہار کے شیر خان نے غیاث الدین سے بنگالے کا تخت چھین لیا، پھر معلوم ہوا کہ دلی کے شہنشاہ ہمایوں اور شیر خان میں گھمسان کا رن پڑا اور ایک روز چند باولوں نے آ کر کمال کو بتایا کہ مغل بادشاہ دھوم مچاتا گوڑ میں داخل ہو چکا ہے اور اسی کے نام کا سکہ ٹکسال میں گھڑا جا رہا ہے۔ دور دراز ترکستان سے آئے ہوئے تاتاری پر بنگال نے ایسا جادو کر دیا کہ اس نے گوڑ کا نام جنت آباد رکھا ہے، یہ سب خبریں کمال کو بڑی عجیب بچپنے کی معلوم ہوئیں۔ بادشاہتیں بدلتی ہیں تو جگہوں اور انسانوں کے نام بھی بدل دیے جاتے ہیں۔ انسان اپنے اقتدار کا سکہ جمانے کا کس قدر شوقین ہے؟ ہرے بھرے بنگال کی بدامنی بڑھتی گئی۔ شیر خان پھر گرجتا ہوا آیا اور دلی کے مغل کو واپس دلی بھگا کر دوبارہ بنگال پر قابض ہو گیا۔ ملک سہا ہوا تھا۔ ہمایوں اور شیر شاہ میں بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ اسی لڑائی میں جمال گوڑ کی گلیوں میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ ایک رات شیر خان کے سپاہیوں نے اس گاؤں کا بھی محاصرہ کر لیا جہاں کمال کی جھونپڑی تھی۔ سپاہی لوٹ مار مچاتے اس کے گھر تک آن پہنچے، باہر نکلو، وہ چلا رہے تھے۔ تم سب سے بڑے فسادی ہو، تمہارا کوئی بھروسہ نہیں، تمہارے بیٹے دلی جا کر مغلوں سے مل گئے ہیں۔ تم غدار ہو، تم کو تو ہم جان سے مار دیں گے، تم کو گوڑ لے جا کر قید خانے میں ڈال دیں گے۔ ارے وہ گیت بنانے والا ابوالمنصور یہیں رہتا ہے نا۔

باہر نکل او بڈھے، اندر کس سازش میں لگا ہے۔ کمال کانپتے ہوئے ہاتھوں میں چراغ اٹھا کر دروازے تک آیا اور حیرت سے سپاہی کو دیکھنے لگا، وہ غل مچاتے اس کی اور بڑھے، کمال مضبوطی سے دروازے کی چوکھٹ تھام کر ان کے سامنے ڈٹ گیا، وہ بہت بوڑھا پھونس ہو چکا تھا اور اس کے ہاتھوں میں رعشہ تھا مگر وہ جم کر کھڑا رہا۔ اس کے پاس اپنی مدافعت کے لئے تلوار بھی نہیں تھی، وہ گوڑ لے جایا جائے گا؟ اس نے کس کا قصور کیا ہے؟ اسے افغانوں اور مغلوں کے جھگڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں، وہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ یہاں اسے امن سے رہنے دیا جائے۔ یہ اس کا ملک ہے۔ اس کا وطن! یہاں اس کے بچے پیدا ہوئے ہیں۔ یہاں اس کی بی بی کی قبر ہے، یہاں اس کے دھان کے ہرے کھیت ہیں، اس نے اس زبان کی آبیاری کی ہے۔ اس نے گیت بنائے ہیں، وہ یہیں رہے گا۔ اسے غدار کہنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ یہ دارالحرب نہیں ہے دارالسلام ہے۔ اس لمحے اسے انکشاف ہوا دارالحرب اور دارالسلام میں کوئی فرق نہیں، صرف رویے کا فرق ہے، لڑائیاں دو مذہبوں کے درمیان نہیں ہوتیں دو سیاسی طاقتوں کے درمیان ہوتی ہیں۔

سہسرام کا شیر خاں اور دلی کا ہمایوں بادشاہ دونوں کلمہ گو ہیں لیکن ایک نے آ کر دوسرے کا قلع قمع کر دیا۔ دارالسلام بھی دارالحرب بن سکتا ہے اگر اس میں شر کا وجود ہو۔

شیر خاں کی فوج کے اجڈ سپاہی یہ سب کہاں سمجھ سکتے تھے۔ انہوں نے زور سے کمال کو دھکا دے کر گرایا اور بلڑ مچاتے آگے بڑھ گئے۔

کمال اپنے گھر کی دہلیز پر اوندھے منہ گرا، اس کے منہ سے خون کی ندی بہہ گئی

اور چند گھنٹے تک سسکتے رہنے کے بعد وہ اسی طرح پڑا پڑا خاموشی سے ختم ہو گیا۔

ہند پر اب مغل شہنشاہوں کا راج ہے، پرانا نظام بدل چکا ہے۔ گوڑ اور لکھنوتی اور پٹنہ اب خواب وخیال ہوئے۔ ترکوں کی دلی کا بھی خاتمہ ہوا۔ دلی اب مغلوں کی ہے۔

لیکن وہ کسان موجود ہے، وہ جو گھٹنوں تک پانی میں جھکا دھان کی فصل بو رہا ہے، وہ جو بیلوں کی جوڑی ہنکاتا میگھنا کے کنارے کنارے جا رہا ہے، وہ بھاگرتی کی سطح پر کشتی کھیتا اور گیت گاتا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کی سمت رواں ہے، وہ مرشدوں اور بھگتوں کے قدموں میں بیٹھا کیرتن اور معرفتی نغمے الاپ رہا ہے۔

بنگال کا کسان ابوالمنصور کمال الدین زندہ ہے اور زندہ رہے گا، وہ تو اپنے چھوٹے سے نوکے میں بیٹھا پدما کی تند رو موجوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔ نوکا پدما کی لہروں پر ڈولتا جا رہا ہے۔ آگے جدھر گھپ اندھیرا ہے اور فضاؤں میں طوفان لرز رہے ہیں اور تاریک دھاراؤں میں مہیب ناکے منہ پھاڑے بیٹھے ہیں اور ہوائیں بہت تیز ہیں مگر پدما کے اس بوڑھے فاقہ زدہ ملاح کی کشتی بڑے مزے سے عناصر کا مقابلہ کر رہی ہے کیونکہ عناصر کی بے رحمی اور موت اور خطروں سے اس کی پرانی دوستی ہے۔

آخر جب ہوا کا زور زیادہ بڑھا اور کشتی بار بار ڈولنے لگی تو سرل نے لالٹین اٹھا کر گھبراہٹ کے ساتھ چاروں طرف نظر ڈالی۔ ''پیٹر ہم طوفان میں تو نہیں پھنس گئے؟'' اس نے پریشانی سے سوال کیا۔

''نہیں، یہ تو معمولی سی ہوا ہے، پریشان مت ہو۔'' پیٹر نے جواب دیا۔ ''مگر

ذرا اس کالے سوّر سے کہو کہ اپنا بھونڈا اگانا الاپنے کے بجائے چپوار کی طرف زیادہ توجہ کرے ورنہ اس طرح ہم گھاٹ پر صبح تک نہ پہنچ پائیں گے۔''

''سو رہا ہے کیا بوڑھا کتا۔'' سرل نے چٹائی کی چھت پر جھک کر دوسری اور جھانکتے ہوئے کہا۔ مانجھی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور صبر کے ساتھ چپوار چلانے میں مصروف رہا۔ ''یہ بڑے ذلیل لوگ ہیں۔ جب تک ہنٹر نہ لگاؤ ان میں چستی نہیں آتی۔'' پیٹر نے کہا۔ سرل نے دور سے اپنی نقرئی موٹھ کی چھڑی بڑھا کر بوڑھے کی کمر میں چھوئی۔

''او آدمی۔ کیا نام ہے تمہارا؟''

''ابوالمونشور۔۔۔صاحب۔''

''ابوالمونشور۔۔۔ اگر تم چاہتے ہو کہ اسی ہنٹر سے میں تمہاری کھال نہ ادھیڑ دوں تو تم ذرا زیادہ طاقت سے چپوار چلاؤ۔۔سمجھے۔''

''جی صاحب۔'' وہ پھر چپوار پر جھک گیا، نوکا چلا کیا۔ کنارے پر دونوں طرف اناس اور کیلے کے جھنڈ تھے۔ دور گاؤں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ سرل نے نوکے کی چھت کے اندر جھانکا جہاں ابوالمنشور کا مٹی کا دیا اور چٹائی اور جاءنماز اور دو کانسی کے برتن رکھے تھے۔ دیوار پر ناریل آویزاں تھا، یہ اس بوڑھے پھونس سفید داڑھی والے کی ساری کائنات تھی جو پدما کے طوفانی پانیوں پر ڈولتی تھی۔ سرل کو بڑا عجیب سا لگا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور خود کو یقین دلانا چاہا کہ یہ سب صحیح ہے کہ قسمت کے ایک انوکھے داؤ نے اسے کیمبرج کی گلیوں سے نکال کر یہاں اس نوکے میں لا بٹھلایا ہے۔ اس عجیب وغریب ملک میں جسے ''بنگال'' کہتے

ہیں۔جسے ''انڈیا'' کہتے ہیں۔

لالٹین اٹھا کر اس نے چاروں اور نظر ڈالی۔روشنی سے لہروں پر راستہ سا بن گیا۔برابر سے ایک بڑا اشمپان گزر گیا۔چاند بہت دور بید کے درختوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ کاہلی کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔

۲۶

جب سرل ہاورڈ ایشلے نے کوئنز کالج کیمبرج سے بی۔اے کیا اس وقت اس کی عمر صرف بیس سال کی تھی،اس کا باپ ایک بہت مفلوک الحال پادری تھا اور سرل بڑی مشکلوں سے اپنے قصبے کے زمیندار کی مدد حاصل کر کے کیمبرج تک پہنچ پایا تھا۔ڈگری حاصل کرنے کے بعد لندن آ کر اس نے مڈل ٹمپل میں داخلہ لیا۔یہاں پڑوس میں فلیٹ اسٹریٹ تھی جس کے قہوہ خانوں میں لکھنے والے اور اخبار نویس جمع ہو کر دنیا جہاں کی باتیں کیا کرتے۔اکثر سرل بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کی محفلوں میں شریک ہوتا یہیں ایک روز ایک شراب خانے میں سرل کی ملاقات پیٹر جیکسن سے ہوئی جو ہندوستان میں تجارت کرتا تھا اور ان دنوں وطن آیا ہوا تھا،وہ اسے موٹی آواز میں تفصیل سے بتاتا رہا کہ بنگال میں اسے نیل کی کاشت میں کتنے ہزار پاؤنڈ کا نفع ہوا۔نیٹو کس قدر بے وقوف ہوتے ہیں۔ان کے امراء کتنے دولت مند ہیں۔کلکتہ کس قدر دلچسپ شہر ہے۔تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ ہندوستان چلو۔تم سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہو،اگر عقل سے کام لیا تو چار روز

میں وہاں سونے کے محل کھڑے کرلو گے۔۔۔کیا کہا؟ تم شاعری کرنا چاہتے ہو۔ ڈرامے لکھا کرو گے؟ وکالت بڑا نوبل پیشہ ہے۔۔تمہارا دماغ خراب ہے۔چند روز بعد پیٹر اسے سٹی میں اپنے چچا کے پاس لے گیا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک ڈائریکٹر تھا۔

سرل کو کلکتے میں ملازمت مل گئی۔ایک روز وہ ٹل بری سے ایک انڈیا مین پر بیٹھا اور ڈوور کی سفید چٹانیں اس کی نظروں سے اوجھل ہونا شروع ہوئیں تو اسے احساس ہوا کہ وہ انگلستان چھوڑ رہا ہے۔انگلستان جہاں کینٹ میں اس کا قصبہ ہے اور جہاں کیم بہتا ہے اور جہاں گولڈ اسمتھ اور کوپر اور گرے اور برک نے جنم لیا تھا، جہاں ہوگارتھ اور گینز برو اور رینالڈز نے تصویریں بنائی تھیں۔ٹرنر کے سورج کی روشنی میں ڈوبے ہوئے مناظر اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوئے اور لندن کی گلیوں میں سودا بیچنے والیوں کی آوازیں اور قصباتی گرجا گھروں کے گھنٹوں کی صدائیں اور بلند و بالا جارجین محلات میں سے بلند ہونے والی چیمبر موسیقی مدھم ہوئی۔انگلستان جہاں سکون تھا اور مکمل حسن۔بنگال اور کینیڈا اور جنوبی امریکہ سے آئی ہوئی دولت نے ملک کو مالا مال کر دیا تھا۔نت نئے فیشن ایجاد ہو رہے تھے،اونچے اونچے قصر تعمیر کیے جا رہے تھے،باغات سجائے گئے تھے،غریب امیر ہو چکے تھے،امیر ہیرے موتی رولتے تھے،ہر طرف صرف ایک چرچا تھا۔ دولت۔دولت۔سرل جو ادب کا اسکالر تھا،جسے دولت سے غرض نہیں تھی،وہ بھی اسی دھن میں جا رہا تھا،وہ مفلس طالب علم بنگال پہنچ کر امیر ہو جائے گا۔لندن میں اس کا بھی ایک محل ہو گا،یا کون جانے شاید وہ کسی وحشی ہندوستانی سردار سے

جنگ کرتا ہوا مارا جائے اور مدراس یا میسور میں اس کی گمنام قبر بنے۔

اس نے ایک پھریری لی اور ڈیک سے ہٹ آیا۔ سمندر بہت بھیانک تھا۔ دنیا میں اس وقت کیا کیا ہو رہا تھا اور وہ دراصل خود کتنا حقیر تھا۔ اس جہاز پر کیسے کیسے لوگ سوار تھے اور کیسے کیسے ارادے اور تمنائیں لیے اس اندھیرے میں ایک منزل کی سمت رواں تھے۔ ان سب کا حشر کیا ہوگا؟ کمپنی کے تاجر، کلکتہ کونسل کے وہ ممبر جو رخصت کے بعد واپس جا رہے تھے، مدراس کا چیف جسٹس، اعلیٰ خاندانوں کی چند بن بیاہی لڑکیاں جو حسب معمول اس امید میں ہندوستان جا رہی تھیں کہ وہاں ان کی شادیاں ہو جائیں گی، جہاز کا کپتان حیدر علی کے معرکے کے قصے سنا رہا تھا، پٹنے اور ڈھاکے کے نیل کے تاجر ہر وقت اپنی کاروباری باتوں میں مگن رہتے اور سب کے سب متواتر مڈیرا پیتے۔ کوئنز کالج کیمرج کے خاموش کواڈرینگل سے نکلنے کے بعد سرل نے دیکھا دنیا دراصل یہ تھی۔

پھر جہاز جنوبی افریقہ کے ساحلوں سے پاس سے گزرتا ہندوستان کے قریب تر ہو گیا۔ راس امید تک پہنچتے پہنچتے سرل نے اندازہ لگایا کہ ایک بن بیاہی اعلیٰ خاندان کی لڑکی اس پر ڈورے ڈال رہی ہے، وہ ان سب میں معمولی شکل کی تھی اور کسی فوجی کپتان سے شادی کرنے جا رہی تھی جو فورٹ جارج میں تعینات تھا، مگر وہ سرل کی صورت پر ریجھ گئی، پھر اس نے جہاز کے کپتان اور دوسرے ساتھیوں سے سرل کے مالی حالات کا پتا لگایا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ ابھی بہت غریب ہے اور کمپنی میں فیکٹر کی حیثیت سے ملازم ہو کر جا رہا ہے اور لڑکیوں کے بجائے فی الحال کتابوں میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ اس کے بعد مس ازابیل نے شورے کے ایک

موٹے تاجر سے عشق لڑانا شروع کر دیا۔ جہاز کی اس چھوٹی سی دنیا میں یہ سب نہ ہوتا تو مہینوں کا سفر اجیرن ہو جاتا۔

دنیا بدلتی جا رہی تھی، وہ سکون، جس میں ڈوبا ہوا انگلستان وہ اپنے پیچھے چھوڑ کر آ رہا تھا، زیادہ دن اس حالت میں نہیں رہے گا۔ نئے نئے کارخانوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں نے اس کے وطن کے پھولوں کی رنگت بدل دی تھی۔

پھول، بہاریں، پیرس، ہائے پیرس، وائے۔۔۔سرل نے ایک گہری سانس لی۔پیرس بھی تو ابھی ابھی خون میں نہایا تھا۔انقلاب۔۔۔۔؟

روسو۔والیٹر۔آزادی۔؟

امریکہ کی جنگ آزادی۔؟

جہاز اب مڈغاسکر کے پاس سے گزر رہا تھا۔یہ مشرق تھا۔حبشی غلاموں کا وطن اور مشرق سرل کا منتظر تھا۔چین اور ہندوستان اور ایران اور مصر سب چلا چلا کر اسے پکار رہے تھے، او بھائی سرل آؤ ہم نے تمہارے سواگت کے لیے ساری تیاریاں کر رکھی ہیں۔انجیلیں لے کر اور بندوقیں اور تلواریں لے کر آؤ اور آ کر ہماری کھال اتار لو۔کانپور اور ڈھاکے کے پرانے پاپیوں نے اسے بتانا شروع کیا: سمجھ سے کام لو تو چند سال میں لکھ پتی بن جاؤ گے۔

"یہ سراج الدولہ کون تھا۔" سرل نے پیٹر جیکسن نے پوچھا۔

"سراج الدولہ" پیٹر نے ناک بھوں چڑھائی۔"میں تم کو اس کا سارا واقعہ تفصیل سے سناؤں گا۔میں قاسم بازار میں رہ چکا ہوں، بڑا سخت بیہودہ تھا۔ظالم، مکار، مگر ہمارے وفادار دوست بھی ہیں۔مثلاً اودھ کا موجودہ نواب۔

''وہ کون ہے؟''

پیٹر جیکسن نے سرل کو فیض آباد اور لکھنؤ کی الف لیلوی داستانیں سنانا شروع کیں، پھر میسور والوں کا اور ارکاٹ کا تذکرہ کیا۔ بمبئی پہنچتے پہنچتے سرل پچھلے دوسو سال کے واقعات سے واقف اور ہندوستان کی پوری تاریخ کا ماہر ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کی بربریت۔ ایک سرخ زبان والی مورتی کو پوجتے ہیں۔ بیواؤں کو آگ میں زندہ جلاتے ہیں۔ ننگے پیر گھومتے ہیں۔ گائے اور بندر اور سانپ کو خدا سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کے مظالم۔ عورتوں کو پردے میں گھونٹ کر رکھتے ہیں۔ پندرہ پندرہ شادیاں کرتے ہیں۔ غرضیکہ پیٹر جیکسن نے جو کچھا سے بتایا وہ خاصا پریشان کن تھا مگر بہر حال حقائق سے کون چشم پوشی کر سکتا ہے اور یہ سب تاریخی حقائق تھے جن پر پیٹر جیکسن نے روشنی ڈالی تھی۔ یہ طے شدہ بات تھی کہ نیٹو بلحاظ نسل کمتر تھے۔ ایشیائی سارے اور ہندوستانی بالخصوص گھٹیا درجے کے انسان تھے۔ عثمانی ترکوں سے بھی بدتر کیونکہ عثمانی ترک کم از کم سفید فام تو تھے۔ ''نیٹو چونکہ نسلاً گھٹیا ہیں۔ لہٰذا ان کے دماغ بھی بے حد پست ہیں۔ بنگال میں ایک رائل ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی گئی ہے جو کھود کھود کر جانے کس زمانے کی بکواس نکال رہی ہے۔ سنسکرت اور فلانا اور ڈھماکا۔ مردہ زبانیں جن میں جادو ٹونے کے نسخے لکھے ہیں۔ اس پر ہمارے چند محققوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ہندوستانی بھی ایک زمانے میں مہذب تھے۔'' پیٹر نے بات ختم کی۔

سامنے بمبئی کا ساحل نظر آ رہا تھا۔

ہندوستان۔۔۔!!

جہاز بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا۔ مسافر اتر کر ساحل پر آ گئے۔ ڈیڑھ سو سال قبل تک سورت کی بندرگاہ پر مغل کسٹم افسر یورپیوں کا ناطقہ بند کر دیا کرتے تھے مگر اب اپنی حکومت تھی۔ سرل کے سارے ساتھی ٹھاٹھ سے سیٹی بجاتے جہاز سے اترے اور بہت سے سیاہ فام انسانوں نے آ کر ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور دوڑ دوڑ کر ان کا اسباب اتارنے میں مشغول ہو گئے۔ پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی پالکی پیٹر کے استقبال کے لیے آئی ہوئی تی۔ سرل اس کے ساتھ پالکی میں بیٹھ کر مالابار ہل کی طرف چلا۔

سڑک کے دونوں طرف دولت مند پارسیوں کے مکان تھے، جن کی عورتیں لکڑی کی بالکنیوں میں سے جھانک رہی تھیں اور نیچے بچے کھیل رہے تھے۔ مضبوط جسموں والی مراٹھی عورتیں تیز رنگوں کی ساریاں پہنے ساحل کی ریت پر چل رہی تھیں۔ مالابار ہل پر پھول کھلے تھے۔ بارش ابھی ہو کر تھمی تھی۔ انگریزوں کی کوٹھیوں کی کھپریل کی چھتوں پر رنگ برنگے پھولوں کی بیلیں کھلی تھیں اور کیلے اور ناریل کے پتوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ پیٹر اور سرل کا میزبان پھاٹک تک ان کا استقبال کرنے کے آیا۔ پھر انہوں نے لکڑی کے ستونوں والے برآمدے میں بیٹھ کر چاء پی۔ گوانیز خانساماں جو اپنے آپ کو پرتگالی کہتا تھا لپک لپک کر مہمانوں کی خاطریں کرتا رہا، پھر بے ہنگم سا سایہ پہنے میری باہر آئی جو صاحب خانہ کے بچوں کی کھلائی تھی۔

میری پہلی یوریشین لڑکی تھی جو سرل نے دیکھی۔ سرل اپنے کمرے کے دریچے میں کھڑے ہو کر سمندر کا نظارہ کرتا رہا۔ کونے میں حبشی لڑکا لپا جھپ اس کے

جوتوں پر پالش کر رہا تھا۔ یہ لڑکا دوسرے غلاموں کے ساتھ ڈغاسکر سے درآمد کیا گیا تھا اور جتنی دیر وہ کمرے میں رہا۔ سرل کو بڑی وحشت محسوس ہوتی رہی مگر بہر حال یہ مشرق تھا۔ شام کو وہ سب ہوا خوری کے لیے نکلے۔ اردشیر، صاحب خانہ کے پارسی کوچمپین نے جھک کر مودبانہ لہجے میں پوچھا: ''کس طرف؟''

''چرچ گیٹ چلو'' پھر میزبان نے سرل سے کہا، ''نوجوان لڑکے ہمارا شہر تمہارے شاندار کلکتے کا تو مقابلہ نہیں کر سکتا جہاں تم جا رہے ہو مگر بمبئی کی بھی کیا بات ہے۔'' اپالو سے لے کر چرچ گیٹ تک گھاس کے سرسبز قطعے تھے اور ناریل کے گھنے جھرمٹوں کے درمیان پانی کی جھیلیں جگمگا رہی تھیں۔ دور کولابا کے لائٹ ہاؤس میں روشنی چمک رہی تھی۔ بندرگاہ میں کئی جہاز کھڑے تھے۔ بڑی گہما گہمی تھی، اس رات میزبان کے یہاں کھانے پر سرل کو دو پارسیوں سے ملوایا گیا۔ یہ دونوں جہاز سازی کے کارخانے کے مالک تھے اور فرفر انگریزی بول رہے تھے۔ کس قدر بھانت بھانت کے باشندے اس ملک میں ہیں۔ سرل نے حیرت سے پوچھا۔

چند روز بعد وہ پیٹر جیکسن کے ساتھ فیکٹری دیکھنے کے لیے سورت گیا۔ مغربی گھاٹ کا خوبصورت علاقہ اور کلیان اور ناسک کا حسن اور سرسبز پہاڑی راستے جن پر نیلا کہرہ چھایا ہوتا اور تاپتی کے کنارے۔ مہا گجرات دیش کے سبزہ زاروں پر سورت بسا ہوا تھا۔ سورت ۔۔۔ مغلوں کی بندرگاہ سو سال پہلے جس کی آبادی لندن اور پیرس سے زیادہ تھی اور جس کے باغوں میں فوارے چل رہے تھے اور جہاں رنگین چنریاں اوڑھے لڑکیاں لکشمی کے آگے دیے جلانے کے بعد گربا ناچتی

تھیں۔

بمبئی لوٹ کر آنے کے بعد سرل دوسرے جہاز کا منتظر رہا جو اسے مدراس اور کلکتے لے جائے۔ پیٹر جیکسن فی الحال یہیں ٹھہر رہا تھا، اب سرل کو تنہا سفر کرنا تھا۔ وہ ہندوستان کا ایک حد تک عادی ہو چکا تھا۔

جہاز نے لنگر اٹھایا اور کورومنڈل کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اب نئی نئی دنیائیں اس کی نظروں کے سامنے جھلملا رہی تھیں۔ ناریل کے جھنڈوں میں چھپی ہوئی مسجدیں اور مندر۔ برہمنوں اور مسلمانوں کی آبادیاں۔ سنہرا شہر گوا ولندیزوں کا سرنگا پٹم جس کی عمارتوں کو دیکھ کر اسے ایک لمحے کے لیے ایمسٹرڈم کی یاد آئی اور اس کا دل بیٹھ گیا۔ یورپ۔۔ یورپ۔۔ کس قدر دور رہ گیا تھا۔ پانڈی چری میں کئی فرانسیسی جہاز پر آئے، وہ دوسرے جہاز سے فرانس جا رہے تھے، ان میں تین راہبات تھیں اور ایک سوربون کا طالب علم۔۔۔ وہ فوراً سرل سے گھل مل گیا۔ وہ ماں باپ سے ملنے آیا ہوا تھا اور اب واپس جا رہا تھا، وہ جلدی جلدی کندھے اچکا کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ پیرس کی باتیں۔ یونیورسٹی کی اور انقلاب کی باتیں۔ آزادی، مساوات اور اخوت زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد۔ فرانس زندہ باد، وہ اسی طرح جوش سے بچوں کی طرح نعرے لگاتا اتر کر کشتی میں بیٹھ گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جانے اس کا کیا نام تھا اور اس میدان رستاخیز میں اس کا کیا حشر ہو گا، ہر طرف خونریزی تھی اور جنگیں۔ بنگال میں جنوب میں، یورپ میں نپولین نے اودھم مچا رکھی تھی۔ سارا یورپ جل رہا ہے اور کئی مرتبہ اور جلے گا اور اس ہنگامے میں کیمرج اور سوربون کے طالب علم آندھی کے پتوں کی

طرح کھو کر رہ جائیں گے اور ایسا ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

اور وہ، سرل ہاورڈ ایشلے، خلیج بنگال کے پانیوں پر محو سفر ہے اور ہر طرف موت دانت نکوسے کھڑی ہے۔ سامنے میسوری ہیں اور مرہٹے۔ شمال میں چڑھی ہوئی داڑھیوں اور گھیر دار شلواروں والے افغان اور سکھ تلواریں چمکا رہے ہیں اور چاروں کھونٹ وحشت ہے اور تباہی اور دلی میں دکھ ہے۔ فیض آباد میں دکھ ہے۔ مرشد آباد میں دکھ ہے، یہ سب سرل کو نہیں معلوم، وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ دلی میں شاہ عالمگیر ثانی اس وقت چندا بائی کا رقص دیکھنے کے بعد استاد تان رس کان سے خیال چندر کونس بلمپت میں سننے میں مصروف ہیں۔ پھر مدراس نظر آیا۔ فورٹ سینٹ جارج۔ اور شہر کے مکانات جو دھوپ میں چمک رہے تھے۔ بندرگاہ میں ملیح پرسکون شکلوں والے ہندو سوداگر جہاز پر آئے۔ دو باشوں نے اسے گھیر لیا۔۔ سب مصر تھے کہ وہ انہیں اپنا گماشتہ بنائے۔ لندن اور بمبئی میں دوستوں نے مدراس کے گورنر اور اعلیٰ طبقے کے افراد سے ملنے کے لئے جو تعارفی خط دے دیے تھے ان کو جیب میں ٹٹولنے کے بعد ذرا گھبراہٹ کے ساتھ سرل جہاز سے اترا۔ یہاں پیٹر جیکسن اس کی رہنمائی کے لیے موجود نہ تھا۔

مدراس میں جہاز پانچ چھ دن ٹھہرا۔ اس نے والا جاہ نواب ارکاٹ کا محل دیکھا۔ مندروں اور قلعوں کی سیر کی۔ سینٹ طامس روڈ کی انگریزی کی دکانوں پر نظر ڈالی، ایک روز وہ ٹہلتا ٹہلتا یوریشین آبادی کی سمت نکل گیا۔

یہاں اسے ایک مکان کی سیڑھیوں پر ایک لڑکی کھڑی نظر آئی۔ دوغلی نسل کی حسین لڑکی۔۔ وہ اسے دیکھ کر اداسی سے مسکرائی اور اندر چلی گئی۔ ایک سیاہ فام

عورت گود میں بچہ اٹھائے باہر نکلی اور دہلیز پر بیٹھ کر دال چاول بیننے لگی۔ سرل کو دیکھ کر تین چار بچے باہر آ گئے، پھر ان کا باپ برآمد ہوا جو ایک بے حد مفلس یوریشین معلوم ہوتا تھا۔ سرل ان کو دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ ''اندر آؤ گے؟'' ایک بچے نے پوچھا، وہ سب متحیر تھے کہ انگریز صاحب ان کے محلے کی طرف کیسے آن نکلا۔ سرل کی قوم انگلستان میں طبقاتی کاسٹ سسٹم کی شدت سے قائل تھی۔ ہند میں انہوں نے سیاہ اور سفید کی نسلی تفریق کی بنیاد ڈالی تھی۔ مدراس بلیک ٹاؤن، یوریشین ٹاؤن اور وائٹ ٹاؤن میں بٹا ہوا تھا۔ سرل نے کیمرج میں رہ کر اٹھارویں صدی کی لبرل ازم کا بڑا پرچار کیا تھا مگر کالے اور گورے کی تقسیم اس کی سمجھ میں آتی تھی، اب اس نے دیکھا کہ ہند میں رہنے والے گورے کالوں کی چھوت لگ جانے کے بعد اپنے درجے سے گر چکے تھے۔ یہ یوریشین وائٹ ٹاؤن کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے، وہ ٹہلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اتنے میں وہ لڑکی اسے دوبارہ نظر آئی، وہ اپنے گھر کی باڑ پھلانگ کر آگے آگے جا رہی تھی۔ ایک بار اس نے سرل کو پلٹ کر دیکھا اور مسکرا دی۔ بخدا یہ یوریشین لڑکی بے حد حسین تھی۔ ان بھورے بالوں والی سفید فام انگریز امیر زادیوں سے کہیں زیادہ دلکش جو گورنمنٹ ہاؤس میں شام کو پولکا ناچتی تھیں۔ اس لڑکی کی آنکھیں مرہٹہ اور گجراتی اور مالاباری عورتوں کی ایسی تھی۔ سیاہ، اور باحیا اور رسیلی اور خوفزدہ سی۔ اسے یہ لڑکی بے حد اچھی لگی۔ ''ذرا بات سننا۔'' اس نے جلدی جلدی قدم بڑھا کر اسے جا لیا۔

''تم یہیں رہتی ہو؟'' اس نے بیوقوفوں کی طرح سوال کیا۔

''ہاں، تم نے ابھی میرا مکان دیکھا تو ہے۔ تم کلکتے سے آئے ہو؟''

''نہیں، کلکتے جا رہا ہوں۔ لندن سے چلا تھا، یہاں بمبئی سے آ رہا ہوں۔''

''بہت سفر کرتے ہو۔''

''ہاں۔ اور ابھی بہت سفر کرنا ہے، تم یہاں کب سے رہتی ہو؟''

''ہمیشہ سے۔''

''ہمیشہ سے۔''

''مگر تم تو عیسائی ہو۔''

''ہاں۔ کیا ہندوستانی عیسائی نہیں ہو سکتے؟'' پھر وہ ذرا ٹھٹکی۔ ''میرا دادا انگریز تھا۔ بالکل تمہاری طرح کا، میری ماں ہندوستانی ہے۔''

وہ گڑبڑا گیا۔ پیٹر جیکسن نے اسے جہاز پر نصیحت کی تھی کہ یوریشین قوم سے میل جول بالکل نہ بڑھانا۔ پچھلی صدی میں ہمارے ہم وطنوں نے یہاں آن کر کالی عورتوں سے اتنی شادیاں کیں اور تعلقات قائم کیے کہ لے کے پوری نسل کو سیاہ فام بنا دیا۔ تمہارا باپ زندہ ہے؟ کیا کرتا ہے؟ سرل نے پوچھا۔

''وہ کیا بیٹھا ہے سیڑھیوں پر، تم نے دیکھا نہیں۔ شراب کی دکان کرتا ہے۔''

''آؤ یہاں بیٹھ جائیں۔'' سرل نے ہمت کر کے ایک بنچ کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکی ذرا جھجکی اور پھر سر پر اپنا سیاہ جالی کا رومال ٹھیک کر کے بنچ کی طرف بڑھی جو سڑک کے کنارے پڑی تھی، یہ راستہ گرجے کو جاتا تھا۔ اس کی کلائیوں میں سبک سی تسبیح لپٹی ہوئی تھی۔

''تم کیتھولک ہو؟ سرل نے ایسے تجسس سے پہلے کسی سے سوالات نہ کیے

تھے۔

''ہاں''

وہ بڑے باوقار انداز میں اس کے سامنے کھڑا رہا۔لڑکی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

پھر دفعتاً جانے کیا ہوا کہ سرل بغیر جانے ہوئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اسے مخاطب کر کے بولا: ''تم۔تم مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی ہو۔میرے ساتھ کلکتے چلو۔''

لڑکی نے اسے اچنبھے سے دیکھا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''کیوں نہیں۔''

''میرا باپ مجھے مار نہیں ڈالے گا،تم کیتھولک نہیں ہو اور اونچے طبقے کے انگریز ہو اور آج کے بعد شاید تم مجھ سے بات بھی کرنا پسند نہ کرو۔تمہاری طرح کے بہت سے سیاح مدراس آتے ہیں۔'' اس نے اداسی سے درخت کا پتا توڑا۔

سرل کو احساس ہوا کہ وہ شدت سے اس لڑکی کے عشق میں مبتلا ہے۔''سنو'' اس نے بڑے جذبے سے کہا۔''سنو۔'' مگر وہ پھر ہڑبڑا گیا۔اس نے اب تک اس کا نام بھی معلوم نہیں کیا تھا۔

''مجھے ماریا ٹیریزا کہتے ہیں۔''

''ماریا ٹیریزا مجھے تم سے عشق ہے۔''

اس رات وہ گورنمنٹ ہاؤس کی بال میں جانے کی بجائے چپکے سے یوریشین

ٹاؤن بھاگ آیا اور اس کی اگلی رات اور اس کی اگلی رات۔ چوتھے روز صبح جہاز کلکتے کے لیے لنگر اٹھا رہا تھا۔

سفر کی تیاری کرتے وقت اسے معلوم ہوا کہ یہ کیا زبردست حماقت تھی، وہ اس لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔ اب تک اس نے ماریا سے شادی کے لیے کہا بھی نہیں تھا مگر وہ بیوقوف لڑکی خالص ہندوستانی عورتوں کی مانند شاید دل میں اسے اپنا دیوتا تصور کرنے لگی تھی، جب وہ اسے خدا حافظ کہنے گرجے کے باغ میں پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ وہ ایک گٹھڑی کپڑوں کی ہاتھ میں سنبھالے اس کے ہمراہ کلکتے چلنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

اپنی ساری قابلیت اور شاعرانہ انداز بیان اور ڈرامے کی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے ماریا ٹیریزا کو یقین دلایا کہ ابھی اس کا ساتھ لے جانا ممکن نہیں۔ وہ جلدی ہی اسے بلوا بھیجے گا اور یہ الفاظ کہتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو انتہائی ذلیل اور کمینہ محسوس کیا۔

اس چھوٹے سے جذباتی ایڈونچر کے بعد سرل پھر اپنی منزل مقصود کی سمت روانہ ہوا۔ خلیج بنگال کی نیلگوں وسعت میں داخل ہوتے ہوتے وہ اس لڑکی کو تقریباً بھول چکا تھا۔

جہاز اب کلکتے کے قریب پہنچ رہا تھا۔ ڈائمنڈ ہاربر میں داخل ہو کر جہاز نے لنگر ڈالا اور پائلٹ کے انتظار میں مصروف ہو گیا۔ مسافر عرشے پر نکل آئے۔ سامنے بنگال کا ساحل تھا۔ پائلٹ کے ساتھ جہاز فلٹا روانہ ہوا، وہاں مسافر اتر کر کشتیوں میں بیٹھے۔ اعلیٰ افسروں کو لینے کے لیے ان کے ذاتی بجرے آئے ہوئے

تھے۔۔۔سرل اس ہنگامے میں کسی کو نہیں جانتا تھا، وہ جلدی سے کود کر ایک کرائے کی کشتی میں بیٹھ گیا۔ مانجھیوں کی ایک پوری پلٹن نے چپو چلانے شروع کر دیے اور تھوڑی دیر بعد بندرگاہ کے شوروغل سے نکل کر کشتی پرسکون کھلے پانیوں پر آ گئی۔ آس پاس مسافروں سے بھری دوسری کشتیاں چل رہی تھیں۔ پانی کے دونوں طرف درخت جھکے ہوئے تھے۔ دور گھنے جنگلوں میں سے کبھی کبھی شیروں کے گرجنے کی آواز اور گیدڑوں کی صدائیں سنائی دی جاتی تھیں۔ کشتی میں مچھروں نے بھنبھنانا شروع کر دیا تھا۔ کلکتہ ابھی بہت دور تھا۔ محلات کا شہر۔ سونے اور چاندی کی بستی۔ مشرق کا لندن۔ اب رات ہو رہی تھی۔ بنگالے کا سحر انگیز چاند پانی کی سطح پر کشتی کے ساتھ ساتھ تیرتا جاتا تھا۔ مانجھی اپنی زبان میں گا رہے تھے۔ ان کی آواز سرل کو غیر معمولی طور پر سریلی معلوم ہوئی۔

پھر منظر تبدیل ہونا شروع ہوا۔ کشتی گارڈن ریچ پہنچ رہی تھی۔ ساحل پر دونوں طرف شاندار مکانات بنے تھے۔ دریا کے دائیں کنارے پر کلکتہ چاندنی میں جگمگا رہا تھا۔ کلکتہ جو اب دنیا کے بہترین شہروں میں شمار کیا جا رہا تھا، بالآخر اس کے سامنے موجود تھا۔ گھاٹ پر بنگالی بنئے مسافروں کی گھات میں موجود تھے۔ اعلیٰ افسروں کو لینے کے لیے ان کے دوست احباب آئے ہوئے تھے۔ جن نوواردوں کے دوست یہاں موجود نہ تھے اپنا سامان قلیوں کے سروں پر رکھوا کر پرتگالی مسافر خانوں کا رخ کر رہے تھے۔ گھاٹ کے اس رنگا رنگ مجمعے سے باہر نکل کر سرل بھی ایک پالکی میں بیٹھا اور شہر کی گنجان آبادی سے باہر نکل کر پالکی بردار بارک پور کی طرف بڑھنے لگے جہاں سرل کو فی الحال قیام کرنا تھا۔

بارک پور میں انگریزوں کے کنٹری ہاؤس تھے۔ ولندیزیوں کے سیرام پور اور فرانسیسیوں کے چندر نگر تک ان مکانات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ قلعے کے آس پاس سرکاری عمارات تھیں۔ شان دار گورنمنٹ ہاؤس جہاں چند سال پہلے کارنوالس دھوم دھام سے براجتا تھا اور اب جہاں سر جان شور فورٹ ولیم کا گورنر جنرل بننے والا تھا، پھر رائیٹرز بلڈنگ جس میں سرل کا دفتر تھا۔ چرچ کی عظیم الشان عمارت۔ آس پاس بلیک ٹاؤن تھا۔ جس میں ہندوستانی، پرتگالی، ارمنی، یوریشین اور مفلوک الحال یورپین بستے تھے۔

چورنگی روڈ پر کلاسیکل طرز کی عالی شان عمارتیں تھیں۔ بڑے بڑے ہال، پیل پائے والے برآمدے، چوڑے زینے، جھلملیوں والے دروازے اور اونچے دریچے۔ دریا کے کنارے کنارے انگریز امراء کے گارڈن ہاؤس تھے، جن کے باغیچوں میں ہندو اور چینی مالی کام میں مصروف تھے۔ کوٹھیوں کے عقب میں شاگرد پیشے تھے۔ جہاں مرغیاں اور بطخیں گھوم رہی تھیں۔ تالاب تھے جن میں واٹر کیلی کھلی تھی اور مچھلیاں پلی تھیں۔

چھ مہینے بعد سرل نے اپنے باپ کو خط لکھا کہ اب میں سیٹل ہو چکا ہوں اور خدا کی عنایات کا شکر گزار ہوں، میرا بنگالی گماشتہ اشوتوش ڈے جو فراٹے سے انگریزی بولتا ہے میرے سارے معاملات کا نگران ہے۔ میرے عہدے میں بھی ترقی ہونے والی ہے اور میں مفصل میں نیل کی تجارت شروع کر رہا ہوں، میں نے ایک مسلمان منشی نوکر رکھا ہے۔ جس کا نام ابوالمکارم ہے، وہ مجھے فارسی اور بنگالی پڑھاتا ہے اور میں اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں۔

کئی سال گزر گئے۔ سرل اب کلکتے کی اعلیٰ سوسائٹی میں رل مل چکا تھا اور اسی اسٹائل سے رہتا تھا جو اس سوسائٹی کی خاصیت تھی۔ اس کے پالکی بردار ہر وقت سرخ وردی میں ملبوس رہتے۔ سونٹا بردار چاندی کے موٹھ کی چھڑیاں لے کر چلتے۔ رات کو مشعلچی اس کی فینس کے آگے آگے دوڑتے۔ خانساماں اور خدمت گار اس کے مطبخ اور کھانے کے کمرے کے نگران تھے۔ حقہ بردار اس کا پیچوان بھرتا تھا۔ دفتر میں اس کا کلرک یوریشین تھا جس کا نام رالف تھا۔ سرل کو اس کی موجودگی میں بڑی بے آرامی سی محسوس ہوتی۔ رالف، بلیک ٹاؤن کا باسی، بڑی وفاداری سے سرل کی خوشامد میں لگا رہتا۔ دفتر کے انتظام کے لیے بنگالی سرکار موجود تھا اور ان گنت ہرکارے اور پیادے اور چپراسی۔ ایک تن تنہا سرل ایشلے اور اس کے ذاتی عملے میں چالیس پچاس آدمی شامل تھے۔ ان کے علاوہ اس کا مالی تھا اور گراس کٹ اور سائیس اور چابک سوار اور بہشتی دربان، چوکیدار، پھر اس کا بجرہ تھا جس کے مانجھی اس کے ملازم تھے۔ درزی، دھوبی اور نائی ان سب سے علیحدہ۔ اس سلطنت کا، جو اس کی سفید رنگ کی کوٹھی میں قائم تھی، سرل ایشلے بلاشرکت غیرے مالک و مختار تھا، وہ چاہتا تو ان سب کو الٹا لٹکا کر پٹوا سکتا تھا اور ایسا اس نے اکثر کیا، وہی سرل جو کچھ عرصہ قبل کیمرج کی گلیوں میں ولیم بلیک کی کتابیں لیے مشق سخن کرتا پھرتا تھا اور کسی پب میں جا کر چند پنس کے آلو کھاتا تھا، جو ٹرل ٹمپل کے پھاٹک سے نکل کر دریا کے کنارے ڈون اور گرے کی نظموں پر سر دھنتا سنسان سڑکوں پر ٹہلا کرتا اور رات کو کسی طالب علم ساتھی کے یہاں جا کر سو رہتا تھا۔

صبح سات بجے دربان اس کی کوٹھی کے ہال کا دروازہ کھولتا۔ دھوپ جھلملیوں

سے چھن چھن کر اندر آنے لگتی، تو سرل اپنی مسہری سے اٹھتا۔ اس کے سرکار اور چپراسی کاغذات لے کر فرشی سلام کرتے بیڈ روم میں داخل ہوتے۔ حجام اس کا خط بناتا۔ وگ سر پر جمانے کے بعد واسکٹ پہنتا ہوا وہ کھانے کے کمرے کی طرف بڑھتا جہاں وہ چاء پیتا جاتا اور پیچوان کے کش لگاتا۔ کاروبار اور سرکاری کام کے سلسلے میں جتنے غرض مند صبح صبح سلام کرنے آتے وہ سب میز سے کچھ فاصلے پر مودبانہ کھڑے رہتے۔ سرل بے نیازی سے احکام صادر کرتا۔ دس بجے کے قریب یہ سارا جلوس پالکی کی طرف بڑھتا اور پالکی اس کے دفتر کی طرف روانہ ہوتی۔ چار بجے واپس آ کر سرل کلکتے کے قاعدے کے مطابق شام کے سات آٹھ بجے تک سویا کرتا، اس کے بعد لباس تبدیل کر کے اور بن سنور کے خواتین سے ملنے کے لئے نکل جاتا، سوشل کالز کرتا۔ کورس میں ہوا خوری کرتا یا کہیں ڈنر پر چلا جاتا۔ کس قدر مکمل اور فرصت کی زندگی تھی اور اسی آرام اور آسائش کے ساتھ اس کا بنک بیلنس بڑھتا جا رہا تھا۔ تجارت میں اسے بے اندازہ منافع ہو رہا تھا۔ گورنر جنرل اس سے بے حد خوش تھا۔ افواہ تھی کہ اسے شاید دوامی بندوبست کے انتظام کے سلسلے میں کسی اہم عہدے پر مفصل میں یا لکھنؤ ریذیڈنسی بھیج دیا جائے۔ کلکتے میں وہ ماؤں کے لیے ایک مستقل موضوع گفتگو بن چکا تھا۔ بال رومز میں اس کے ساتھ رقص کرتے ہوئے بن بیاہی امیر زادیاں اکثر سوچتیں کہ وہ کون خوش قسمت لڑکی ہوگی جس سے امیر اور ہینڈسم سرل ایشلے بیاہ کرے گا۔

مگر لیڈی پیملا یا لیڈی سنتھیا کے ساتھ شادی کرنے کے بجائے اس غیر معمولی ذہن اور دماغ کے مالک سرل ایشلے نے ایک بڑی ہی معمولی اور عامیانہ

حرکت کی یعنی ایسی حرکت جو عام طور پر سبھی دولت مند انگریز کرتے تھے اور جو ہندوستان کے انگریز "نوابین" کا عام دستور تھا۔

یعنی سرل اشٹلے نے بھی ایک نیٹو عورت کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔

انگریز "نوابوں" کا انگلستان میں بھی خوب مذاق اڑایا جاتا، وہاں کا جاگیردار طبقہ ان کو اپنے ہم پلہ سمجھنے سے منکر تھا۔ کل کی بات تھی کہ یہ لوگ سٹی میں معمولی تاجر یا گرگے تھے۔ اور نو دولتئے تاجر سے پشتینی زمیندار کی ہمیشہ سے الٰہی رہی ہے مگر ہندوستان میں ان لوگوں نے اپنے لیے ایک الف لیلوی دنیا تخلیق کر رکھی تھی۔ پٹنہ، ڈھاکہ، قاسم بازار، بالاسور اور ہگلی کے تاجر، مرشد آباد، لکھنؤ، بنارس، گوالیر اور دلی درباروں میں سفارت کے فرائض انجام دینے والے ڈپلومیٹ، کلکٹر، جو بنگال، بہار اور اڑیسہ کے ضلعوں میں تعینات تھے۔ فوجی افسر جنہوں نے اودھ میں چھاؤنیاں چھائی تھیں۔ فوجی ایڈونچررز جو ہندوستانی حکمرانوں کی افواج میں اونچی بنے دندنا رہے تھے۔ یہ سب اب سرل کے ساتھی تھے۔ سرل ان کا نقطۂ نظر خوب سمجھتا تھا۔ پلاسی کے بعد سے لاشمی نے ہندوستانیوں نے روٹھ کر فرنگی کا گھر دیکھ لیا تھا۔ انگریز کے یہاں من برس رہا تھا۔ شہر کی چورنگی میں ان کے ٹاؤن ہاؤس تھے۔ شہر سے باہر بڑے بڑے باغات میں انہوں نے بنگلے بنوا رکھے تھے۔ اودھ اور مرشد آباد کی ریذیڈنسی میں رہنے والے انگریزوں کے یہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ شورے اور نیل کے تاجر کروڑ پتی ہو چکے تھے۔ نوابوں کی طرح زندگی گزارنا ان کا آدرش تھا۔ حرم، حقہ، شعر و شاعری، ناچ رنگ، مرغ بازی۔۔ یہی مشاغل ان فرنگیوں کے تھے۔۔۔ ہندوستانی نوابوں اور انگریز اونچے طبقے نے آپس میں

سمجھوتہ کر کے ایک انتہائی مہذب فضا کی بنیاد ڈالی تھی۔ دیوالی ملنے کے بعد انگریز سویلین بنگال میں منظر عام پر آیا، یہ لوگ بے حد کم عمر میں انگلستان سے یہاں آتے اور بہت جلد ساری ہندوستانی خصلتیں اختیار کر لیتے۔ کلکٹر کی حیثیت سے اضلاع میں تعینات ہونے کے بعد اپنا وقت وہاں کے راجاؤں اور نوابوں اور زمینداروں کی صحبت میں گزارتے۔ بنگال کی جاگیردارانہ تہذیب میں فرنگی افسر بھی گھل مل چکا تھا۔ پلاسی کے بعد کمپنی کا فیکٹر فقط دولت جمع کر کے وطن واپس جانے کے بجائے اب نواب کہلانے کے خواب دیکھتا تھا اور اردو ادب میں دلچسپی رکھتا تھا اور حرم میں دس دس دیسی عورتیں رکھتا تھا۔

سرل بھی شنیلا کو اپنی کوٹھی میں داخل کر کے گویا باقاعدہ نواب بن گیا۔

سیاہ لمبے بالوں اور نشیلی آنکھوں والی شنیلا ڈھاکے کے قریب کے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ انگریز نواب اور ہندوستانی نواب نے آپس میں سمجھوتہ کر لیا تھا اور اس سے تہذیب وتمدن وغیرہ کو تو خوب ترقی ہو رہی تھی مگر شنیلا دیبی کا باپ اسی طرح فاقے کر رہا تھا بلکہ اب اس کے فاقوں میں زیادتی ہو گئی تھی کیونکہ ڈھاکے پر اقتصادی تباہی کے بادل منڈلا رہے تھے۔ شنیلا کی سات بہنیں تھیں جن میں تین بال ودھوا تھیں اور چار کی ابھی شادی نہیں ہو سکی تھی، اس کا ایک بھائی تھا جسے کلکتے کے ایک گودام میں ملازمت مل گئی تو اس نے اپنی بہنوں کو ڈھاکے سے بلوا بھیجا۔ اس گودام کے مالک کا نام سرل صاحب تھا۔

سرل صاحب ابھی لڑکا ہی سا تھا مگر کلکتے میں اس کا طوطی بول رہا تھا۔ ایک روز شنیلا پوجا کے لیے کالی گھاٹ جا رہی تھی کہ سرل صاحب نے کہیں اسے دیکھ لیا۔

سرل صاحب کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ کافی دل پھینک واقع ہوئے ہیں، گو کلکتے کی مسی بابا لوگ اس سے خفا رہتی تھیں کہ وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنی میم کیوں نہیں بنا لیتا۔ شنیلا کا بھائی اپنی مفلسی سے تنگ آ کر سوچ رہا تھا کہ وہ سیرام پور جا کر عیسائی ہو جائے۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ اس کو اپنی بہنوں کے بوجھ سے نجات ملے گی۔ مشن والے آپ ہی ان کے شادی بیاہ کی فکر کریں گے، مگر اسی روز سرل صاحب کے سرکار نے آ کر اس سے کہا: ''صاحب نے تمہیں یاد کیا ہے۔'' اور اس کے اگلے روز شنیلا سرل صاحب کی کوٹھی پر پہنچا دی گئی اور اس طرح اس کے خاندان کو افلاس سے نجات ملی۔

ہر معاشرے کی اپنی اقدار بن جاتی ہیں، یہ اس وقت کا عام دستور تھا۔ نسلی تعصب ابھی زیادہ نہیں بڑھا تھا بہت سے انگریزوں نے اونچے مسلمان گھرانوں میں شادیاں کی تھیں۔ شاہ عالم ثانی کی بیٹی شہزادی فیض النساء اور کمبلے کی شہزادی ظہور النساء بیگم کی شادیاں انگریزوں سے ہوئی تھیں۔ کلکتے کے جوب چارنوک کی بیوی بھی ہندوستانی تھی۔

سرل صاحب نے شنیلا سے بیاہ نہیں کیا، مگر شنیلا ناخوش نہیں تھی، وہ شان سے کوٹھی میں رہتی تھی اور نوکروں پر حکومت کرتی تھی۔ اس کی مانند اور بہت سی دیسی عورتیں اعلیٰ طبقے کے انگریزوں کے زنان خانے میں براجتی تھیں۔ ان کے بچے پڑھنے کے لیے ولایت بھیجے جاتے تھے اور جب تک ان بچوں کے باپ زندہ رہتے تھے کم از کم اس وقت تک ان کا خاندان آرام سے گزر کرتا تھا۔

مگر سرل کو معلوم تھا کہ اس کی اور شنیلا کی اولاد کا مستقبل کیا ہوگا، وہ مدراس یا

کلکتے کے یتیم خانے میں داخل کر دیے جائیں گے۔ بڑے ہو کر ان کو اعلیٰ نوکریاں نہیں ملیں گی وہ رالف کی طرح کلرکی کریں گے یا کسی رجمنٹ میں شامل ہو کر بینڈ بجاتے مرہٹوں سے لڑنے جایا کریں گے۔ اس کی لڑکی کو کسی انگریز نواب زادی کی آیا بننا پڑے گا یا کسی فوجی افسر کی داشتہ۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ یوریشین طبقہ کس قدر زبردست ٹریجڈی کا حامل ہے، تب اسے خوبصورت ماریا ٹیریزیا دآئی جسے وہ مدراس میں ایسے کمینے پن سے چھوڑ آیا تھا۔

یوریشین طبقے کی بنیاد پرتگالیوں کی آمد کے زمانے سے پڑی تھی، پھر فرنچ اور ولندیزیوں نے آ کر اچھوتوں کو عیسائی کیا، جو شخص بوٹ اور ہیٹ پہن کر بگڑی ہوئی پرتگالی بول لے وہ یوریشین سمجھا جاتا تھا۔ فرانسیسیوں میں نسلی تعصب نہیں تھا۔ ان کی آمد سے اس طبقے کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ یوریشین بڑے قابل رحم لوگ تھے۔ بے چارے کرانی، جو انگریز برہمنوں کے مقابلے میں شودر اور چنڈال کی حیثیت رکھتے تھے۔ سرل کو یہ سب سوچ کر جھرجھری سی آئی تو کیا اسے لیڈی سنتھیا سے شادی کر لینا چاہئے، پھر شنیلا اپنی رسیلی آواز میں اسے پکارتی اور وہ ہڑبڑا جاتا اور پالکی میں بیٹھ کر کورس کی طرف نکل جاتا۔ اس کی زندگی بڑی مصروف اور بڑی ہنگامہ خیز گزر رہی تھی۔ گورنر جنرل کے بال اور پبلک بریک فاسٹ، ہیسٹنگ اسٹریٹ اور علی پور کے کانسرٹ اور رقص، گارڈن ریچ کے جشن اور تقریبات، پھر مفصل کے سفر۔ ڈھاکہ، چاٹگام، مرشد آباد، چوبیس پرگنہ، مونگیر۔ سارا بنگال اور سارا بہار اس کے قدموں میں بکھرا پڑا تھا۔ بنگال کے سارے آبی راستے اس کے لیے کھلے تھے۔ نیل کے ان گنت کاشتکاروں کی زندگیوں اور

قسمتوں کا وہ مالک تھا۔ دھالی شری اور ہری منگل اور کرنافلی اور مدھومتی اور شوبنسری کی لہروں پر اس کی کشتیاں نیل کی باربرداری کر رہی تھیں۔ ڈھاکے کے مغلوں کا عظیم الشان ناؤواڑہ اب اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس نے دور سے اپنی نقرئی موٹھ کی چھڑی بڑھا کر بوڑھے کی کمر میں چبھوئی:

''ابولموتشورا گر تم چاہتے ہو کہ اسی ہنٹر سے تمہاری کھال نہ ادھیڑ دوں تو ذرا طاقت سے چپوار چلاؤ!'' اس نے کہا۔

بوڑھا زیادہ کوشش سے چپوار پر جھک گیا۔ سرل اسے خاموشی سے دیکھتا رہا، کس قدر سخت جان لوگ ہیں، اس نے سوچا۔ ابھی چند سال ہوئے کیسا ہولناک قحط صوبے میں پڑا تھا۔ دریاؤں میں اتنے طوفان آتے ہیں، وبائیں پھیلتی ہیں مگر یہ لوگ اسی بے حیائی سے جئے جاتے ہیں۔ حد ہے واقعی۔ اس نے گھڑی دیکھی، اب رات کے نو بج رہے تھے، اسے آج ہی رات کو راجہ گریش چندر رائے کی زمینداری پر پہنچنا تھا۔ کلکتے میں حکومت میں بہت سی تبدیلیاں ہو رہی تھیں، ایک دو دن بعد جان شور جانے والے تھے اور نیا گورنر جنرل آ رہا تھا۔ یہاں سے لوٹ کر اسے گورنمنٹ ہاؤس بھی جانا تھا۔ آج کیا تاریخ ہے؟ اس نے پیٹر سے پوچھا۔ پیٹر خراٹے لے رہا تھا۔ سرل نے لالٹین اٹھا کر بنگال گزٹ پر نظر ڈالی۔ کل کا اخبار تھا۔

آٹھ جون ۱۷۹۸ء سرل یک بیک چونک اٹھا۔ اسے ہندوستان آئے آج پورے پانچ سال ہو گئے تھے، ان پانچ سالوں میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ نیل کی تجارت دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ گجرات کی نیل کی صنعت دم

توڑ چکی تھی، اس کی جگہ کمپنی کے انگریز پلانٹرز دلی سے بنگال تک پھیل چکے تھے۔ بنگال کا کسان انگریز پلانٹرز سے قرض لے کر نیل بوتا تھا اور پھر مختلف طریقوں سے اس پر ظلم توڑے جاتے تھے۔ عدالتوں میں اس کی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ انصاف کرنے والے خود ان پلانٹرز کے بھائی بند تھے۔

بنگال کا کسان ابوالمنصور کمال الدین جو دن بھر نیل کے کھیتوں میں مشقت کرتا تھا اس وقت اپنے نئے آقا سرل ہاورڈ ایشلے کو نوکے میں بٹھا کر اس پار لیے جا رہا تھا اور چاند پدما کے پانیوں پر اتر آیا تھا اور ہوا میں خنکی آ چکی تھی اور اناس اور کیلے کے جھنڈ میں گیدڑ بول رہے تھے۔

کیونکہ رات بہت ہولناک تھی۔

۴۷

کنارے پر آ کر رادھے چرن نے لالٹین اونچی کی اور اس کی روشنی کو پانی پر چمکایا۔ دور افق پر سے ایک کشتی سبک روی سے تیرتی ہوئی گھاٹ کی طرف جا رہی تھی، انہوں نے لالٹین زمین پر رکھ دی اور چادر لپیٹ کر وہیں اکڑوں بیٹھ گئے قریب باشا کا جھونپڑا تھا جس میں گاؤں کے لوگ جمع تھے۔ بانس کے جھنڈ کے نیچے ان کا اپنا چھوٹا سا مکان تھا۔ جس کے دروازے پر چراغ جل رہا تھا۔ سارے میں ایک ہیبت ناک سناٹا تھا جس میں صرف راجہ گریش چندر رائے کے محل کی طرف سے سازوں کی مدھم آوازیں سنائی دے جاتی تھیں، سنا تھا وہاں پٹنے اور

لکھنؤ تک کی طوائفیں آئی تھیں۔ راجہ صاحب کولاٹ صاحب نے خلعت عطا کی تھی، اس کی خوشی میں جشن منایا جا رہا تھا۔ کلکتے سے صاحب لوگ اس میں شرکت کے لیے آ رہے تھے۔ چوپال میں عجیب طرح کی خاموشی طاری تھی۔

''کچھ بات کرو دادا۔'' پرمود نے چلم کی راکھ کریدتے ہوئے اداس آواز میں رادھے چرن سے کہا۔

رادھے چرن خاموشی سے گھاٹ کی اور دیکھتے رہے۔ ہوائیں بانس کے جھنڈ میں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔

ایسی ہی راتوں میں گھنگریالے بالوں والے ستیہ پیر ستیہ نرائن (گوڑ کے سلطان علاء الدین حسین شاہ کا صوفی نواسا جو بنگال کے مسلمانوں کے لیے ستیہ پیرا اور ہندوؤں کے لیے وشنو کا اوتار ستیہ نرائن بن گیا۔) ماتھے پر صندل کا ٹیکا لگائے ہاتھ میں بانسری لیے نارنجی لباس پہنے اپنی کمر کی زنجیریں جھنجھاتے پدما کے کنارے کنارے جاتے نظر آ جاتے ہیں، اگر مجھے کبھی ستیہ نرائن مل جائیں تو میں ان سے پوچھوں، تو میں ان سے کیا پوچھوں ۔۔۔؟ رادھے چرن اکڑوں بیٹھے سوچا کیے۔

بہت سی زنجیروں کے جھنجھنانے کی آواز نے سناٹے کو توڑا۔ رادھے چرن نے چونک کر دیکھا۔ سامنے ستیہ پیر تو نہیں ان کے چند فقیر موجود تھے۔ بانسوں کے جھنڈ سے نمودار ہو کر وہ رادھے چرن کے مکان کی طرف مڑ گئے تھے اور دروازے پر کھڑے حسب معمول صدائیں لگا رہے تھے۔

رادھے چرن نے بڑے کوفت کے ساتھ ان کو دیکھا۔ ستیہ نرائن کے بھکاری

ان کے دوار پر کھڑے تھے اور ان کے پاس دینے کو کچھ نہ تھا۔ اچھی فصل کی دیبی لاکشمی کے بھجن گانے والے یہ مسلمان فقیر گاؤں گاؤں گھوما کرتے تھے۔ صدیوں سے یہ فقیر اسی طرح گاتے بجاتے آئے تھے۔ گاؤں کی ہندو عورتیں ان کی جھولی میں آٹا اور چاول ڈالتی تھیں اور ان سے دعائیں لیتی تھیں۔ یہ ان کو اچھے شگون کی باتیں بتاتے، سانپ کے کاٹے کا اپنے منتروں سے علاج کرتے، ان کے بغیر زندگی مکمل نہیں تھی۔ پچھلے سال انہوں نے شنیلا کے لیے کہا تھا، جب وہ دکھشنا دینے باہر آئی تھی، کہ یہ بیٹی پدمنی ہے، پھر انہوں نے پدمنی کی ساری نشانیاں شنیلا کی ماں کو بتلائی تھیں۔ پدمنی جو چڑیوں کے جگنے سے پہلے جگتی ہے۔ شام پڑے گھر میں چراغ جلاتی ہے، اپنے شوہر کو کھانا کھلانے کے بعد خود کھاتی ہے۔ بیٹی بڑے نصیبوں والی ہے، انہوں نے بشارت دی تھی۔

ان کی آواز سن کر شنیلا کی ماں دہلیز پر آئی، اس کے مٹکے خالی پڑے تھے۔ فقیروں کو دینے کے لیے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ یہ ستیہ پیر اور مانک پیر اور لاکشمی اور چنڈی ان سب دیبی دیوتاؤں کی قوم پر اسے بڑا غصہ آیا، یہ سب دھوکے باز ہیں، سارے دیبی دیوتا۔ اس نے ساری کے آنچل سے آنسو خشک کرنا چاہے اور چپ چاپ کھڑی ان کو دیکھتی رہی، وہ حسب معمول سیتلا اور چنڈی اور شیوا کا جاپ کیا کیے ''شنیلا کہاں ہے۔'' بالآخر ان میں ایک نے پوچھا۔

''کلکتے۔'' رادھے چرن کی بی بی نے کہا۔

''وہاں کیا کر رہی ہے؟''

''اس کا۔۔۔۔ اس کا بیاہ ہو گیا۔'' اس نے آہستہ سے جواب دیا، اس

نے یہ نہیں بتایا کہ شنیلا کو پردے سے نکلنا پڑا اور وہ ایک فرنگی کی کوٹھ میں رہ رہی ہے۔ مسلمان فقیروں نے آشیر باد دی۔ ''میں نے اس کا ماتھا دیکھ کر بتایا تھا سبھا گن لکشمی ہے۔ پدمنی، ہمارا داماد کیا کرتا ہے۔۔۔۔؟''

''کلکتے میں کام کرتا ہے۔''

''اچھا۔'' فقیروں نے اطمینان سے مزید دعائیں دیں اور واپس مڑنے لگے، اب ان کو ہر گھر سے یہی سننے کو ملتا تھا۔ ہمارے پاس دان کے لیے کچھ نہیں۔ ان کو اس قحط سالی کی عادت پڑ گئی تھی۔ بڑے کال کو پڑے تقریباً تیس سال گزر چکے تھے جب سنا تھا کہ فرنگیوں کی راجدھانی کلکتے کی سڑکیں فاقے سے مرتے ہوئے انسانوں کی لاشوں سے پٹ گئی تھیں، مگر اب کلکتے کی سڑکیں دور دور تک پھیل چکی تھیں، اب گاؤں گاؤں لوگ مر رہے تھے۔

''ٹھہرو۔۔۔۔'' شنیلا کی ماں نے کہا۔ ''میں نے پرفلا کو ہاٹ بھیجا تھا۔ شاید وہ کچھ لے آیا ہو۔''

مگر فقیر دعاؤں کی بوچھاڑ کرتے اداس قدم اٹھاتے آگے بڑھ گئے۔ شنیلا کی ماں اپنے بھانجے کا انتظار کرتی رہی۔

مگر وہ ہاٹ سے گھر لوٹنے کے بجائے سامنے چوپال میں جا بیٹھا تھا، اس کے سارے ساتھی منہ لٹکائے بیٹھے تھے، وہ تین دن سے تیل کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ تیل سونے کے بھاؤ بک رہا تھا۔ نمک عنقا تھا، چاول کی وہ صورت کو ترس گیا تھا۔ چھالیا اور تمباکو اور چاول اور نمک اور ہر شے کی تجارت پر کمپنی بہادر کے فرنگیوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ دریاؤں پر ان کی کشتیاں مال سے لدی ہوئی چل رہی

تھیں مگر بازار میں قیمتیں آسمان تک پہنچ چکی تھیں۔ چوپال میں سات آٹھ آدمی اور آن کر بیٹھ گئے۔ آہستہ آہستہ باتیں شروع ہوئیں: ''اوجیت دادا تم بھی ڈھاکے سے آ رہے ہو؟'' پرمودر نے پوچھا۔ ''ہاں میں بھی اور دلیپ بھی اور سب۔ اب وہاں کھانے کو نہیں ملتا، سارے کرگھے ٹوٹ گئے، اب ہم بھی ہل چلائیں گے۔ تمہارے راجہ صاحب ہمیں زمین جوتنے دیں گے؟'' اوجیت نے کہا۔

''پتا نہیں۔'' پرمودر نے اکتا کر جواب دیا، وہ یہ سب سوچتے سوچتے عاجز آ گیا تھا مگر اس کا دماغ اب کام نہ کرتا تھا۔ لوگ جوق در جوق دیہات کا رخ کر رہے تھے۔ زرعی زمین پر آبادی کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ ہندوستان جو دنیا کا سب سے بڑا صنعتی ملک تھا اب خالص زراعتی ملک میں تبدیل کر دیا گیا تھا، جہاں پیداوار کم تھی، لگان زیادہ اور روز قحط پڑتے تھے۔ ان آنکھوں نے کیا کیا زمانے پلٹتے دیکھے۔ رادھے چرن نے چوپال کے ہجوم پر نظر ڈال کر سوچا۔ کارنوالس کے نئے قانون نے بالکل ہی کمر توڑ دی تھی۔ تین چار نوجوان لڑکے ان کے قریب آن کر بیٹھ گئے۔

''دادا تمہاری نوابی میں بھی ایسا ہوتا تھا۔'' اشوتوش نے سوال کیا۔

''کیا؟'' رادھے چرن نے بے دھیانی سے پوچھا۔

''یہی سب مہنگائی۔۔۔۔اور کال۔۔۔دنگا فساد۔''

لمبی سفید بکرے کی ایسی داڑھیوں والے دو ہندو بوڑھے ناریل کرید کر لڑکوں کو دھندلی آنکھوں سے دیکھا کیے، یہ دونوں بکسر میں لڑے تھے۔ گاؤں ان

پرانے وقتوں کے بڈھوں ٹھڈوں سے بھرا پڑا تھا۔ جو مغلوں اور نوابوں کے زمانوں کے گن گاتے تھےاور روتے تھے۔

''وہ زمانہ آنے والا ہے جب ہماری عورتوں کو پردے سے نکلنا پڑے گا، ہمارے بچے گلیوں میں بھوکے مریں گے۔ ہمارے بادشاہ کا تاج گر پڑے گا۔مہا بھارت میں لکھا ہے۔'' بوڑھے پھونس دھن گوپال مزمدار نے کہنا شروع کیا۔

''ارے مہا بھارت کو چھوڑو دادا۔'' پرفلا نے جل کر اس کی بات کاٹی۔یہی تو ان بوڑھوں میں ایک عیب تھا۔بات بے بات پر سراج الدولہ کو یاد کرکے روتے تھے۔یہ دھن گوپال دادا ابھی ابھی کچھ داستان شروع کرنے والے تھے۔پرفلا نے ان کو بیچ ہی پر ٹوک دیا۔ ''کیا گزرے زمانے کی باتیں کرتے ہو۔۔۔۔'' اس نے کہا۔ ''کلکتے چلو۔جہاں شیام وا گئے ہیں (شیام رادھے چرن کا لڑکا تھا جو سرل صاحب کے گودام میں ملازمت کر رہا تھا) اور لاٹ صاحب کی چاکری کرو۔ شراج کے زمانے لد گئے دادا۔''

رادھے چرن حیرت سے سنتے رہے، یہ لڑکا پرفلا بالکل مارواڑیوں کی ایسی باتیں کر رہا تھا، یہ ذہنیت اس میں کہاں سے آ گئی؟ ان کو مارواڑیوں سے نفرت تھی۔ رادھے چرن پرانے شرفا کے اس طبقے میں سے تھے جو فارسی پڑھتا تھا۔ مغلوں کی سرکار کا نظم ونسق سنبھالتا تھا اور باقی وقت پوجا پاٹ میں لگا رہتا تھا، مگر اب کلکتے کے مارواڑیوں کا ایک نیا متوسط طبقہ پیدا ہوا تھا جو کمپنی کے ساتھ تجارت کرکے اور مقامی حکمرانوں اور کمپنی کی ریشہ دوانیوں میں حصہ لے کر روپیہ بنا رہا تھا۔ یہ بنگال کے بنیوں کا نیا طبقہ تھا۔ جاگیردار اور کسان کے درمیان کا

یہ نیا سرمایہ دار طبقہ انگریز کا دوست اور دست راست تھا اور انگریز بنگال کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے میں مصروف تھے۔

''لاٹ صاحب کی چاکری۔'' دھن گوپال نے کھانسنے کے بعد جوش سے بولنا شروع کیا، اس کی داڑھی لالٹین کی روشنی میں ہلتی ہوئی مضحکہ خیز معلوم ہوئی، وہ خود بہت مضحکہ خیز معلوم ہو رہا تھا۔ ''لاٹ صاحب'' اس نے دہرایا۔ ''اس سے مطلب؟ ہمارا بادشاہ ابھی دلی میں موجود ہے، وہ تمہارے لاٹ صاحب کا دماغ ٹھیک کر دے گا۔''

''تمہارا بادشاہ اندھا کر دیا گیا ہے گوپال دادا'' پرفلا قہقہہ مار کر ہنسا۔ ''تم جانے کس دنیا میں رہتے ہو، تمہارے بادشاہ نے پہلے ہی دیوانی کلائیو کے حوالے کیوں کر دی۔ اب دماغ ٹھیک کرے گا۔'' پرفلا تلخی سے ہنسا۔ دونوں بوڑھے چپ چاپ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئے۔ رادھے چرن نے کوفت سے پرفلا پر نظر ڈالی۔ ان لڑکوں کو کچھ سمجھانا بیکار تھا، یہ بھی بتانا بیکار تھا کہ بادشاہ نے اپنی مرضی سے دیوانی نہیں دی۔ کلائیو نے زبردستی حاصل کی تھی۔ اس فاقہ زدہ ملک میں پیدا ہونے والے ان نوجوانوں کو کس طرح یقین آ سکتا تھا کہ یہی بنگال دیس کا زرخیز ترین صوبہ تھا۔ یہی بنگال فردوس ہند کہلاتا تھا، اس وقت اس دیس میں پرائے ملک انگلستان کا زمینداری نظام رائج نہیں کیا گیا تھا۔ اس وقت ملک کی مصنوعات کی برآمد پر محصول نہیں لگے تھے۔ اس وقت لوگ ذاتی جائداد کے تصور سے آشنا نہیں تھے، یہ سب رادھے چرن کے دیکھتے دیکھتے ہوا تھا۔ چند روز قبل جب دوامی بندوبست کے سلسلے میں دورہ کرتا ہوا ڈھاکے کا انگریز کلکٹر یہاں آیا تو

اس نے اپنے دربار میں رادھے چرن کو بلا کر کہا تھا کہ ہم یہ سب تمہارے فائدے کے لیے کرر ہے ہیں۔ مسلمان نوابوں نے تم لوگوں کو اپنی بدانتظامی سے تباہ کر دیا تھا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو صاحب۔ ہمارے نوابوں کے یہاں بدانتظامی نہیں تھی، میں کایستھ ہوں، میرے پرکھ صدیوں سے مرشد آباد میں حکومت کا انتظام کرتے آئے ہیں۔ میں آج بوڑھی گنگا کے کنارے اس جھونپڑی میں رہ رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے اپنی خوشحالی کے ساتھ ساتھ اپنے ہوش و حواس بھی کھو دیے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ تم جھوٹ بکتے ہو۔۔۔تم۔۔۔'' اور جب رادھے چرن غصے سے کانپنے لگے تھے تو ان کو کلکٹر کے چپراسیوں نے کمرے سے باہر دھکیل دیا تھا۔ اس روز اس کمرے میں ایک انگریز مشنری بھی موجود تھا جو اپنا سفرنامہ لکھ رہا تھا اور یہ مکالمہ سننے کے بعد اس نے قلمبند کیا تھا۔ ''بنگال کا ہندو مسلمان نوابوں سے نفرت کرتا ہے۔ مسلمان ہندوؤں کے خون کے پیاسے ہیں، اس ملک میں کوئی اتحاد نہیں۔ دراصل اسے ایک ملک کہنا ہی نہیں چاہیے، یہ بہت سی اقوام کا مجموعہ ہے۔ جس میں ہندو مسلمان ہمیشہ آپس میں دست و گریبان رہتے ہیں، یہ دونوں کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔''

رادھے چرن دریا کے کنارے گھاس پر بیٹھے رہے۔ کشتی اب ان کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ اس میں ایک بلند و بالا نوجوان فرنگی بیٹھا تھا جس کے وگ کا پاؤڈر اور تلوار کا دستہ چاندنی میں جھلملا رہا تھا۔ مونشور داداہا نپتے کانپتے نوکے کو کھے رہے تھے۔

رادھے چرن نے آنکھیں بند کر لیں۔۔۔علی وردی نے مرتے وقت نوجوان سراج سے کہا تھا: فرنگیوں نے شہنشاہ کے ملک اوران کی رعایا کی دولت کے آپس میں حصے بخرے کر دیے ہیں۔اس کی طاقت زبردست ہے، ان کو قلعے اور فوجیں حاصل نہ کرنے دینا ورنہ ملک ان کا ہو جائے گا۔ اس وقت چوبیس سالہ سراج مرشد آباد میں تھا۔فرنگی اس کی توہین کے طور پر اسے قاسم بازار کی تجارتی کوٹھیوں میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔اس نے ملک کے ان تاجروں کا محصول معاف کر دیا تھا مگر خود نواب کے علاقے سے جو سامان آتا، انگریز اس پر زبردست محصول گا رہے تھے۔کلکتے کی تسخیر کے بعد بھی سراج نے انگریزوں کے عہدنامے پر اعتبار کرتے ہوئے ان کو معاف کر دیا تھا۔رادھے چرن کا باپ ان سب معرکوں میں سراج کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔انگریزوں نے ہگلی میں قتل و غارت مچایا تو سراج نے لکھا: تم نے میری پرجا کو تاراج کیا ہے۔تم اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہو، اگر تم اب بھی محض تاجروں کی طرح رہنے پر اکتفا کرو تو میں تمہاری ساری مراعات واپس کر دوں کیونکہ جنگ تباہ کن ہے، تم مجھ سے امن کے معاہدے کرتے ہو اور پھر حملہ کر دیتے ہو۔سراج نے لکھا: مرہٹے، جن کو کسی مقدس انجیل کا واسطہ نہیں ہے، اپنے معاہدوں پر قائم ہیں اور تم جو خدا اور عیسیٰ کی قسمیں کھاتے ہو اپنے وعدوں کو توڑ ڈالتے ہو۔

اور ایڈمرل واٹسن نے جواب دیا تھا: ''میں ایسی آگ تمہارے ملک میں لگاؤں گا جسے گنگا کا سارا پانی نہ بجھا سکے گا، میں ایسی آگ لگاؤں گا۔ میں ایسی آگ۔۔۔'' یکا یک مشعلوں کی روشنی سے افق جگمگا اٹھا۔بوڑھی گنگا کی موجیں

جھلملا رہی تھیں۔ صاحب کی کشتی گھاٹ پر پہنچ چکی تھی۔ راجہ گریش چندر رائے اور ان کے حوالی موالی گھاٹ پر استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ رادھے چرن نے بڑ بڑا کر سر اٹھایا اور اس کی روشنی میں ان کی آنکھیں چندھیا گئیں، وہ چادر لپیٹ کر آہستہ سے اٹھے اور اپنے نیم تاریک مکان کی طرف مڑ گئے۔

چوپال میں بیٹھے ہوئے سارے آدمی سہم کر ایک ایک کر کے اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ راجہ صاحب کے پیادے رات کی دعوت کے لیے بیگار پکڑنے کی غرض سے چوپال کی سمت آ رہے تھے۔

۲۸

پچیس سال گزر گئے۔

ڈھاکہ کے کارخانوں میں الو بول رہے تھے، سارے ملک میں لوہے کی بھٹیاں مدتیں گزریں سرد ہو چکی تھیں۔ انگلستان کی ملوں سے ایسا دھواں اٹھا تھا جس نے ساری دنیا کو تاریک کر دیا اور اس تاریکی میں ہندوستانی جولاہوں کی ہڈیاں ہندوستان کے میدانوں کی دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت کی بنیاد پر انگلستان میں صنعتی انقلاب اور نئی سرمایہ داری کی نیو اٹھائی جا چکی تھی، اب باضابطہ شہنشاہیت کا دور تھا۔ مرشد آباد جو کبھی کلائیو کو لندن سے عظیم تر دکھلائی دیا تھا اب سنسان پڑا تھا۔ کلکتہ گنجان شہر بن چکا تھا، اسی کلکتے میں علی پور روڈ پر سر ل ہاورڈ ایشلے کی عظیم الشان عمارات کھڑی تھیں۔ سر ل ہاورڈ

اسلیمے، پچاس سالہ، دنیا دار، کامیاب، جہاندیدہ، پرانا پاپی، گھاگ جان کمپنی کا اہم ستون نئی اردو نثر کا مربی اور سر پرست، اودھ کے بادشاہ کا لنگوٹیا یار، اس سے اپنے شکاری کتوں سے ہلو ہلو کرنے کے بعد اب بوچے میں سوار ہونے کا ارادہ کر رہا تھا کہ حسب معمول ہوا خوری کے لیے نکلے، اس کے فزیشین نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ اپنی صحت کا زیادہ خیال رکھے، محنت کم کرے، غم کم کھائے، شراب اس سے بھی کم پیئے، روز باقاعدہ ہوا خوری کرے، ورنہ مر جائے گا۔ فزیشین کی ان نصیحتوں پر اسے ہنسی آتی تھی اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ واقعی بے حد گھٹیا ہے۔ گھٹیا، کامیاب، دولت مند، اوسط قسم کا انسان جو پچاس سال کی عمر میں پہنچتا ہے تو اس کے طبیب اس کے آگے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں۔ سارے گورنروں، اعلیٰ حکام اور دوسرے بڑے آدمیوں کے طبیب بھی ان سے یہی کہتے تھے۔

وہ کس قدر گھٹیا آدمی تھا۔ سرل نے کوفت کے ساتھ اپنے شاندار محل پر نظر ڈالی جس کے باغ میں فوارے چل رہے تھے اور کالے ملازمین کی پلٹن کام میں مصروف تھی۔ خداوند۔۔۔ مجھے تو نے اتنا ذلیل کیوں بنایا؟ پھر اس نے چند اہل کار اپنی طرف آتے دیکھے اور وہ جلدی سے اپنا بڑے صاحب والا انداز چہرے پر طاری کر کے بوچے میں جا بیٹھا۔ قاصد گورنمنٹ ہاؤس سے آئے تھے، اپنے کلرک کے ذریعے چند کاغذات اسے لکھنؤ کے ریذیڈنٹ کے پاس بھجوانے تھے۔ بنگال کے حالات مخدوش تھے، اضلاع کے مسلمان کسانوں نے اودھ کے چند باغی مولویوں کی سرکردگی میں سر اٹھایا تھا اور فتنہ فساد پھیلاتے پھر رہے تھے۔ دریائی اور خشکی کے راستے محفوظ نہ تھے۔ گورنمنٹ ہاؤس میں پریشانی تھی۔ اودھ

کے بادشاہ کے پاس ان کاغذات کا پہنچنا ضروری تھا، اسے مفسدوں کا سر کچلنے کے لیے ندیا کے ضلع بھی جانا تھا (ندیا کے ضلع میں پلاسی باغ تھا جس میں آم کے گھنے کنج تھے اور موسم گرما کے عروج پر جب آم میں بور آ رہے تھے وہاں کرنل کلائیو، سراج سے لڑا تھا) ۔ندیا۔ گورنمنٹ ہاؤس سے آئے ہوئے اس سرکاری خط میں اس نام کو پڑھ کر اور بہت سی باتیں ذہن میں آ گئیں ۔ناموں اور لفظوں کے ساتھ یہ کیا مصیبت تھی، ہر چیز کا کسی نہ کسی شے سے تعلق تھا۔ ساری دنیا ساری کائنات اسے کوئی نہ کوئی افسانہ سنانے کے لیے تلی بیٹھی تھی، اپنا افسانہ وہ کس کو سنائے گا؟

خط پر دستخط کر کے قاصدوں کو رخصت کرنے کے بعد وہ پھر چلنے کے لیے تیار ہوا۔ آسمان پر بادل گھر آئے تھے، سامنے سڑک پر چند کالے مرگلے آدمی ایک ارتھی اٹھائے ہری بول ہری بول کے ہولناک نعرے لگاتے جلدی جلدی قدم اٹھاتے مرگھٹ کی طرف جا رہے تھے۔ سرل کو ایک پھریری سی آئی اور اس نے جھک کر ایک سوگوار سے پوچھا: ’’کس کی ارتھی لیے جاتے ہو؟‘‘

’’ڈھاکیشوری کے رادھے چرن بابو۔‘‘

سرل چونکا، رادھے تو شنیلا کے باپ کا نام تھا۔

شنیلا کون تھی۔۔؟

دنیا میں ہزاروں رادھے چرن ہوں گے اور اس نے شنیلا کے باپ کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا جو سنا تھا کہ کبھی کبھی اپنے بیٹے سے ملنے گاؤں سے آ جایا کرتا تھا اور کافی خبطی اور بد دماغ بوڑھا تھا۔

سرل ٹوپی اتار کر سڑک کے کنارے ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ ارتھی والوں نے

بڑی حیرت سے اس کو دیکھا۔ انگریز حاکم جو زندہ بنگالیوں کے ساتھ جوتے لات سے بات کرتا تھا مرے ہوئے بنگالی کی یہ تکریم کیوں کر رہا تھا؟

بے چارے رادھے چرن بابو۔ کاش تم چند لمحوں کے لیے زندہ ہو کر اپنی یہ عزت افزائی دیکھ لیتے۔

جلوس آگے نکل گیا۔ ہری بول، ہری بول کی آوازیں مدھم ہو کر غائب ہو گئیں۔ کہاروں نے ادب سے پوچھا: ''صاحب کدھر جائیے گا؟''

سرل پھر بوچے میں جا بیٹھا۔ ''جہاں چاہو چلو۔''

اس نے زندگی کی ہنگامہ خیزیاں دیکھی تھیں۔ موت کی گرم بازاری کا نظارہ کیا تھا، اس نے دنیا کے ہر رنگ کو ہر پہلو سے پرکھا تھا۔ انسان کس طرح جیتے تھے، کس طرح مرتے تھے، یہ گورکھ دھندا کیوں تھا؟ گہری ندیا اگم جل زور بہت ہے دھار۔ کھیوٹ سے پہلے ملو جو اترا چاہو پار۔ کھیوٹ کہاں تھا اور اس سے ملنے کی فرصت کسے تھی، مگر روح کا یہ غم کیسا تھا جو مدتوں سے کھائے جا رہا تھا۔ کسی دور، کسی حال میں اس کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ زندگی سے اسے جتنی توقعات تھیں ان سے کہیں زیادہ مہربانی سے زندگی اس سے پیش آئی تھی مگر زندگی کو اس نے اپنی طرف سے کیا دیا تھا؟ اس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا: یہ پر رونق خوبصورت شہر، اس کی دولت اس کی آبادی، سب اس کے قدموں میں بکھری تھی، اسے چاروں طرف کے انسان اپنا منہ چڑاتے نظر آئے۔ چوراہے پر پہنچ کر کہاروں نے کندھا بدلنے کے لیے بوچہ زمین پر رکھا، سامنے ایک پرتگالی شراب خانہ تھا۔ ہگلی کے برطانوی اور اطالوی ملاح دروازے پر ہلڑ کر رہے تھے، اندر کوئی زور زور سے ہارپ بجا رہا

تھا۔ ایک عورت سر پر سیاہ جالی کا رومال اوڑھے تیز تیز نظروں سے اسے گھورتی شراب خانے کے دروازے میں داخل ہوگئی۔

''ٹھہرو، یہیں رکو۔'' سرل نے چلا کر کہاروں سے کہا، انہوں نے بوچہ دوبارہ زمین پر دھر دیا۔ سرل کود کر اس عورت کے پیچھے پیچھے دوڑا، وہ یہ قطعی بھول گیا کہ اس کو کلکتے کے اس گھٹیا یورپین شراب خانے میں گھستا دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے۔

کاؤنٹر کے پیچھے ایک پیلی رنگت اور بجھی بجھی آنکھوں والا یورپین بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ سرل کو دیکھ کر وہ ہڑبڑا گیا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور مارے رعب کے اس کی زبان ہکلا گئی۔ ''سر۔ سر۔'' اس کے آگے اس کی آواز حلق میں ڈوب کر رہ گئی۔

سرل خاموشی سے اسے دیکھا کیا۔ ساری دنیا کے شراب خانوں کے کاؤنٹرز کے پیچھے بیٹھے ہوئے یہ ان کے مالک کس قدر پراسرار لگتے تھے، ان سب کی بڑی خاموش برادری تھی۔ یہ آوارہ گردوں، چوروں، اچکوں، بدمعاشوں اور طوائفوں کی اپنی مخصوص اداس دنیا تھی۔

اتنے میں وہی عورت تیز تیز آواز میں بولتی تیزی سے قدم رکھتی ایک لکڑی کے زینے پر سے اتری، نیم تاریکی میں اس کے سفید دانت جھلملائے۔ اب دو برطانوی ملاح غل مچاتے اندر آ چکے تھے اور ان کے ساتھ دو بے حد حسین یوریشین لڑکیاں تھیں، ان میں سے ایک لڑکی بہت زور زور سے قہقہے لگا رہی تھی۔

اس لڑکی کے چہرے پر سرل کو اپنی آنکھیں نظر آئیں، وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔

''کدھر جاتے ہو سرل صاحب۔'' اس عورت نے، جس کے پیچھے وہ اندر آیا تھا، یکلخت اس کے سامنے آ کر دروازے میں اس کا راستہ روکتے ہوئے استہزاء سے

کہا۔ اس کے بندے جھلکورے کھا رہے تھے اور وہ خاصی بے تکی نظر آ رہی تھی۔ دروازے کی چوکھٹ سے لگ کر اس نے بڑے اطمینان سے سرل کو گھورنا شروع کیا۔ ''سرل صاحب، اپنی لڑکی سے ملتے جاؤ، تم نے مجھے کلکتے بلایا تھا۔ میں پچیس سال سے تمہاری منتظر ہوں۔ میں اسے چار سال کا گود میں اٹھا کر یہاں لائی تھی مگر تمہارے چوبداروں نے مجھے آج تک تمہاری کوٹھی میں گھسنے ہی نہیں دیا، میں کیا کرتی۔ تم نے تو میرے کسی خط کا جواب بھی نہیں دیا، تم جاننا چاہتے تھے کہ ہم لوگوں کی زندگیاں کیسے گزرتی ہیں۔ دیکھ لو، اس طرح گزرتی ہیں۔

''سرل صاحب، تم تو بنگال گورنمنٹ کے بہت بڑے افسر ہو۔ کچھ میرے لیے روپیوں کا بندوبست کر دو۔ سنا ہے نیٹو عورتوں نے تم سے بہت فیض حاصل کیا ہے۔ میں تو پھر ایک حد تک تمہاری ہم قوم ہوں۔''

سرل پسینہ پسینہ ہو رہا تھا، اسے محسوس ہوا ابھی اسے دل کا دورہ پڑے گا اور وہیں کھڑے کھڑے ختم ہو جائے گا۔ اسی وقت سامنے سے ایک گھوڑا گاڑی گزری جس میں کلکتہ کرانیکل کے چند صحافی بیٹھے تھے۔ ان کو دیکھ کر سرل کی جان ہی نکل گئی، اگر کسی طرح ان کو اس معاملے کی خبر ہو گئی تو کل تک یہ سارا واقعہ کلکتے بھر کی سوسائٹی میں مشتہر ہو گا۔ ولایت تک بات پہنچے گی اس کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھ کر اس کا چوبدار بھاگ کے اس کے پاس آیا: ''صاحب، آپ کا جی ماندہ ہے۔ چلئے۔'' پھر بوچے میں جا بیٹھا۔

عورت کمر پر ہاتھ رکھے دروازے میں کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر اندر چلی گئی۔

''حضور گھر چلئے گا؟'' کہاروں نے پوچھا۔

گھر؟ اس کا گھر کہاں تھا؟ ''نہیں باغ والے بنگلے چلو۔'' اس نے غصے سے کہا۔ اپنے باغ میں پہنچ کر وہ سوچے گا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

بوجھ آگے بڑھتا گیا۔

جلدی۔۔۔جلدی۔ اس نے کہاروں کو ڈانٹا۔ زندگی کا سارا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتا جا رہا تھا، یہ زندگی کا فانوس تھا اور وہ خود تنہا اس میں مقید تھا اور اس کے چاروں طرف رنگا رنگ تصویریں بنی تھیں اور اسے ان تصویروں سے ڈر لگ رہا تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس کے رفقہائے کار، فورڈ ولیم کالج کے منشی اور نثار، ایشیا ٹک سوسائٹی کے محقق، اودھ کے شعراء اور فن کار، حتیٰ کہ لکھنؤ کی چمپا بائی۔ یہ سب مل کر اس کی روح کے غم کو نہیں مٹا سکتے تھے۔

اس کی روح کے غم کیا تھے؟۔۔عورتیں۔۔؟

ہرگز نہیں۔ عورتو کے مسئلے نے اسے کبھی پریشان نہیں کیا۔ کامیاب، مطمئن انسانوں کی زندگیوں میں ایک خاص خانہ ہوتا ہے جو صنف لطیف کے لیے وقف رہتا ہے۔ ان کی محبتیں، ناکامیاں، رومان، ازدواجی زندگی کی مسرتیں یا بے کیفیاں، یہ سب چیزیں اس لیبل کے تحت آتی ہیں جس پر ''عورتیں'' لکھا ہے۔ سرل ایشلے، جس نے شاعر کی نظروں سے دنیا کو پہلی بار دیکھا تھا، اب شاعر کے بجائے ایک کامیاب انسان بن چکا تھا، اس کی روح کا دکھ یہ تھا کہ وہ کسی سے محبت نہ کرسکا۔ اس ملک سے، جس نے اپنی ساری جمع پونجی اس کے قدموں میں ڈال دی۔ ان عورتوں سے، جنہوں نے وقت کے مختلف حصوں میں اسے چاہا۔ مدراس

کی ماریا ٹیریزا، ڈھاکیشوری کی شنیلا اور بہت سی عورتیں جو اس کے غیر معمولی حسن سے متاثر ہو کر اس پر نچھاور ہوئیں۔ سرل ایشلے نے دنیا سے سب کچھ حاصل کرلیا لیکن اس کے بدلے میں دنیا کو کچھ دیا نہیں، یہ بڑی بدنصیبی کی بات تھی، اگر اس کے عہد میں مذہب کا چرچا ہوتا تو شاید وہ خدا میں پناہ ڈھونڈتا لیکن دنیا عقلیت پرستی اور سائنس اور مادیت کی طرف جا رہی تھی۔ بنک آف انگلینڈ چرچ آف انگلینڈ سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ زندگی کے معنی تھے اور زیادہ سرمایہ اور زیادہ تجارت، حکومت اور زیادہ ترقی اور اقتدار۔ اپنے گارڈن ہاؤس میں پہنچ کر اس نے اس ہفتے کی ڈاک دیکھی، کچھ دیر سویا پھر پیچوان کے کش لگانے کے بعد دوبارہ دفتر جانے کے لیے تیار ہوا۔ دل کی ویرانیاں بھی تھیں مگر فرض اسے پکار رہا تھا کہ ندیا کے ضلعے میں جا کر باغی کسانوں کی سرزنش کرے۔ قانون اور انصاف کا تقاضا تھا کہ ان باغیوں کو سخت ترین سزائیں دی جائیں، گو دل کی ویرانی کہتی تھی لکھنؤ چلو، وہاں دربار کی رنگینیوں میں سارے غم ڈھل جائیں گے۔

کوٹ پہن کر وہ پھر بوچے پر سوار ہوا اور چورنگی کی طرف لوٹا، جدھر اس کا دفتر تھا۔

۲۹

نوجوان بنگالی کلرک نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، وہ اب تک فائلوں پر جھکا ہوا تھا۔ گھنگھریالے بال اس کے ماتھے پر آن گرے تھے۔ میز پر چاروں طرف

مٹیالے کاغذات کا انبار تھا۔ باہر برآمدے میں اڑیہ قلی لڑکا اونگھتا جاتا تھا اور پنکھے کی ڈور کھینچ رہا تھا۔ سرل کو دفتر میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا اور پنکھا زیادہ تیزی سے کھینچنے لگا۔

''گڈ آفٹرنون سر۔'' نوجوان نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بڑے رسان سے کہا۔

''گڈ آفٹرنون۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''گوتم نیلمبر دت ہے سر۔''

''میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''میں کل ہی پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے دفتر سے یہاں ٹرانسفر کیا گیا ہوں۔''

''کب سے کام کر رہے ہو؟ ابھی تو لڑکے ہی معلوم ہوتے ہو۔'' سرل نے دلچسپی سے پوچھا، اس کا نیٹو لوگوں سے یہ دوستانہ انداز ایک زمانے میں کارنوالس کو بہت کھلا کرتا تھا کیونکہ جب سے جان کمپنی کو سیاسی اقتدار ملا تھا کارنوالس نے پالیسی تبدیل کر دی تھی۔ اب انگریز حاکم تھے اور ہندوستانی محکوم۔ انہیں کسی حالت میں بھی نیٹو لوگوں سے برابری کا برتاؤ نہ کرنا چاہیے تھا۔ ہسٹن بہادر، وارن ہیسٹنگز کے زمانے خواب وخیال ہو چکے تھے۔ کارنوالس کے عہد سے انگریز اور نیٹو کے درمیان سماجی خلیج وسیع ہوتی جا رہی تھی مگر سرل اولڈ سکول کا 'نواب' تھا۔ اسی طرح شاعروں سے ملتا۔ مجرے سنتا۔ اودھ ریذیڈنسی میں رہ کر اس پر ہندوستانیت کا رنگ اور بھی گہرا ہو چکا تھا، اسے کارنوالس یاد آیا۔ گڈ اولڈ کارنوالس جو غازی پور پہنچ کر ہیضے کا شکار ہو گیا، اب تو اس کی ہڈیاں بھی قبر میں گل گئی ہوں گی۔ اسے

موت کے احساس نے پھر گھبرا دیا، اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں اور پھر بنگالی کلرک پر نظر ڈالی۔ ''تم نے کہاں پڑھا ہے؟''

''سنسکرت کالج بنارس اور یہاں'' اس نے جواب دیا، ''کلکتہ کالج میں ایف۔اے تک پڑھا ہے، اب بی۔اے کرنا چاہتا ہوں۔''

''بڑی خوشی کی بات ہے'' سرل نے واقعتاً خوش ہو کر کہا۔ ''دفتر کے بعد بھی مجھ سے ملتے رہا کرو۔'' پھر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے نیلمبر دت کو پھر بلایا۔

''سفر کرنا پسند ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کبھی شاہ اودھ کی عملداری میں گئے ہو؟''

''میں بنارس سے آگے کبھی نہیں گیا۔''

''اب جاؤ گے۔؟ چند ضروری کاغذات ہیں، تمہارے ساتھ مسلح دستہ جائے گا، میں خود نہیں جا سکتا کیونکہ مجھے اضلاع کا دورہ کرنا ہے۔ گھر جا کر سامان باندھو۔ انگلیش سے کہو جہاز میں تمہارے لیے کیبن کا بندوبست کر دے۔''

''یس سر۔ تھینک یو سر۔'' وہ الٹے قدموں اپنے کمرے میں واپس آیا اور پھر کاغذات پر جھک گیا۔ سرل اسے بڑی محبت سے دیکھا کیا۔ انسانوں کو پہچاننے، ان کی روح کے اندر جھانکنے کی اس نے اس سے پہلے کوشش کیوں نہیں کی تھی؟

جہاز نے، جو کلکتے سے بنارس جاتا تھا، ابھی لنگر نہیں اٹھایا تھا۔ بارشوں کا موسم آ چکا تھا اور مونگیر اور پٹنے تک گنگا کی موجیں ہلاکت خیز تھیں۔ گوتم نیلمبر سامان

سفر درست کرنے کے بعد اب بادلوں کے چھٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ مانک تلہ میں اس کا چھوٹا سا مکان تھا جہاں وہ اکیلا رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ، بہن بھائی سب راج شاہی میں رہتے تھے اور کھیتی کرتے تھے۔

اس سمے شام ہو چکی تھی۔ آنگن کے کونوں میں جھینگر بول رہے تھے۔ گلیوں میں بارش کا پانی بھرا ہوا تھا۔ ہوا بند تھی، وہ اپنے کمرے کے برآمدے میں، جس کی سیڑھیاں گلی میں اترتی تھیں، چٹائی بچھائے لالٹین جلائے ایک موٹی سی انگریزی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا اور بار بار ڈکشنری دیکھتا جاتا تھا، اتنے میں آہٹ ہوئی اور اس نے سفید ساری میں لپٹی ایک چالیس سالہ عورت سامنے کھڑی دیکھی، وہ جلدی سے اٹھا اور نمسکار کرنے کے بعد اس سے پوچھا:

''کیا بات ہے ماں۔؟ کس سے ملنا چاہتی ہو۔؟''

''تم ہی سے۔''

''مجھ سے؟''

''ہاں۔تم سرل صاحب کے کلرک نہیں ہو۔؟''

''ہاں ہوں تو۔''

''میں شنیلا ہوں۔''

''شنیلا۔ماں۔؟'' اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ ''تمہاری کیا سیوا کروں؟''

''میں۔میں سرل صاحب کی بیوی ہوں۔''

''اچھا۔؟'' اسے یاد آیا دفتر میں اسے کسی نے بتایا تھا کہ سرل صاحب کے زنانخانے میں برسوں سے ایک ہندو عورت رہتی تھی جس کو کچھ عرصے سے انہوں

نے علیحدہ کر دیا تھا اور اس کے لیے دوسرا مکان لے رکھا تھا۔

''تم کو صاحب بہت مانتے ہیں، میرا ایک کام کر دو گے، تم لکھنؤ جا رہے ہو نا۔؟''

''ہاں۔ہاں۔''

''تم نے چمپا بائی کا نام سنا ہے؟''

''چمپا بائی۔وہ کون ہے؟''

''لکھنؤ کی بڑی مشہور طوائف ہے۔صاحب جب بھی لکھنؤ جاتے ہیں اس پر ہزاروں خرچتے ہیں، میری اب بات بھی نہیں پوچھتے۔میرا اب دنیا میں کوئی نہیں ہے، ایک بوڑھا باپ تھا وہ بھی مر گیا۔ بھائی اپنے کاروبار میں لگے ہیں۔ بھاوج اٹھتے بیٹھتے طعنے دیتی ہے۔''جاؤ اپنے فرنگی کے پاس۔''اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔''میری ایک لڑکی بھی ہے، وہ دس سال کی ہوئی تو اسے صاحب نے اپنی بہن کے پاس بھیج دیا، وہ ولایت سے لوٹ کر آئی ہے تو مجھے پہچانتی بھی نہیں۔ اسے لوگوں کو بتاتے شرم آتی ہے کہ اس کی ماں کالی عورت ہے۔''

نیلمبر کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے، اسے یہ معلوم نہ تھا کہ صاحب کی ایک لڑکی بھی ہے۔''تمہاری بیٹی کا کیا نام ہے؟''

''مارگریٹ اجابل، پر میں اسے بیلا پکارتی تھی۔''

''تم عیسائی ہو گئی ہو؟''

''نہیں، مگر بیلا ہمارے دھرم کو بہت برا سمجھتی ہے۔تم چمپا سے کہو وہ صاحب کا خیال چھوڑ دے، تم لکھنؤ سے آ کر مجھ سے ملو گے نا، تم مجھے بتاؤ گے تم نے چمپا سے

کیا کہا؟''

''میں تم سے ضرور ملوں گا ماں۔'' گوتم نیلمبر نے کہا، پھر وہ اسے پہنچانے کے لیے گلی میں اتر آیا۔ ''تمہاری پالکی کدھر ہے؟''

''میں پیدل آئی تھی، تم میری فکر نہ کرو۔'' گلی کے اندھیارے میں اس کی سفید ساری کچھ دیر تک جھلملاتی رہی پھر وہ موڑ پر پہنچ کر وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ گوتم نیلمبر برآمدے میں واپس آ کر دوبارہ اپنی ڈکشنری پر جھک گیا۔

۳۰

لکھنؤ کے رومی دروازے میں پہر دن چڑھے کی نوبت بجنے والی تھی۔ بیل گاڑیاں اور شکر میں چرخ چوں کرتی دیہات کی طرف سے شہر کے ناکوں میں داخل ہو رہی تھیں، ان بیل گاڑیوں پر ترکاریاں اور پھل لدے تھے اور مسافر سوار تھے۔ چوک اور نخاس میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ امراء کے محلات کے پائیں باغ صاف کیے جا رہے تھے۔ ملازمین باسی پھولوں کے گلدستے اور گجرے سمیٹ رہے تھے۔ مہریاں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ سڑکوں کے کنارے ساقنوں اور تنبولنوں نے اپنی اپنی دکانوں کی آرائش شروع کر دی تھی۔ لوگ آتے تھے، دو گھڑی ہنس بول کر، زردہ کھا کر یا حقے کے دو کش لگا کر اپنے اپنے کاروبار میں مصروف آگے بڑھ جاتے تھے۔ میدان میں نجیبیوں کی پلٹنیں قواعد کر رہی تھیں۔ تلنگے، جھلنگے، حبشی سپاہی، راجپوت عہدے دار، محلات شاہی کے پہرے پر مستعد

کھڑے تھے۔ رمنا کے جنگلوں میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ گومتی کے کنارے کشتیاں بندھی کھڑی تھیں، ابھی بجروں کے چلنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ ساحل دریا پر بنی ہوئی کوٹھیوں کا عکس شفاف پانی میں جھلملا رہا تھا۔ ساون کے اودے بادلوں اور آس پاس کے سبزے کی وجہ سے گومتی بھی سبزہ رنگ ہو رہی تھی۔ حیات بخش، ٹیڑھی کوٹھی، کنکر والی کوٹھی، سنگھاڑے والی کوٹھی، خورشید منزل، سب جگہوں پر بادل جھک آئے تھے۔ باغوں میں پڑکا لگ گیا تھا۔ کنجوں میں جھولے پڑ گئے تھے۔ لکھنؤ ساون منانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

پھر دوپہر کی نوبت بجی طعام خانوں کی رونق دوبالا ہوئی۔ بھٹیارنیں مصروف ہوئیں۔ لوگ اپنے اپنے کارخانوں سے کھانا کھانے کے لیے نکلے۔ دیوان خانوں میں دسترخوان بچھے۔ بیگمات نے خس کی ٹٹیوں کے پیچھے جوسر کی بساطیں بچھائیں۔ مہریاں اور خواصیں پاندان کھول کر بیٹھیں۔ لڑکیاں بالیاں چنریاں رنگنے میں مصروف ہوئیں۔ کڑھائیاں چڑھائی گئیں۔ سہ پہر کی نوبت بجی، دن ڈھلنا شروع ہوا۔ دلفریب باغات میں درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ رمنا میں پلے ہوئے جنگلی جانور چنگھاڑتے پھرے اور ہرن کلیلیں بھرا کیے۔ چڑیا جھیل پر بادل جھک آئے تھے۔ موتی محل پر بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں برس گئیں۔

چوتھا پہر آیا۔ سورج ڈوبنے لگا۔ ہواؤں میں خوشبوئیں امنڈ آئیں۔ شام اودھ اپنی پوری آب و تاب سے بزم آراء ہوئی۔ سارے شہر کو رنگا رنگ کی خوشبوؤں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چھڑکاؤ کی ہوئی مٹی کی سوندھی خوشبو، گندھیوں کی دکانوں کی مہک، قنوج کے بیلے اور جونپور کے گلابوں کی خوشبو،

مندروں میں سے اٹھتے ہوئے عود کی لپٹ۔ بادشاہ کے محل میں بہتی ہوئی عطر کی نہر کی خوشبو، پھر گلی کوچوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے، لوگ گلیوں اور سڑکوں پر آ گئے۔ انہوں نے باغوں کا رخ کیا۔ گلی کوچوں میں سے نغمے کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ خوش شکل اور خوش لباس کنجڑنیں، تیز وطرار تنبولنیں، حسین اور حاضر جواب بھٹیارنیں ساون اور لاونیاں گاتی پھر رہی تھیں۔ گلی کے لڑکے بیت بازی کرتے جاتے تھے اور گولیاں کھیلتے تھے۔ غریبوں اور امیروں کے مکانوں سے ستار اور جل ترنگ اور طنبورے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ندی کنارے بیٹھے ہوئے جوگی تری بجاتے تھے۔ نئی بیاہی لڑکیاں اپنے اپنے گھروں میں بیٹھی سڑک کی اور دیکھتی تھیں کہ ساون منانے کے لیے ان کا بھائی میکے سے ڈولی کب بھیجے گا۔ حلوائی پوریاں چھان رہے تھے۔ بچیاں پکوان بنا رہی تھیں، ہر شخص مسرور تھا۔

لوگو! خوش ہولو کہ دنیا فانی ہے، جانے کتنے دن کا چین تمہارے نصیبوں میں لکھا ہے۔ آپس میں ہنس بول لو، غنیمت جان لو کہ یہاں دو چار ہم جنس مل بیٹھے ہیں۔ کل کیا جانئے کیا ہو۔ کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین۔ باقی صرف خدا رہے گا جو کہیں بہت دور بیٹھا اس لیلا کا تماشا کرتا ہے وہ خدا جو صوفیوں کا ہے اور فرنگی محل کے مولویوں کا اور بالا ناتھ کے جوگیوں کا اور وہ کسی سے بھی اپنی انگلی اٹھا کر کہہ سکتا ہے: بس، اب ختم کیا جائے۔

اے حقیر اور بے بس اور مضحکہ خیز انسانو! تم سب ایک مکڑی کے غیر مرئی جال میں گرفتار ہو چکے ہو، مکڑی کو تم پہچانتے نہیں ہو کیونکہ تمہارا جال غیر مرئی ہے۔

کب تک تمہاری یہ مسرت رہے گی، بے چارے لوگو! مسرت بڑی عظیم چیز

ہے۔ دوسروں سے ان کی مسرت نہ چھیننا۔

یہ لوگ جوان سڑکوں پر چل رہے ہیں، گا رہے ہیں، خوش ہیں، انہوں نے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔ یہ باوقار، با نفاست، باوضع، پر امن زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، یہ لوگ جوان باغوں میں جمع ہیں بڑے اہم لوگ ہیں کیونکہ یہ ایک بڑی تہذیب کے نمائندے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے فرانس کی مانند انہوں نے جینے کے فن کو اعلیٰ ترین بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ یہ نام، یہ صورتیں بڑی اہم ہیں، جب کوئی ان کا نام لیتا ہے تو دل پر چوٹ لگتی ہے۔ شجاع الدولہ، بہو بیگم، بنی بہادر، ٹکیٹ رائے اور اودھ کے یہ مرنجان مرنج باشندے جو ہزاروں سال سے گھاگرا اور گومتی کے کنارے رہتے آئے ہیں۔ رام چندر کے زمانے میں بھی یہی لوگ تھے۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں بھی یہ لوگ زندہ تھے۔ یہ کسان اور جوگی۔ دریا کے کنارے وہ ناگا گوسائیں دھونی رمائے بیٹھا ہے۔ یہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شجاع الدولہ کی فوج میں شامل ہو کر بکسر میں انگریزوں سے لڑا تھا۔ یہ پر امن کسان اپنا ملک بچانے کے لیے نواب کے سپاہیوں کی حیثیت سے مرہٹوں سے ٹکر لیتے تھے۔ یہ مرنجان مرنج ملوا ہے اور گوالے عظیم آباد تک پہنچ کر انگریزوں سے بھڑ گئے تھے، امن نہیں تھا۔ سندھیا کی فوج نے گنگا پار کا علاقہ تباہ کر رکھا تھا۔ الہ آباد میں کلائیو ڈز ٹیبل پر شاہ عالم کا تخت بن چکا تھا۔

انگریزوں نے شجاع الدولہ کی زبردست فوج سے گھبرا کر عہدنامہ کیا تھا کہ پینتیس ہزار سے زیادہ فوج نہ رکھیں گے مگر حسب معمول وہ اس وعدے سے پھر چکے تھے اور جب فیض آباد کا شجاع الدولہ مرا اس کو صدمہ تھا کہ انگریزوں کو ملک

سے نکال نہ سکا۔ شجاع الدولہ جو مہاجی سندھیا کا پگڑی بدل بھائی بنا تھا۔ یہ نام اس داستان کے ہیں۔ داستان صبح ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے فن داستان گوئی کو اپنے عروج پر پہنچا دیا ہے کہ خود بھی یہ قصہ سناتے سناتے قصے میں تبدیل ہو جائیں گے۔

ان کا قصہ مضحکہ خیز ہے!

لکھنؤ پریوں کے شہر کی طرح جگمگا رہا ہے۔ یہ مانوس گلیاں سڑکیں، محلے، گنج، کٹڑے، باغ، ناکے، بارونق، آباد، بھرے پرے۔ یہ قلعہ مچھی بھون ہے۔ یہ معالی خان کی سرائے ہے۔ یہ آصف الدولہ کے جان نثار راجہ جھاؤ لال کا پل ہے۔

ذرا ٹھہرو، آصف الدولہ۔۔ یہ کس کا نام لیا کہ دل کے سارے تار جھنجھنا اٹھے، وہی آصف الدولہ جس کا نام لے کر ہندو دکان دار صبح کو اپنی دکانیں بولتے ہیں؟ جس کو نہ دے مولا۔ اس کو دے آصف الدولہ، جو کہتا تھا ''جہاں میں جہاں تک جگہ پایئے، عمارت بناتے چلے جایئے۔'' جس نے قحط سالی کے زمانے میں پرجا کو روزی مہیا کرنے کے لیے امام باڑہ تعمیر کروایا تھا جہاں رات کو مشعلوں کی روشنی میں کام ہوتا تھا کہ شرفاء، کومٹی ڈھوتے اور اینٹیں چنتے شرم نہ آئے۔ دیالو، سخی، دیوتا سمان آصف جس نے باغات، بارہ دریاں، شیش محل اور ہاتھی دانت کے بنگلے بنوا ڈالے جو غریبوں اور اہل کمال کی پرورش اور قدر کے لیے نت نئی تجویزیں دماغ سے اتارتا تھا۔ جری شجاع الدولہ کا سخی بیٹا آصف۔ اس کے فرانسیسی جنرل کلاڈ مارٹن کے قلعے کونسٹیشیا کے باغ میں بہار کے سارے پھول کھلے ہیں۔ فرح بخش

کوٹھی کے نیچے سے ندی سبک خرامی سے بہہ رہی ہے۔ طعام خانے کے دریچوں کے نیچے سے کشتیاں گزر رہی ہیں۔ برسات میں کوٹھی کی نچلی منزلیں تہ آب ہو جاتی ہیں تو جنرل اوپر کی منزلوں میں چلا جاتا ہے۔ فرانسیسی معماروں کی بنائی ہوئی کوٹھیوں میں جھاڑ فانوس سجے ہیں۔ پیانو رکھے ہیں۔ ولایتی فرنیچر جھل جھل کر رہا ہے۔

یہ شہر ایودھیا اور بنارس کی قدیم موسیقی کا محافظ ہے۔ یہاں کی بھیروی سارے ملک میں مشہور ہے۔ یہاں محرم کے زمانے میں بہاگ اور پیلو اور سوہنی گھل جاتی ہے۔ بیگمات کے محلوں کی چہار دیواری میں لے دار اور گلے باز ڈومنیاں سال بھر جشن موسیقی مناتی رہتی ہیں۔ چوک کے کمرے اور مضافات کے باغ اور بارہ دریاں باکمال ڈیرے دار طوائفوں کی تانوں سے گونجتی ہیں۔ چاندنی راتوں میں کہار اور مزدور منڈیروں پر بیٹھ کر برہا گاتے ہیں۔ برج کے رہس دھاری راس لیلا کا سوانگ رچاتے ہیں۔ برہمن رقاص ایک گھنگرو بجا کر ناچ رہے ہیں اور آس پاس سارے میں موت کا گھنگرو بج رہا ہے۔ پچھلے ستر اسی سال سے یہ ناٹک فیض آباد اور لکھنؤ کے رنگ بھوم پر کھیلا جا رہا ہے۔ ان کرداروں کی اہمیت باہر والے نہیں سمجھ سکتے۔ ان سب نے مل کر اس دنیا کی تخلیق کی ہے جو اودھ کے باشندوں ہندو و مسلمانوں کی اپنی دنیا ہے۔ یہ لوگ کبھی رلاتے ہیں کبھی ہنساتے ہیں، ان جیسے نام اور کہیں نہ ہوں گے۔ ان کی جیسی زبان، مذاق، لباس۔ یہ لوگ، غریب امیر عورت مرد، جوٹھا کر امام بخش اور لالہ حسین بخش، مرزا مینڈھو اور نواب کمن کہلاتے ہیں اور امامن مہری اور مرزا جنگلی اور سکھ بچن لونڈی اور

نواب بسنتی بیگم، یہ سب روتے ہیں، ہنستے ہیں، گاتے بجاتے ہیں، لڑتے ہیں۔ شجاعت ان کا شیوہ ہے، آن پر جان دینا۔ شرافت، احسان مندی، وفاداری، نیکی۔۔ اس کے علاوہ جاگیردارانہ سماج کی جتنی اچھائیاں اور جتنی برائیاں ہوسکتی ہیں وہ سب ان میں موجود ہیں، اسی لیے یہ لوگ بڑے جذباتی ہیں۔ بتاشے اور کوڑی پر ناچنے والے رقاص، کشمیری بھانڈ، جل ترنگیے، بین کار، باورچی برہمن، طبلچی، شاعر، مرثیہ گو، داستان گو، کالیستھ، فوجی، بانکے، چنڈو باز، بھگت باز، نقال، بہروپیے، عالم، فاضل، کلاونت، یہاں رزم و بزم ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ یہ اصل روائی معاشرہ ہے۔

لکھنؤ سے ستر میل کے فاصلے پر بنگلہ فیض آباد ہے۔ رام کا شہر ایودھیا جسے شجاع الدولہ نے دلی کا ہم پلہ بنا دیا تھا۔ جہاں گلاب باڑی ہے اور گھاگرا کے گھاٹ اور بڑے مغلوں کے زمانے کی مساجد۔ دلی میں اب بچارے چھوٹے چھوٹے مغل بیٹھے ہیں۔ یہ مضحکہ خیز چھوٹے مغل بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ ان کو سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی۔

دلی کا ایک شہزادہ لکھنؤ میں پڑا ہے۔ بنارس میں پناہ گزین ہے۔ اودھ دربار سے اس کو دو لاکھ سالانہ وظیفہ دیا جاتا ہے، یہ امیر تیمور صاحبقران کی اولاد ہے۔

اور ایرانی شیعوں کی اولاد اس سے اودھ پوری میں ڈگ وجے رام چندر کے سنگھاسن پر بیٹھی ہے اور اس نے اپنی اس زبردست وراثت کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ بادشاہت ہندوؤں کے لیے ان کی قومی ریاست کے مترادف ہے۔ یہاں ہندو اور مسلمان کا اختلاف کوئی نہیں جانتا کیونکہ گڑھی کا ٹھاکر اور محل کا نواب دونوں

جاگیردارانہ اقدار کے مضبوط رشتے میں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں اور ان کی پرجا، جس میں ہندو اور مسلمان کسان دونوں شامل ہیں، ان کے سپاہیوں کی لاٹھیوں سے یکساں پٹتی ہیں۔ ان کے دکھ سکھ ایک ہیں۔

مذہبی تفریق کو پرجا کا خالص ذاتی معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ محرم میں بلوے نہیں ہوتے نہ مسجدوں کے سامنے باجہ بجایا جاتا ہے۔ ہندو تعزیہ داری کرتے ہیں اور مسلمان دیوالی مناتے ہیں کیسا الٹا زمانہ ہے۔ نواب بہو بیگم ہر سال ہولی منانے فیض آباد سے اپنے بیٹے کے پاس لکھنؤ آتی ہیں۔ ساری سلطنت میں ہندو راجاؤں نے مسجدیں اور امام باڑے بنوا رکھے ہیں۔ لکھنؤ سے اسی میل کے فاصلے پر بہرائچ ہے جسے ہزاروں برس پہلے شراوتی کہتے تھے۔ جہاں سالار مسعود غازی کی درگاہ ہے۔

ہر سال بڑی دھوم دھام سے ہندو مسلمان مل کر ان کی بارات نکالتے ہیں۔ جیٹھ مہینے میں ان کا میلہ لگتا ہے۔ سرخ نیزے اور جھنڈے اٹھائے ڈفلی بجاتے ہزاروں ہندو مسلمان دیہاتوں سے ان کے مزار کا رخ کرتے ہیں۔ بنگال کے مسلمان صوفی ستیہ پیر کی مانند جو ستیہ نرائن بن چکے ہیں۔ بت شکن سالار مسعود عرف بالے میاں نے اودھ کے ہندوؤں کے لیے بالناتھ کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ان کے مقبرے کے قریب کا اگن کنڈ بالارکھ کی دھونی کہلاتا ہے۔ درگاہ کی نذر مجاور اور پوجا کے محاصل پنڈے حاصل کرتے ہیں۔ پنڈوں اور مجاوروں میں آپس میں اس آمدنی کی تقسیم کے متعلق معاہدہ ہے۔ سر ل اشلے کے دوست بشپ ہیبر اور ان کے ساتھی، جو آج کل اس ملک میں چاروں اور گھوم کر اپنے سیاحت

نامے قلمبند کر رہے ہیں، لکھتے ہیں کہ اس **ملک** کا ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے اور ویسٹ منسٹر میں ہماری حکومت کو چاہیے کہ ان وحشیوں کو اپنے جہالت اور تعصب سے نجات دلانے کے لیے جلد از جلد مزید انجیلیں اور مزید بندوقیں بھیجے۔

لکھنؤ کے باسیوں کو خبر نہیں کہ ان بے چاروں کے لیے بندوقوں سے لدے ہوئے جہاز کلکتے کی اور آ رہے ہیں۔ آغا میر شاہ زمن کے وزیر اعظم ہیں۔ مسیتا بیگ کوتوال شہر کا حاکم ہے۔ جس نے عہد سعادت علی خان کے دھونی بیگ کوتوال کی انصاف اور امن پروری کی روایت کو زندہ کر رکھا ہے۔ شہر میں مکمل سکون ہے۔ مشہور ڈاکو محرم منانے کے لیے عارضی طور پر رہا کیے جاتے ہیں اور پھر جیل میں خود واپس آ جاتے ہیں۔ بانکے مفسدوں کی سرزنش کے لیے موجود ہیں۔ ہوا میں اشرفیاں اچھالتے چلے جائیے کوئی نہ پوچھے گا۔ بہو بیٹیوں کی عزتیں محفوظ ہیں، ایک کی بیٹی سارے محلے کی بیٹی سمجھی جاتی ہے۔ وضع داری اور شرافت پر جان دینے کا عام رواج ہے۔

یہ ابوالمظفر معز الدین شاہ زمن غازی الدین حیدر کا دار السلطنت ہے جن کی شادی میں روپیوں یا اشرفیوں کے بجائے ہاتھیوں پر سے ہیرے جواہرات کی بوچھار کی گئی تھی جن کو لوٹ کر غریب غربا دولت مند ہو گئے تھے، ان کے حرم سرا میں فرنگی کرنل ایش کی بیٹی مبارک محل براجتی ہے۔ ان کی بیٹی کی شادی بنگالے کے قاسم علی خاں کے لڑکے سے ہوئی ہے۔

اک ذرا ٹھہرنا۔ کون قاسم علی خاں۔ بنگالے کا آخری خودمختار نواب، وہ سید

زادہ جو اپنی شکست کے بعد دلی جا کر جلاوطنی کے اس عالم میں مرا کہ اس کی شال فروخت کر کے اس کی تجہیز و تکفین کی گئی۔

یہ شاہ زمن کا دارالسلطنت ہے۔شاہ زمن نے گومتی کے کنارے امام باڑہ نجف اشرف تعمیر کرایا ہے۔محرم میں اس میں چراغاں کیا جاتا ہے تو لگتا ہے طلسم ہوشربا کا ایک منظر ہے۔

بازاروں میں کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔سودے والے اپنی اپنی شاعرانہ صدائیں لگا رہے ہیں۔دکانوں میں دنیا جہان کا مال فروخت ہو رہا ہے۔سعادت علی خاں کے عہد کی بنی ہوئی عمارتوں میں قہقہے گونج رہے ہیں، ان خوبصورت عمارتوں کی آرائش دیکھ کر جی بھر آتا ہے۔اتنی خوبصورتی اور نفاست پائدار ہو سکتی ہے!

حسن پائدار نہیں ہوتا۔شاکیہ منی گوتم سدھارتھ نے ایک مرتبہ کاشی کے ہرنوں کے باغ میں کہا تھا۔ہر شے فنا ہے، فنا سے بچو، دکھ سے بچو، سائے سے بچو اور روید انت میں لکھا ہے کہ مایا کی مثال ایسی ہے گویا بانجھ عورت کا لڑکا سراب کے پانیوں میں نہانے کے بعد آسمان پر اگے ہوئے پھول پہن کر ہرن کے سینگوں سے بنی کمان ہاتھ میں لیے باہر نکلے۔مت بھولو کہ رام چندر کے ایودھیا اور پرسن جیت کے شراوستی اور چندر گپت کے پاٹلی پتر اور کالی داس کے اجین اور حسین شرقی کے جونپور اور علاءالدین حسین کے گوڑ میں بھی زندگی کا حسن اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا اور مت بھولو کہ ہر حسن میں موت پوشیدہ ہے۔

سڑک پر سے ایک سکھ پال گزر رہی ہے جس کے گنبد پر سنہری کلس سجا ہے اور

شوخ وشنک مہری جس کا چھٹکا پکڑے ساتھ ساتھ بھاگ رہی ہے۔کہاروں کی وردیاں سرخ رنگ کی ہیں اوران کی سرخ پگڑیوں پر مچھلی کے طلائی نشان بنے ہیں۔ان کے ہاتھوں میں چاندی کی موٹھ والی لاٹھیاں ہیں۔راہ گیروں کی نظریں اس سکھ پال پرجمی ہیں،یہ اپنے وقت کی حسین ترین لڑکی چمپا کی سکھ پال ہے۔

وقت بڑی عجیب چیز ہے۔

وقت اورحسن اورموت۔

باغوں میں میلے ہورہے ہیں۔مرغوں اوربٹیروں اورمینڈھوں اورہاتھیوں کی لڑائیاں منعقد کی جارہی ہیں۔انگریز ریذیڈنٹ بادشاہ کے ساتھ بریک فاسٹ کھاتا جاتا ہےاورسامنے ہاتھیوں کی لڑائی دیکھتا ہے۔برآمدے میں انگریزی بینڈ بج رہا ہے،مشاعرے ہورہے ہیں۔دربار میں یکتائے روزگار رقاص پرکاش جی کتھک ناچ رہا ہے۔شوالوں میں بھوانی کی پوجا ہورہی ہے۔آم کے کنجوں میں ملہار اڑ رہا ہے۔شمشان گھاٹ پروہ جو اس ہنگامے سے نکل گئے ہیں پھونکے جا رہے ہیں۔نخاس میں داستان طرازوں نے اپنی محفلیں آراستہ کررکھی ہیں۔علماء اورحکماء کی مجلسوں میں مباحثے جاری ہیں۔بھنگڑیے سبزی گھوٹنے میں محو ہیں۔سر سنگھار اور بجیرے اور پکھاوج کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ قبرستانوں میں قبریں کھودی جارہی ہیں۔

فنا۔فنا۔ہرشے فنا ہے۔

وقت فنا میں شامل ہے۔

وقت کومختلف حصوں میں قید کرلیا گیا ہےمگروہ پل پل چھن چھن اس قید کوتوڑتا

ہوا چپ چاپ آگے نکلتا جاتا ہے۔

اب رومی دروازے میں مغرب کی نوبت بجے گی۔

چار پہر دن گزر چکا ہے۔ چار پہر رات گزر جائے گی، ہر پہر میں آٹھ گھڑیاں ہیں، ہر آٹھویں گھڑی پر گجر بجتا ہے۔ انسانوں کا جلوس اپنی اپنی قبروں میں اتر رہا ہے۔

وقت موت ہے۔

۳۱

عہد آصفی کے بنے ہوئے رومی دروازے کی نوبت کی آواز گوتم نیلمبر کے کانوں تک پہنچی، اس وقت اس کی شکرم شہر کے ناکے میں داخل ہو رہی تھی۔ ناکے پر اس نے سپاہی کو اپنا پروانہ راہداری دکھلایا۔ بادشاہ اودھ کے سپاہی نے پوچھا: ''قبلہ کہاں سے تشریف لاتے ہیں'' اس نے بتایا: ''کلکتے سے الہ آباد کے بینی گھاٹ تک جہاز پر آیا تھا، وہاں سے اسٹیج کوچ اور شکرم پر بیٹھا بارش سے بھیگتا چلا آتا ہوں۔''

''کہاں کا قصد ہے قبلہ؟''

''ریذیڈنسی۔''

سپاہی نے ایک لمحے کے لیے اسے غور سے دیکھا۔ ''فرنگی سرکار سے جناب کا سلسلہ ہے؟''

''ہاں'' اس نے ذرا جھینپ کر جواب دیا۔

''ہاں میاں'' رام دین دوسرے سپاہی نے چلم سلگاتے ہوئے کہا، ''خدا کسی نہ کسی وسیلے سے رازق ہوتا ہے، فرنگی کی سرکار ہی سہی۔''

اس کے بعد رام دین نے پہلے سپاہی کو ایک باموقع شعر سنایا اور گوتم نیلمبر کو داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ گوتم نیلمبر نے بچپن میں فارسی ضرور پڑھی تھی مگر ان لوگوں کی ٹکسالی اردو اس کے پلے نہ پڑی، یہ اس نے پہلی بار دیکھا کہ ملک میں ابھی ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں نیٹو بادشاہ اب تک حکومت کرتا ہے۔ اسے یہ سوچ کر ایک لمحے کے لیے عجیب سی مسرت کا احساس ہوا۔ شکرا آگے بڑھی۔

یہ شہر کے مضافات تھے۔ سڑک کے کنارے چند اہیر بھوبھل میں بھوری لگا رہے تھے۔ کہار جامن کے نیچے بیٹھے ستو گھولتے تھے۔ چھکڑوں پر منوں آم لدے چلے جاتے تھے۔ ایک پیپل کے نیچے لکڑ سلگ رہا تھا۔ ایک بوڑھا جوگی دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ پیچھے بھوانی کا مٹھ تھا۔ نیلمبر نے غیر شعوری طور پر مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ اپنی کالی ماں کو پردیس میں دیکھ کر اسے بڑی تقویت ہوئی۔ ریذیڈنسی نواب سعادت علی خان مرحوم کی ایک اطالوی طرز کی کوٹھی تھی جسے فرنگیوں نے خرید لیا تھا، وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ صاحب نواب کمال رضا بہادر کے یہاں دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔ اس کی آمد کی اطلاع اودھ سرکار کے سررشتہ اخبار کو بھجوا دی گئی۔ دوسرا ہرکارہ گولہ گنج میں نواب کمال رضا بہادر کے مکان پر پہنچا۔

نواب ابوالمنصور کمال الدین علی رضا بہادر نصرت جنگ (جو دراصل چوبیس

سالہ نواب کمن کا وہ نام تھا جو محض شاہی اور ریذیڈنسی کی تقریبات پر لیا جاتا تھا) کھانے کے بعد ریذیڈنٹ کے ساتھ بیٹھے چوسر کھیلتے تھے۔ یہ شہر کے ایک بہت بڑے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ مرشد آباد اور لکھنؤ کے شاہی خاندانوں سے ان کی قرابت داری تھی، کافی بڑا تعلقہ کلیان پور میں تھا۔ خوش شکل تھے اور خوش آواز۔ مرثیہ خوانی پوری راگ داری سے کرتے تھے اور میر انیس کے ساتھ ساتھ مجلسیں پڑھتے تھے۔ شہر کی طوائفیں ان پر عاشق تھیں۔ شاعر تھے اور دیوان مرتب کرنے میں مصروف تھے۔ شادی سولہ سال کی عمر میں کر دی گئی تھی، اب تک متعدد خانہ زاد لونڈیوں سے متمتع کر چکے تھے۔ ان دنوں چمپا جان پر لٹو ہو رہے تھے مگر اب معلوم یہ ہوتا تھا کہ کلکتے والے سرل صاحب کی طرح یہ ریذیڈنٹ صاحب بھی اس کے رقیب بننے پر تلے بیٹھے تھے۔ انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں وہ چوسر کی چال بھی سوچ رہے تھے کہ چوبدار نے آ کر اطلاع دی کہ ایک بنگالی بابو کلکتہ گورنمنٹ سے کاغذات لے کر آئے ہیں۔ بیلی گارد میں باریابی کے منتظر ہیں۔

رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ برآمدے میں جلترنگ بج رہی تھی، ابھی چمپا آنے والی تھی۔ ریذیڈنٹ کو بڑا غصہ آیا۔ جب سے لارڈ ایمہرسٹ کلکتے میں گورنر جنرل ہو کر آیا تھا اس نے اپنے انتظامات اور مستعدی سے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اچھی خاصی ڈاک بٹھا دی تھی، ہر دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی پیغامبر کلکتے سے یہاں پہنچتا رہتا تھا۔ دل چمپا کے ناچ میں پڑا تھا مگر برطانوی حکومت کی وفاداری اور فرض کے عظیم تصورات نے چمپا کے خوش آئند ہیولے کو دھندلا دیا۔ ریذیڈنٹ صاحب فوراً بیلی گارد لوٹ گئے۔

''یہاں چمپا بائی کہاں رہتی ہیں؟'' دوسرے روز گوتم نیلمبر نے ریذیڈنسی کے ایک منشی سے دریافت کیا۔ ہری شنکر زیر لب مسکرایا۔ یہ بنگالی بابو بھی اہل دل معلوم پڑتے ہیں، بھئی واہ ہم جانتے تھے یہ بیٹھے لکھا پڑھی ہی کرتے رہیں گے۔

''کیا آپ بی چمپا صاحب کے یہاں تشریف لے جایئے گا؟''

''ہاں'' اس نے گھبرا کر جواب دیا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ہری شنکر اس کی گھبراہٹ پر بہت متعجب ہوا کیونکہ ہری شنکر کے اس معاشرے میں طوائف کا درجہ بہت اہم تھا اور با عزت۔ جس کے بغیر مہذب سوسائٹی مکمل نہیں تھی۔ منشی ہری شنکر نے ہرکارے کے ذریعے چمپا کو اطلاع بھجوائی کہ سرل صاحب کے منشی ملنا چاہتے ہیں۔ چمپا نے کہلوایا: زہے نصیب، ضرور آویں۔

شام پڑے جب موتیا اور خس کی خوشبو ہوا میں امنڈی اور زمین پر کیوڑے اور گلاب کا چھڑکاؤ کیا گیا، چوک روشنیوں سے بقعہ نور بن گیا تب گوتم نیلمبر دت کا ہوادار چمپا جان کے سبز رنگ کے سہ منزلہ مکان کے سامنے جا کر رکا جس کے رنگ برنگے شیشوں والے دروازے تھے اور پھاٹک پر وردی پوش چوبدار کھڑے تھے۔ گوتم جھجکتا ہوا ہوادار پر سے اترا اور دوشالہ کندھوں سے لپیٹتا زینے پر چڑھا۔

کمرے پر بڑا جماؤ تھا۔ فرش پر سفید چاندنی کھنچی تھی۔ سفید چھت گیری میں جھاڑ آویزاں تھے۔ طاقچوں میں کنول اور گلاس روشن تھے۔ صحنچی، جو چوک کے رخ کھلتی تھی، اس پر گلاات کی بیل چڑھی تھی۔ دروازوں کے برابر پھولوں کے بڑے بڑے چینی کے گملے رکھے تھے جن سے سارا کمرہ معطر تھا۔ صحنچی میں کسی نے مال گنج چھیڑ رکھا تھا۔ چاروں طرف قد آدم آئینے لگے تھے۔ ان آئینوں میں گوتم

نیلمبر کو عجیب عجیب شکلیں نظر آئیں۔ ایسے لوگ جن کو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، یہ کون لوگ تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ کدھر کو جائیں گے؟ یہاں اس معطر کمرے میں کب تک ان کا جماؤ رہے گا؟ یہ لوگ جو شربتی کے چنے ہوئے انگر کھے اور گلبدن اور مشروع کے کلیوں دار پائجامے اور دو پلی اور نکے دار ٹوپیاں اور مندیلیں پہنے شالی رومال اوڑھے اطمینان سے گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھے تھے ان کی انگلیوں میں فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں تھیں، ان میں جوان اور ادھیڑ اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ متین، ثقہ، سنجیدہ، مہذب، نہایت خاموشی اور اہتمام سے یہ لوگ بیٹھے بڑے تکلف اور اخلاق سے آہستہ آہستہ رک رک کر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے تھے۔ ایک کونے میں راجہ شیو کمار وفا کے کسی شعر پر بحث ہو رہی تھی، دوسری طرف چند حضرات موسیقی کے کسی نکتے پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔

نیلمبر دت لمحے بھر کے لیے شرمایا سا دروازے کے پاس کھڑا اس منظر کو دیکھتا رہا، اس نے اپنا بہترین چوغہ پہن رکھا تھا اور اس کے سر پر مندیل تھی مگر اس کی شکل وصورت ہی پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ پردیسی ہے۔ حاضرین محفل نے اسے دیکھ کر تہذیب کی وجہ سے کسی اچنبھے کا اظہار نہ کیا۔ نواب کمن نے، جو صدر نشین تھے، اسے اپنے قریب بلا کر مسند کے قریب جگہ دی اور اس سے خیریت مزاج دریافت کرتے رہے۔

''ہمارا بھی کلکتے جانے کو بہت جی چاہتا ہے مگر معاذ اللہ بہت جوکھم کا سفر ہے۔'' انہوں نے کہا، وہ گنگا جمنی گڑگڑی پیتے جاتے تھے اور ان کے خوبصورت

چہرے پر فانوس کی روشنی آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ ''بنگال کے زمینداروں کا کیا کہنا، بڑے بڑے رفیع الشان روساء اس ملک میں ہیں۔ جناب کا تعلقہ بنگالے میں کس طرف ہے۔۔؟'' نواب کمن کے ایک مصاحب نے پان کی تھالی پیش کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''میرا تعلقہ کہیں نہیں ہے، ملازمت کرتا ہوں۔''

''ملازمت؟''

اب نیلمبر کو پھر وہی جھنجلاہٹ محسوس ہوئی جس کا اسے ناکے پر سامنا کرنا پڑا تھا۔ ''میں کمپنی کی سرکار میں ملازم ہوں۔''

''خوب۔'' نواب کمال رضا نے پہلو بدلا۔ ''تب تو جناب انگریزی بھی پڑھے ہوں گے۔''

کسی اور نے دریافت کیا۔

''جی ہاں۔ تھوڑی سی شدبد ہے۔''

''اچھا بھلا کتنی۔ خط پڑھ لیتے ہیں؟''

نیلمبر دت مسکرایا۔ ''جی ہاں'' اب ذرا اس نے آرام کا سانس لیا۔ یہ بڑے نیک طینت اور بھولے لوگ تھے، ان سے خائف ہونے کی کیا ضرورت تھی، گو یہ عجیب بات تھی کہ یہ بھی اسی دنیا میں رہتے تھے جس میں وہ زندہ تھا۔

نواب کمن اس سے نواب سعادت علی خاں کا تذکرہ کرتے رہے جن کے انتقال کو چند سال ہی گزرے تھے اور جنہوں نے لکھنؤ میں کلکتے کے طرز کی عمارتیں بنوا کر شہر کو یورپین رنگ دے دیا تھا۔ گوتم نیلمبر ان کو کلکتے کی باتیں بتلاتا رہا۔

اتنی دیر میں ساز ملائے گئے ۔ ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی نک سک سے درست، چمپئی رنگت، سیاہ بھنورا بال اور سیاہ آنکھیں، ناک میں ہیرے کی لونگ پہنے، اودے گرنٹ کے فرشی پائجامے میں ملبوس گوندنی کی طرح زیوروں سے لدی بڑے ٹھسے سے چلتی ہوئی آ کر وسط میں بیٹھ گئی اور بڑے دلفریب انداز میں اس نے جھک کر نیلمبر دت کو تسلیم کی، پھر اس نے شہانا میں آصف الدولہ کی غزل شروع کی:

بتوں کی گلی میں شب و روز آصف
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں
تماشا خدائی............

سامعین مسحور ہو کر اس کی آواز سنتے رہے۔ گوتم نیلمبر اس کی شکل دیکھنے میں محو تھا۔

کلکتے کا انگریزی داں برہمن کلرک لکھنؤ کے جادو میں گرفتار ہو گیا، دن گزرتے گئے ۔ بارشوں کی وجہ سے کلکتے تک کے راستے بند تھے۔ جنم اشٹمی کا تہوار آیا۔ بھادوں کا مہینہ آیا۔ اماوس کی راتیں جب چمپا اپنی صحنچی میں بیٹھ کر گوڑ ملہار گاتی۔ جب کنجوں میں کرشن کنہیا کے لیے جھولے ڈالے گئے۔ برج کے رہس دھاریوں نے کرشن لیلا کے سوانگ تیار کیے۔ چمپا رادھا بنی۔ کبھی چمپا کو گوتم نے ہز میجسٹی شاہ زمن غازی الدین حیدر کے دربار میں دیکھا جہاں وہ آواز کے شعبدے دکھائی تھی، اس نے چمپا کو جمعرات کے روز درگاہ حضرت عباس جاتے دیکھا۔ میلوں اور

باغوں میں دیکھا۔ گومتی پر بجرے میں تیرتے دیکھا، ہر طرف چمپا تھی۔

وہ شنیلا کا جو پیغام اس کے پاس لے کر آیا تھا کب کا بھول چکا تھا۔

اس رات جب وہ چمپا کے یہاں سے لوٹا آدھی رات کا گجر بج چکا تھا، نیچے سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ گانا ختم کرنے کے بعد چمپا نے حاضرین سے اجازت چاہی تھی اور کورنش بجالانے کے بعد اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی، چلتے چلتے رک کر اس نے نیلمبر سے کہا تھا: ''آپ ہی بنگالے سے آئے ہیں نا، پھر بھی آتے رہیے گا، ہم غریبوں کو بھول نہ جایئے گا۔'' اس کے بعد محفل برخاست ہوئی تھی۔ اب گلیوں میں سائے پھر رہے تھے۔ سارا شہر سوتا تھا۔ صرف چوک کے بالا خانوں کی روشنیاں جل رہی تھیں مگر اب وہ بھی ایک ایک کر کے بجھتی جا رہی تھیں۔ نواب کمن اور دوسرے معززین اپنے اپنے ہواداروں، تامجانوں، پالکیوں اور ربوچوں پر سوار ہو کر اپنی محل سراؤں کی طرف جا چکے تھے۔ سوتا ہوا شہر۔

اس سے گوتم نیلمبر حسب معمول جاگتا تھا، وہ تو اکثر اپنی راتیں جاگ کر گزارتا تھا۔ راج شاہی میں، جہاں اس کا جھونپڑا دھان کے کھیتوں میں تھا، وہ اپنی کوٹھڑی میں دیا جلا کر رات رات بھر بنگالی پڑھا کرتا تھا۔ بنارس میں رات گئے تک وہ لیمپ کی روشنی میں سنسکرت کا مطالعہ کرتا تو عجیب باتیں اس کے دماغ میں آتیں۔ مابعد الطبیعیات، یہ جانے کس زمانے کی باتیں تھیں اور کس قدر غیر ضروری مگر کالی داس اور بھرتری ہری اور راج شیکھر پڑھ کر وہ سوچ میں کھو جاتا، کیا کبھی ایسا زمانہ بھی تھا جب ہم نیٹو لوگ ایسے قابل ہوتے تھے۔ اسے یقین نہ آتا۔

کلکتے میں وہ رات رات بھر پڑھتا اور پھر کتابوں پر سر رکھ کر سو جاتا، آج پہلی

مرتبہ رات کو ورڈز ورتھ اور شیلے اور کالی داس کے متعلق سوچنے کے بجائے اس کے دماغ پر چمپا کے تصور نے اپنا تسلط جما لیا۔ اسے بڑا غصہ آیا، کوفت بھی ہوئی۔ عورتوں کے مسئلے پر اس نے بہت کم سوچا تھا۔ راج شاہی میں جب سترہ سال کی عمر میں اس کے ماں باپ اس کی شادی کر دینا چاہتے تھے وہ بنارس پہنچ گیا تھا۔ بنارس اور کلکتے کی طالب علمانہ زندگی میں ہزاروں مصروفیتیں تھیں۔ عاشقی کے لیے ابھی بہت وقت پڑا تھا، ابھی تو اسے بی۔اے کرنا تھا۔ بی۔اے کی ڈگری حاصل کرنا اس کا مقصد حیات تھا، پھر ممکن ہے وہ انگلستان بھی جا سکے۔

لکھنؤ کی اس ویشیا سے اس سے مطلب؟ وہ سر جھکائے سڑک پر آگے بڑھتا گیا حتیٰ کہ اس کے کہاروں نے اسے آواز دی: فینس ادھر ہے خداوند، وہ مڑا اور فینس پر سوار ہو کر اپنے جائے قیام کی طرف چل دیا۔ دوسرے روز سے بھادوں کے جھالے شروع ہو گئے۔ دن بھر وہ ریذیڈنسی کے دفتر میں بیٹھا رہتا، کبھی کاغذات لے کر آغا میر وزیر اعظم کے مکان پر جاتا، کئی بار وہ شاہی محل بھی گیا اور ہز میجسٹی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جو انگریز بادشاہوں کا لباس پہنے (جو گوتم نیلمبر نے ولیم چہارم کی تصویروں میں دیکھا تھا) مرصع کرسی پر بیٹھے تھے اور ریذیڈنٹ جھک کر بڑے ادب سے ان کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا، دن اسی طرح مصروفیات اور چہل پہل میں گزر جاتا، رات قیامت بن کر آتی۔

رات، جو چمپا کی راجدھانی تھی۔ اس رات میں گوتم نیلمبر دت کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس کی زندگی اور دنیا میں ویشیا کا خیال ہی کراہت انگیز تھا، پھر وہ سوچتا عورت جو دیبی ہے۔ لکشمی، گوری، اوما۔ جو ماں ہے اور بہن اور بی بی اور بیٹی۔

اسے طوائف نہیں ہونا چاہیے، یہ بڑی زیادتی ہے، پھر اسے خیال آیا کہا جاتا ہے عورت تو محض دکھ سہنے کے لیے ہی بنائی گئی ہے۔ اس میں عورت کی عظمت ہے جس کی ساری عمر مرد کی ٹہل کرنے میں بیت جاتی ہے اور پھر بھی مرد اس سے خوش نہیں ہوتے۔ پتی ورتا عورتیں، بال ودھوائیں۔ یتیم لڑکیاں جن کو ورثہ نہیں ملتا۔ عورت جو گائے کی طرح بے زبان ہے، جو ستی ہو کر جل مرتی ہے کہ اسی میں اس کی شان ہے مگر اس چمپا کو دیکھو جو خود جل کر مرنے کے بجائے دوسروں کو جلا جلا کر مارتی ہے۔

نا استری سوتنترم۔ منو مہاراج میں لکھا ہے۔ عورت آزاد نہیں ہے، بالکل صحیح تھا۔ رامائن کی چھٹی کتاب میں تو یہاں تک لکھا تھا کہ خطرے کے وقت، شادی کے موقعے پر اور عبادت کے سمے عورت باہر آ جائے تو قابل اعتراض نہیں اور یہ بھی لکھا تھا کہ عورت کے وید پڑھنے سے بڑا انتشار پھیل سکتا ہے۔

سنتے ہیں کہ کسی زمانے میں دیس کی عورتیں باکمال ہوتی تھیں، پڑھنا لکھنا جانتی تھیں۔ بے پردہ گھومتی تھیں اور جانے کیا کیا۔ اپنے گاؤں کی مسلمان عورتوں سے اس نے بھانومتی اور کنچن مالا اور کسم مالتی مالا اور رانی مینا متی کی جو روپ کتھائیں بچپن میں سنی تھیں ان سب میں بھی پرانے وقتوں کی عورتوں کی بڑائی کے قصے تھے، لیکن یہ سب گپ تھی۔ بھلا ہماری عورتیں جو اس قدر جاہل اور پس ماندہ ہیں کبھی بھی بہتر حالت میں رہی ہوں گی، یہ عقل میں نہیں آتا۔ نا استری سوتنترم۔

شہنشاہی اور جاگیردارانہ سماج میں عورت کو آزادی محض اسی وقت میسر ہوتی ہے جب وہ بازار میں آ کر بیٹھ جائے تب اس کو عزت بھی ملتی ہے دولت بھی، پھر

اس کے لیے شعروشاعری کرنا بھی جائز ہے لکھناپڑھنا بھی۔ ورنہ علیحدہ سے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ چمپا بائی اسی نظام کی پروردہ تھی اور گوتم اس حیثیت کو سمجھنے سے قاصر تھا کیونکہ وہ خود ان نئے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا جس نے ابھی ابھی جنم لیا تھا اور جاگیردارانہ ڈھانچے سے ہٹ کر اپنی اقدار الگ بنا رہا تھا اور متوسط طبقہ بڑی شدت سے اخلاق پرست ہوتا ہے۔

منشی ہری شنکر کے ساتھ وہ ایک روز کشتی میں ندی پار کر کے مینڈھوں کی لڑائی دیکھنے رمنا جا رہا تھا کہ معاً اس کی نظر سامنے پڑی، ایک سنہرا بجرا آہستہ آہستہ تیرتا ہوا جا رہا تھا۔

''دہائی ہے کمپنی بہادر کی!'' اس کی کانوں میں ایک نقرئی آواز آئی، اس نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ چمپا کی آواز تھی جو دوسرے بجرے میں بیٹھی تھی۔ نیلمبر کو گھبرا کر اپنی طرف دیکھتے ہوئے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اگر وہ اہل لکھنؤ کی صحبت میں ذرا زیادہ رہ لیا ہوتا تو جواباً کہتا کہ حضور یہ فقرے ہم پر تیز کرتی ہیں، مگر وہ بالکل ہڑبڑا گیا۔ سامنے سے آغا میر کا بجرا آ رہا تھا۔ چند اور مرصع اور منقش کشتیوں میں امراء وزراء، صاحبان عالیشان، یعنی انگریز اور شہر کی نامی طوائفیں رمنا جا رہی تھیں۔ دریا پر مچھلی اور گھوڑے کی شکلوں کے بجروں کا میلہ سا لگا تھا۔ اتنے میں چمپا کی کشتی قریب آ گئی۔

''ہماری کشتی میں آ جایئے۔'' اس نے کہا۔

''تاکہ آپ ان کو بھی لے ڈوبیے۔'' ہری شنکر نے جواب دیا، اس کے بعد دونوں میں ضلع جگت شروع ہو گیا، ہنستے بولتے یہ سب گھاٹ پر پہنچے۔ بارہ دری کی

طرف جاتے ہوئے ہمت کر کے گوتم نیلمبر نے طے کر ڈالا کہ جو فرض اسے شنیلا دیبی نے سونپا تھا اسے ادا کر کے کم از کم اپنے ضمیر کو ہلکا کر لے۔ جس وقت چمپا پائنچے اٹھا کر سیڑھیاں چڑھ رہی تھی گوتم نیلمبر نے اس سے پوچھا:

''تم سرل صاحب کو جانتی ہو۔''

وہ چپ رہی۔

''چمپا بائی جی میں نے تم سے جو سوال کیا ہے اس کا جواب دو۔''

''اچھا جانتے ہیں، پھر تم سے کیا۔''

''ان کی بی بی ہے، کلکتے میں۔'' اسے توقع تھی کہ یہ سن کر چمپا کا رنگ فق ہو جائے گا، عرق ست اس کی پیشانی پر چمکنے لگے گا مگر وہ اطمینان سے بولی: ''اچھا تو پھر۔ جتنے لوگ ہم سے ملتے ہیں سب کی بیبیاں ہوتی ہیں۔''

''ان کی ایک لڑکی بھی ہے۔'' نیلمبر نے اور زیادہ اہمیت کے ساتھ کہا۔

''سب کی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں، تم اپنا مقصد بیان کرو۔''

''تم سرل صاحب سے قطع تعلق کر لو، یعنی اب کے سے جب سرل صاحب یہاں آئیں تو ان سے نہ ملنا، وہ ریذیڈنٹ بن کر یہاں آنے والے ہیں اگلے مہینے۔''

چمپا ٹھٹھک گئی اور ایک لمحے کے لیے اس بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ ''آپ عجیب ہونق انسان ہیں۔ حضرت یہ کہئے کہ اب آپ کی ہم پر طبیعت آئی ہے!''

نیلمبر کو چکر سا آ گیا۔ حد ہو گئی بیہودگی کی، اس کا جی چاہا وہیں سے الٹے پاؤں واپس چلا جائے مگر اب لڑائی شروع ہونے والی تھی۔ خلقت جمع ہو چکی تھی۔ بادشاہ

سلامت اور اہل دربار اپنی کرسیوں پر فروکش ہو رہے تھے۔ بینڈ بجنا شروع ہو گیا تھا، وہ جا کر ایک طرف کو چپکا کھڑا ہو گیا۔

واپسی میں اسے نواب کمن اور ریذیڈنٹ کے ساتھ ساتھ تک گھاٹ آنا پڑا۔ بجرے میں چمپا کا ساتھ ہو گیا۔ اس کشتی میں اور کوئی نہ تھا، وہ اسے بڑی محبت کی نظروں سے دیکھتی رہی۔ ''سنو جی'' اس نے دفعتاً کہا۔ ''ہم سرل صاحب کو ہزار دفعہ چھوڑ دیں گے، مگر تم ہم کو چھوڑ کر مت جاؤ۔ تم ہمیں بہت زیادہ بھا گئے ہو۔''

وہ خاموش رہا۔

چمپا کی رنگت سرخ ہو گئی۔ ''تم نے سنا۔ ہم۔ چمپا جس پر ایک عالم جان دیتا ہے خود بے حیا بن کر تم سے یہ کہہ رہے ہیں، مغرور آدمی۔''

وہ اسی طرح خاموش رہا۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں اس کی آنکھوں میں تیزی سے جھلملانے لگیں، اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بجرا اب چھتر منزل کے پاس پہنچ چکا تھا۔

''ہم نے آج تک کسی سے یہ نہیں کہا، بدبخت مغرور آدمی۔ اپنے آپ پر زیادہ نازاں نہ ہونا، یہ وقت بہت جلد گزر جائے گا'' کشتی گھاٹ تک پہنچ گئی۔

گوتم نیلمبر نے آنکھیں کھول لیں، وہ اسے تیوری پر بل ڈالے غور سے دیکھ رہی تھی، پھر وہ ہنس پڑی۔ ''ہونق آدمی۔'' اس نے پیار سے کہا۔ ''بات کرنے کی تم کو تمیز نہیں اور تم پر ہم عاشق ہوئے ہیں، یہ قدرت کا تماشا دیکھو!'' نیلمبر چپ چاپ بجرے پر سے اترا۔ چمپا نے اپنی سکھ پال کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے یہاں آؤ گے نا؟ از برائے خدا ضرور آنا۔ میاں نیلمبر صاحب۔ تم کو کیا

کہہ کر پکاروں؟ پنڈت جی مہاراج۔ورنہ پانڈے جی پچھتائیں گے۔دال چنے کی کھائیں گے۔"

نیلمبر دوسری طرف دیکھ رہا تھا، وہ اپنی اور ہری شنکر کی پالکی اور کہاروں کو ڈھونڈنے میں مصروف تھا۔

"ہم سے ملوگے نا؟"

"نہیں" نیلمبر نے مختصر سے جواب دیا اور جلدی سے جا کر اپنی پالکی میں بیٹھ گیا۔

اس کے بعد وہ تین دن تک نہیں سو سکا، اس دوران میں اس کے پاس چمپا کے متعدد پیغام آئے۔اس قدر اچانک اس عورت نے یہ کیسا ناٹک کھیلا تھا، مگر عورت کے چرتر آج تک کون سمجھ پایا ہے۔یہ لڑکی، بڑے بڑے دھنوان اور سورما جس کے ناز اٹھاتے تھے، اسے میری کون سی ادا بھا گئی۔منشی ہری شنکر نے فائلوں پر سے سر اٹھا کر اس سے کہا: "بھائی نیلمبر۔ہمارے کاشی کے کبیر داس کہہ گئے ہیں۔

چھوٹی موٹی کامنی سب ہیں بِس کی بیل
بیری مارے داؤں سے یہ ماریں ہنس کھیل

مگر تم اس کے یہاں چلے کیوں نہیں جاتے، اس میں کیا حرج ہے؟"

نیلمبر اودھ کے اس لالہ بھائی کو نہ سمجھا پایا کہ چمپا کے یہاں جانے میں کیا حرج ہے۔

"بھگوان نے ناری ہمارا جی بہلانے کے لیے تو بنائی ہے۔" ہری شنکر نے پھر کہا۔نیلمبر نے حیرت سے اسے دیکھا۔"ناری تو بڑی مقدس چیز ہے، اسے تم دل کا

بہلاوا سمجھتے ہو۔'' اس نے کہا۔

''ارے میاں'' ہری شنکر نے حقے کا کش لگا کر ہنس کے جواب دیا، ''ہم نے اس کوچے میں بڑے بڑے جٹا دھاری برہمن چکر لگاتے دیکھے ہیں، تم کس کھیت کی مولی ہو۔''

نیلمبر اٹھ کر باہر آ گیا اور ریذیڈنسی کے باغ میں بلا مقصد ٹہلنے لگا۔ مالی مولری کی چھاؤں میں چلم پیتے تھے اور رشا گردپیشے میں کہاروں کی محفل میں کٹورا چل رہا تھا۔ گارڈ ہاؤس کے برآمدے میں منڈیاون چھاؤنی سے آئے ہوئے دو گورے شراب کے نشے میں دھت ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے، اتنے میں اسے ٹیلے کی ڈھلان پر زرد رنگ کا دوپٹہ اوڑھے جمنامہری اوپر چڑھتی نظر آئی۔ جمنامہری جو چمپا کی پیغامبر تھی، وہ خاموشی سے پھر اندر چلا گیا۔

کوار کا مہینہ لگ چکا تھا اور الہ آباد میں جہاز کلکتے جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ کاغذات کا پلندہ سنبھال کر وہ واپس لوٹنے کے لیے تیار ہوا۔

جب وہ ناکے کی طرف جا رہا تھا، یکایک اس نے گاڑی بان سے پوچھا: ''یہ سڑک کس طرف جاتی ہے۔''

''نخاس۔۔۔خداوند۔۔۔''

''ادھر گاڑی موڑ لو۔''

''بہت خوب۔۔۔خداوند۔''

شکرم چمپا کے مکان کے سامنے جا کر ٹھہر گئی، وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا اوپر گیا۔ چمپا صحنچی میں بیٹھی تھی۔ نیلمبر کی آواز سن کر اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔

''تم آ گئے۔''

''نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔''

''دو گھڑی رک جاؤ، دودھ کھاؤ گے، شربت منگوا دوں؟'' اس کا تامل دیکھ کر اس نے کہا۔ ''برہمن کی دکان سے جل پان منگوا دوں؟''

''مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

''مجھے معلوم ہے تمہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

''میں۔ میں صرف تم کو خدا حافظ کہنے آیا تھا۔''

''خدا حافظ۔''

وہ دروازے میں ٹھٹکا رہا۔

''ہمارے شہر کا دستور ہے دعا دیتے وقت کہتے ہیں: سوا غم حسینؓ کے خدا کوئی غم نہ دے، یہ دعا میں تم کو نہیں دے سکتی۔ تم حسینؓ کا غم بھی نہیں جانتے، تم تو جانتے ہی نہیں غم کہتے کسے ہیں۔''

''سنو، چمپا۔'' نیلمبر نے دھیرے سے کہا۔ ''تمہاری زندگی اتنی رنگین ہے، بہت جلد تم مجھے بھول جاؤ گی، کس چکر میں پڑ گئیں۔ میرا اور تمہارا کیا ساتھ ہے۔''

''ہاں میرا اور تمہارا کیا ساتھ ہے بھلا، تم نے آج تک مجھے اپنا ہاتھ بھی نہیں چھونے دیا۔ ہمارے یہاں کے ہندو تو اتنی چھوت چھات نہیں کرتے۔''

''سنو۔'' اس نے چمپا کو پھر سمجھانے کی سعی کی۔ ''تم کو میں اس لیے پسند ہوں کہ ان سب لوگوں سے مختلف ہوں جو تمہارے ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ انوکھی چیز ہر ایک کو بھاتی ہے۔''

''کیا تمہارے دیس میں لڑکیاں نہیں ہوتیں۔'' اس نے سادگی سے سوال کیا۔

نیلمبر کو ہنسی آ گئی ''ہوتی کیوں نہیں مگر تمہاری جیسی نہیں، اچھا اب میں چلتا ہوں۔''

''اللہ۔ کس قدر طنطنہ ہے، معلوم ہوتا ہے راجہ جھاؤ لال کے جانشین آپ ہی ہیں۔'' چمپا نے ہنسنے کی کوشش کی۔

اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا۔ شہر میں چاروں طرف مشعلیں جلائی گئیں۔ فانوس جگمگائے، قندیلیں جلیں، نیچے سڑک پر سے ایک بارات گزر رہی تھی۔ تخت رواں پر ناچ ہوتا جا رہا تھا۔ ماہی مراتب کی قطار میں لڑکے بالے اور شہدے اچھلتے کودتے چل رہے تھے، دوسرے تخت رواں پر سوانگ اور کرتب ہو رہے تھے۔ روشن چوکی بج رہی تھی۔ مشعلوں کی روشنی بالا خانے کی کھڑکیوں پر آ کر پڑی، اس روشنی میں چمپا کا کامدانی کا دوپٹہ جھک جھک کرنے لگا۔ نیچے ڈومنیاں سوہا گاتی جا رہی تھیں۔ چمپا کھڑکی میں آ کر بارات دیکھنے لگی۔ ''جانے کس سبھاگن کی بارات ہے۔'' اس نے کہا، نیلمبر نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''اس کی مانگ میں سیندور ہوگا، پیروں میں مہندی، ناک میں سہاگ کی نتھ۔'' اس نے آہستہ سے اپنی مانگ کو چھوا جس میں افشاں چنی تھی لیکن جو سیندور سے عاری تھی، اب یہ پھر ناٹک کھیل رہی ہے۔ گوتم نیلمبر نے پریشان ہو کر سوچا۔

''آدمی اس قدر کٹھور ہوتا ہے۔'' چمپا نے کہا۔

''ہمیشہ سے عورت اور مرد ایک دوسرے پر یہ الزام رکھتے آئے ہیں، یہ تکرار

بھی فضول ہے۔"

"تم ابھی جا رہے ہو۔"

"ہاں۔"

"صبح ہوتے ہوتے لکھنؤ سے بہت دور نکل چکے ہوگے۔"

"ہاں۔"

"یہ دوہا سنا ہے

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کرو کی بھور کبھی نہ ہوئے"

نیلمبر کھڑکی میں سے نیچے دیکھنے لگا۔ شہر کا شہر کسی میلے کے لیے ایک سمت کو رواں تھا۔ گلیوں میں سنڈے مونچھوں پر تاؤ دیتے اکڑتے پھر رہے تھے۔ قلماقنیاں، حبشنیں، ہڑونگیاں، چونے والیاں، قصباتی پاتریں چھن چھن کرتی ٹولیاں بنائے باغ کی طرف جا رہی تھیں۔ بانکے اپنی تلواریں چمکار رہے تھے۔ مدکیے، چرسے، بھنگڑ یے چنڈو خانوں میں جمع تھے۔ چوطرفہ غل مچا تھا۔ دنیا کس قدر رنگا رنگ جگہ تھی، اسی دنیا کو بھرتری ہری نے رنگ بھوم کہا تھا۔

اس رنگ بھوم پر ایک بے معنی ناٹک یہ بھی کھیلا جا رہا تھا، اندھیرا چھانے لگا۔ اس کی شکرم نیچے منتظر کھڑی تھی۔

بھاگو میاں، بھاگو یہاں سے جلدی۔ کلکتے کا راستہ کھوٹا ہوتا ہے۔ کلکتے چلو۔ تمہارا ٹھکانہ وہیں ہے میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔

پھر وہ جلدی سے اپنا کاغذات کا بقچہ سنبھال کر تیزی سے زینے سے اترا، اس

نے ایک بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا اور سیدھا شکرم میں پہنچ کر دم لیا۔

گاڑی کے پہیوں نے سڑک کے پختہ فرش پر شور مچانا شروع کیا۔ بارات کا ہنگامہ ابھی باقی تھا۔

بھیڑ میں سے نکلتی شکرم آغا میر کی ڈیوڑھی تک پہنچ گئی۔ نوعمر کوچبان، بیٹے گا مہربان، ذرا بچ کے قبلہ، کی ہانک لگاتا شہر کے باہر نکل آیا۔ اب وہ حضرت گنج کی مانوس سڑک پر سے گزر رہے تھے جس کے دونوں طرف اونچی گوتھک وضع کی انگریزی عمارتوں میں کنول جلتے تھے۔ سڑک پر سواری کی گاڑیاں اور گھوڑے اور ہاتھی اور پالکیاں گزر رہی تھیں۔

یہ راستہ نسبتاً سنسان تھا، وہ ناکے پر پہنچ گئے۔ جامن کے نیچے چند بیراگی بیٹھے تھے جنہوں نے پراسرار آنکھوں سے نیلمبر کو دیکھا، ان میں سے ایک وہی تھا جسے نیلمبر نے پہلے روز تاکا تھا۔ اب بھوانی کے مٹھ کے سامنے عود سلگ رہا تھا۔ گاڑی سے اتر کر وہ دو قدم آگے بڑھا اور اس نے مورتی کو غور سے دیکھا۔ ماتا کو وہ کالی کے روپ میں جانتا تھا، اب وہ شکرگزار ہوا کہ ماتا نے اسے اپنے جوگ مایا (جوگ مایا درگاہ کا ایک روپ Goddess of illusion) کے روپ کے بھی درشن کرا دیے۔ ماں، میں نے تمہاری یہ لیلا بھی دیکھ لی، اب واپس جاتا ہوں۔ اپنی شکتی سے اسی طرح میری حفاظت کرتی رہنا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکائے ہوئے آہستہ سے کہا۔

ایک جوگی، جس نے پہلے روز اس سے بات کی تھی، اس سے گویا ہوا: ''بڑی جلدی واپس جاتے ہو۔''

''سراب کے ساحل پر تاخیر کرنا عقلمندی نہیں، یہ تمہارا شہر سراب کا شہر ہے۔''
نیلمبر نے لکھنؤ کی روشنیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ دور مچھی بھون میں چوتھے پہر کا گجر بجا۔ بیراگی نے اسے دھیان سے دیکھا: ''سراب کی حقیقت اتنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آجاتی بچہ۔''

''بابا۔'' نیلمبر نے رک کر کہا، ''جو لوگ مایا نے اپنے دسوں ہاتھوں سے مجھے اپنی اور کھینچنا چاہا، لیکن دیکھو میں صحیح و سالم واپس لوٹ رہا ہوں۔''

''ہم میں سے کوئی صحیح و سالم نہیں ہے، ہم سب کمہار کے کھلونے ہیں اور ہر سے ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ اپنی مضبوطی پر نازاں نہ ہونا۔'' پھر اس نے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر اسے سونگھا۔

''دیکھو، اس میں کتنی خوشبو ہے، اس مٹی کو لے جاؤ۔ کٹک میں جوگ مایا کا مندر ہے، اس میں چڑھا دینا۔''

نیلمبر نے ہاتھ بڑھا کر مٹی لینے میں پس وپیش کیا، یہ گورکھ ناتھ کا جوگی پھر اپنے گورکھ دھندے دکھا رہا تھا۔

''لے لو۔۔۔ یہ لکھنؤ کی مٹی ہے، اسے اپنے ساتھ لے جاؤ کیونکہ اس شہر کا جادو یہ ہے کہ چھٹ جائے تو بے طرح یاد آتا ہے۔''

جوگی بڑی شستہ زبان بول رہا تھا۔

''بابا۔۔تم بیراگی کیوں بن گئے۔'' نیلمبر نے پوچھا۔

''تم۔۔۔تم مجھے جانتے ہو۔۔؟'' جوگی نے ذرا گھبرا کر پوچھا۔

''نہیں۔۔۔ میں تو کسی کو بھی نہیں جانتا۔''

''ہاں، جاننا بہت مشکل ہے، اور جاننے والے کو کون جان گا۔'' جوگی نے کہا اور آنکھیں بند کرلیں۔

نیلمبر نے اپنشد میں یہ جملہ پڑھا تھا۔ بیراگی بہت پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ نیلمبر کے جذبہ تجسس میں اضافہ ہو گیا۔

''بابا۔۔۔ میں پوچھ سکتا ہوں تم کون ہو؟''

''کیوں۔ کیا تمہارا بھی اس راہ پر چلنے کا ارادہ ہے۔''

''ارے۔۔۔ نہیں تو۔۔''

''کیوں جی۔۔ فرنگی کی جاسوسی کرتے ہو؟''

نیلمبر کے دل پر یہ بات موگری کی طرح جا کر پڑی۔ جوگی کے لہجے میں اتھاہ حقارت تھی۔

''میں۔ میں فرنگی کی جاسوسی نہیں کرتا۔'' اس نے آزردہ لہجے میں کہا۔

''سچ کہتے ہو؟'' جوگی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''ہاں۔ بالکل سچ۔''

''اچھا تو سنو، میں راجہ بینی بہادر کا بیٹا ہوں۔ راجہ بینی بہادر کا نام سنا ہے؟ وہ مرزا جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ کے نائب السلطنت تھے جو جناب عالی (نواب اودھ) اور عالیجاہ (نواب بنگال) کے ساتھ جی توڑ کر تمہارے صاحبان عالی شان کی فوج سے لڑے تھے۔ گنگا کے کنارے ایک طرف میرا بہادر باپ اور بنارس کا راجہ بلونت سنگھ اور گوسائیں ہمت بہادر اور روہیلے تھے۔ دوسری طرف فرنگیوں کا لشکر۔۔۔ گوسائیں ہمت بہادر کے ناگے جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑ رہے

تھے۔ دنادن سمرو کی توپ چلتی تھی مگر فرنگیوں نے میرے باپ کی فوج پر اچانک حملہ کر دیا۔ گولیوں کی باڑھ اور تلنگوں کی یورش میں ہمارے لشکر کے قدم اکھڑ گئے۔ میرا باپ گھوڑے پر سوار ایک ایک کو پکارتا پھرا، ارے کم بختو کدھر بھاگ رہے ہو۔ جناب عالی نے للکار للکار کر سراسیمگی سے کہا، تم مغل کہلاتے ہو اور میدان چھوڑ کر بھاگتے ہو۔۔۔ مگر ہماری فوج۔۔ درگاوتی ندی پار کر کے بھاگ کھڑی ہوئی۔ ہزاروں ندی میں ڈوب گئے۔۔ ہندوستان پر قیامت گزر گئی۔۔۔" وہ ذرا کی ذرا دم لینے کے لیے رکا، جوش کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، پھر یہ سرخی اداسی میں تبدیل ہوگئی۔ اس نے آہستہ سے کہا: "تمہاری فرنگی سرکار نے اسی وقت دیکھ لیا کہ اس قوم میں اتفاق جاتا رہا۔ عالیجاہ اور جناب عالی ہی میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔ فرنگیوں نے دیکھا کہ یہ سب لوگ دوسرے کی چغلی کھاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف شقے لکھ کر ایک طرف بادشاہ عالی گہر کو دلی بھیجتے ہیں دوسری طرف کلکتے سے شرائط کرنے پر آمادہ ہیں، یہ کیسا ذلیل ملک ہے۔ ان سب کا ایک دوسرے سے اعتبار اٹھ گیا ہے، میرا باپ جناب عالی کا سب سے زیادہ نمک حلال اور وفادار ملازم تھا، دشمنوں کے بہکائے میں آ کر جناب عالی نے اس کو نمک حرام تصور فرمایا اور اس کی سزا کے درپے ہوئے۔"

"ارے۔۔۔" نیلمبر کے منہ سے نکلا۔

"جناب عالی نے منڈیاون چھاؤنی میں میرے باپ کے خیمے میں قیام فرمایا اور کھانے کے بعد میرے بابا سے کہا: "راجہ تم بھی اس وقت شکار کو چلو۔" انہوں نے عرض کی۔ "غلام نے بدولت حضور بہت سے شکار دیکھے ہیں۔" فرمایا:

''آج کا شکار بہت عجیب وغریب ہے۔ ایسا کبھی نہ دیکھا ہوگا، جو دم ہے غنیمت ہے۔'' وہ بابا کو اپنی خواص میں بٹھا کر اپنے لشکر کی طرف چلے، بابا سمجھ گئے کہ یہ میرا دامِ گرفتاری ہے مگر کیا کر سکتے تھے۔ حکم حاکم مقدم تھا۔ عالی جناب کے حکم سے بابا کی دونوں آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھیر دی گئیں۔ ان کا علاقہ ضبطِ سرکار ہوا۔ تیرہ سو گھوڑوں، اٹھارہ ہاتھی اور پورے توپ خانے کے علاوہ ایک وسیع زمینداری کے میرے بابا مالک تھے، میں صرف اس مرگ چھالا کا مالک ہوں۔''

جوگی خاموش ہوگیا۔۔۔

نیلمبر مبہوت بیٹھا قصہ سنتا رہا۔ جوگی نے آگ میں ایک لکڑ اور ڈال دیا اور اکڑوں بیٹھ کر کہنے لگا: ''سراب کی حقیقت تو میں نے جانی ہے، تم اس کی حقیقت کو کیا جانو! تم اسی چکر میں شامل ہو اور رہو گے۔۔ مجھے سلطنتوں کے بننے اور بگڑنے، کمپنی کی خوشی اور ناخوشی، بادشاہ کے عتاب، کسی چیز کی پرواہ نہیں۔۔ میرے بابا کو اندھا کر دیا گیا تھا۔ مجھے اندھا کون کر سکتا ہے، سوائے میرے خود کے۔ جاؤ۔ اب تم کو دیر ہوتی ہے۔ کٹک میں جب جوگ مایا کے مندر میں جاؤ تو دیکھنا کہ اس کے چاروں طرف برآمدے ہیں اور ان گنت دروازے اور ایک دروازے کے بعد دوسرا دروازہ کھلتا ہے اس کے بعد تیسرا۔ اس طرح کی بھول بھلیاں اور غلام گردشیں چاروں طرف بنی ہیں جن سے انسان نکل نہیں سکتا، تم سمجھتے ہو کہ تم اس بھول بھلیاں سے نکل آئے ہو، مگر تم غلطی پر ہو۔۔۔ جاؤ۔۔۔''

نیلمبر اٹھا، جھک کر اس نے جوگی کے قدموں کے پاس سے مٹی اٹھائی اور بھاری بھاری قدم رکھتا شکرم میں آن بیٹھا۔ گاڑی بان نے باگیں سیتاپور جانے والی

سڑک کی طرف موڑلیں۔

معاً پل کے نزدیک شکرم رک گئی۔ گاڑی بان نیچے اترا، سامنے ایک انگریز فوجی گھوڑے سے اتر کر ایک راہ گیر کو کوڑے لگا رہا تھا اور انگریزی میں گالیاں دیتا جاتا تھا۔

یہ منڈیاون چھاؤنی تھی۔ چاروں طرف انگریزوں کی کوٹھیاں تھیں اور فوج کا میس اور گرجا اور فوجی ہسپتال۔

گورا راہ گیر کو اچھی طرح پیٹنے کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

''سالے۔۔ ہمارا ہی کھاتے ہیں ہم ہی پر غراتے ہیں۔'' گاڑی بان نے، جس کا نام گنگا دین تھا، غصے سے کہا۔ ''شاہ جمن کے وقت میں یہ اندھیرا۔'' وہ بڑبڑاتا رہا۔ گوتم نیلمبر پھر اپنے خیالات میں کھو گیا۔ رات گئے وہ راجہ ٹکیٹ رائے کی بنوائی ہوئی ایک دھرم شالہ میں اترے۔ گنگا دین اب تک بڑبڑا رہا تھا۔ ریذیڈنسی کے سپاہی اور ہرکاروں کو دیکھ کر، جو نیلمبر کے ساتھ شکرم سے اترے تھے، دھرم شالہ میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ بنگالی بابو ہیں۔ کلکتے جا رہے ہیں، انگریزی جانت ہیں، ان سے پوچھو ہمری مال گجاری میں کمپنی بہادر کب کمی کرے گی۔ سنا ہے نئے قانون لندھن میں بنے ہیں، یہاں بھی لاگو ہوں گے۔ ان بے چارے کو کیا معلوم، کیوں نہیں بنگال اور اودھ میں ایکئے قانون لاگو ہوت ہیں۔ اے بابو صاحب۔۔ مال گجاری میں کمی کروائیے، ہمری تو کمریں ٹوٹ گئیں۔ آنگن کے پختہ فرش پر نیلمبر کے چاروں اور مجمع لگ گیا، یہ سب آس پاس کے

دیہات کے کسان تھے جو اپنے اپنے مقدمے اور فریادیں لے کر دارالسلطنت جا رہے تھے۔ ایک بوڑھا پھونس قصباتی زمیندار لاٹھی ٹیکتا نیلمبر کے قریب آن کر بیٹھ گیا۔ ''کون جات ہو؟'' اس نے چراغ کی روشنی میں نیلمبر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''برہمن۔''

بوڑھے نے نیلمبر کے پاؤں چھوئے۔ ''ٹھاکر میرے گاؤں چلے چلو تو تمری سیوا کروں، میرا مکان ہیاں سے کوس بھر ہے۔''

''مجھے صبح سویرے ہی سفر پر روانہ ہونا ہے۔ بابا سیوا تو مجھے تمہاری کرنی چاہیے، میرے لائق کوئی خدمت بتاؤ۔'' نیلمبر نے کہا، اس کا دل بھر آیا، یہ لوگ سب کے سب کتنے معصوم بھولے تھے۔ اسے دکھ ہوا کہ وہ اودھ پوری چھوڑ کر جا رہا ہے۔

''ٹھاکر۔'' بوڑھے نے چاروں طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ ''اپنی انگریجی سرکار سے کہو ہم پر زیادہ جلم نہ توڑے۔''

وہ خاموش ہو گیا۔

''لکھنؤ سے آتے ہو نا۔؟''

''ہاں۔''

''ہواں ہمرے بادشاہ کے درشن کیے؟''

''ہاں۔''

''ہمرے بادشاہ کو کمپنی بہادر نے روپے کے لیے تنگ کر رکھا ہے۔''

''پتا نہیں۔''

''ٹھاکر۔۔۔تم کو معلوم ہے۔'' اب بوڑھے نے زیادہ جوش سے بولنا شروع کیا۔ ''کمپنی بہادر نے وچن ہمارے بادشاہوں کو دیے اور ایک ایک کر کے سب کو توڑا۔۔۔تم کو معلوم ہے بکسر کی ہار کے بعد جناب عالی سے۔''

اے لیجئے۔ یہ پھر بکسر اور جناب عالی کا قصہ شروع ہو گیا، بوڑھے نے نیلمبر کو لحظہ بھر کے لیے دیکھا۔

''تم کو ان قصوں سے دلچسپی نہیں ہو گی لیکن یہ گھاؤ ہمرے دلوں پر لگے ہیں اور یہ گھاؤ تازہ ہیں، ہمرا دیس کمپنی بہادر نے تاراج کر کے رکھ دیا ہے۔تم کو معلوم ہے بکسر کی ہار کے بعد جناب عالی سے انگریزوں نے لکھا پڑھی کی تھی کہ وہ پینتیس ہجار سے زیادہ فوج نہیں رکھیں گے، اب منڈیاؤں میں عالم دیکھو۔ آصف الدولہ بیکنٹھ باشی کلکتے لکھا: انگریزی فوج سارے ملک کی آمدنی کھا گئی۔ گھر کے آدمیوں کو کھانے کو نہیں بچتا۔ کھیت اجڑ گئے۔ فرنگی افسر خود کو ملک کا مالک سمجھتے ہیں۔کب تک میرے گلے پر یہ چھری رہے گی؟ کل اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ہم غریب سے غریب تر ہوتے چلے گئے۔۔ٹھاکر ہم بہت دکھی لوگ ہیں۔ جب منرو نے حملہ کیا ہمرے سپاہی یا حسین، یا حسین کہہ کر روتے جاتے تھے اور لڑتے تھے۔ اس طرح ہم نے فرنگیوں سے جنگ کی، مگر اس کا کچھ فائدہ نہیں، مقابلے کا کوئی فائدہ نہیں، پر اب ہمارے پاس کمپنی کے خزانے میں دینے کے لیے اور کچھ باقی نہیں رہ گیا۔'' وہ خاموش ہو گیا۔ نیلمبر چپ چاپ بیٹھا چراغ کی لو دیکھتا رہا۔ دوسرے حلقے میں چند کسان بیٹھے نواب سعادت علی خاں مرحوم کی خوش انتظامی کا تذکرہ کر رہے تھے جنہوں نے اپنے دور حکومت میں ملک کی بگڑی بنا دی تھی، مگر شاہ زمن

بچارے اب کیا کر سکتے ہیں۔ اس کے بس میں کچھ نہیں۔'' ۔۔۔وہ کہہ رہے تھے۔

چراغ کی لو ہوا میں جھلملایا کی۔ نیلمبر دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ چاندنی رات تھی۔ منڈیر پر بیٹھے چند نوجوانوں نے برہا گانا شروع کر دیا۔

نیلمبر نے دیکھا کہ اس ملک کا بچہ بچہ، بوڑھا جوان، ہندو مسلمان اپنے بادشاہ پر جان چھڑکتا تھا۔ جوگی، جس نے اپنے باپ بنی بہادر کا قصہ اسے سنایا، اسے بھی یہاں کے بادشاہ یا اس حکومت سے نفرت نہیں تھی، وہ تو غالباً شجاع الدولہ سے بھی خفا نہ تھا جس نے اس کے باپ کو اندھا کروایا۔ اس کا محض یہ خیال تھا کہ دنیا مایا جال ہے اور اس میں یہی کچھ ہوا کرتا ہے، دوسرے یہ کہ ملک خدا کا تھا اور حکم بادشاہ کا اور بادشاہ کی اطاعت سب کا دھرم تھا۔ یہ سب لوگ اپنے بادشاہوں پر عاشق تھے، ہر زبان پر آصف الدولہ اور سعادت علی خان کے قصے تھے۔ آصف جس نے اپنی سخاوت سے کہاروں کو پالکیوں پر سوار کرا دیا اور سعادت جس نے حسن انتظام سے ملک کے خالی خزانوں کو دوبارہ پر کر دیا اور یہ سب لوگ، اودھ کے یہ سارے باشندے، جن سے نیلمبر ملا، فرنگی سے شدید نفرت کرتے تھے۔

۳۲

کلکتے واپس پہنچ کر وہ پھر اپنی جانی بوجھی مانوس دنیا میں کھو گیا۔ دفتر، کتابیں، انگریزی اور بنگالی اخبار، لیکچر، وہ شنیلا سے ملنے دھرم تلہ گیا مگر وہاں پہنچ کر اسے

معلوم ہوا کہ وہ مرچکی ہے۔ برسات کے زمانے میں وہ پوجا کے لیے کالی گھاٹ جا رہی تھی، اسے سانپ نے کاٹا اور وہ مرگئی۔ سرل صاحب منفصل میں دورے پر گئے ہوئے تھے۔

نیلمبر نے اپنے برآمدے میں لوٹ کر سیتل پاٹی نکالی اور لیمپ جلا کر پھر ڈکشنری پر جھک گیا، مگر اب اس کا دل ملازمت میں نہیں لگ رہا تھا۔ مانک تلہ میں اس کے گھر سے ذرا فاصلے پر ایک بڑا خوبصورت گارڈن ہاؤس تھا۔۔۔ اس کے باغ میں لیچی کے درخت تھے اور یہاں بہت سے نوجوانوں کا مجمع لگتا تھا، اس جگہ پر رام موہن بابو رہتے تھے۔

ایک روز وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ رام موہن بابو کا لیکچر سننے گیا۔ مذہب کے متعلق اس کے ذہن میں جو الجھنیں تھیں ان میں اضافہ ہو گیا۔ اب وہ کالی گھاٹ نہ جاتا، گھر میں بیٹھا بیٹھا سوچا کرتا: کیا سیرام پور والے ٹھیک کہتے ہیں؟ کیا رام موہن بابو صحیح راستے پر ہیں؟ کون کہہ سکتا ہے کون صحیح ہے کون غلط۔ ان سوالات سے جھنجھلا کر اس نے طے کر لیا کہ جب تک وہ خود بہت اچھی طرح مطالعہ نہ کر لے خود کوئی فیصلہ نہیں کرے گا۔ کمپنی بہادر کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر وہ ہندو کالج میں داخل ہو گیا، اسی کالج میں شہر کے ایک رئیس پرنس دوارکاناتھ ٹیگور کا لڑکا دیوندر ناتھ بھی پڑھتا تھا، وہ دونوں کلاس کے بعد اکٹھے بیٹھ کر مغربی فلسفے پر تبادلہ خیالات کرتے۔ خدا اور روح کی کھوج لگاتے۔ دیوندر ناتھ میں ساری صوفیوں والی خاصیتیں تھیں جو نیلمبر کو بڑی دلچسپ معلوم ہوتیں۔ شام کو وہ رام موہن رائے کے گھر جا کر ان کی محفل میں شامل ہوتے اور عالموں فاضلوں کی

گفتگو سنتے یا موحدانہ بھجن گاتے یا نیلمبر دیوندر ناتھ سے حافظ کی غزلیں سنتا۔

جس سال نیلمبر دت نے بی۔اے کیا اسی سال سے وہ رام موہن رائے کے برہمو سماج کا بڑا جوشیلا اور سرگرم کارکن بن چکا تھا، جب ہی ایک روز اس نے اخبار میں پڑھا کہ سر سرل ہاورڈ ایشلے کا فالج گر جانے سے انتقال ہو گیا۔انتقال کے وقت ان کی میم صاحبہ، لیڈی ایشلے، جن سے انہوں نے صرف تین سال قبل شادی کی تھی مع اپنے دو سالہ لڑکے کے دارجلنگ گئی ہوئی تھیں۔

سرل کو بہار کے ایک اداس اور اجنبی ڈاک بنگلے میں موت آئی، وہ دورہ کر کے لوٹا تھا اور بوٹ اتار کر آرام کرسی پر لیٹا تھا۔اسی وقت ہرکارے نے اسے اس کی بدمزاج، مغرور اور خاصی بدصورت بیوی کا خط لا کر دیا تھا جس میں اس نے دارجلنگ کی سوسائٹی کی تازہ خبریں لکھی تھیں اور یہ لکھا تھا کہ ننھا سرل اب بہت شیطان ہو گیا ہے، آج اس نے ایک قلی کو اپنی ننھی سی چھڑی سے خوب پیٹا۔خط پڑھنے کے بعد سرل نے اخباروں کے پلندے کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا یکا یک اسے محسوس ہوا کہ وہ مرنے والا ہے، اس نے اپنے چوبدار کو آواز دینی چاہی مگر اس کی زبان میں لکنت آ چکی تھی۔دوسرے لمحے وہ ختم ہو گیا۔

کلکتے کے اخباروں میں اس کے متعلق مضمون لکھے گئے، اس کی سوانح عمری شائع ہوئی۔برطانیہ اور ہندوستان کی اس نے جو خدمات کی تھیں ان کا مفصل تذکرہ مضامین میں کیا گیا۔اپنی عمر کے چالیس سال اس نے بنگال میں گزارے تھے۔بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے اس کی یاد میں خاص جلسہ کیا۔کالجوں میں اس پر تقریریں ہوئیں، اس کے پندرہ دن بعد لوگ اس کو بھول گئے۔

لیڈی ایشلے، جو مدراس کے چیف جسٹس کی بہن تھی اور شراب بہت پیتی تھی، اپنے لڑکے سرل کو لے کر سارے سازوسامان کے ساتھ انگلستان چلی گئی۔ سر سرل مرتے وقت لاکھوں کروڑوں کا آدمی تھا، اس کا روپیہ سٹی میں بھی لگا تھا اور کلکتے میں بھی۔ بڑے ہو کر اس کے بیٹے سرل ایڈون ڈیرک ایشلے نے اپنے باپ کے کمائے ہوئے روپے سے زبردست کاروبار شروع کیا جس کی شاخیں جنوبی امریکہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سلطنت برطانیہ اب ساری دنیا پر چھا چکی تھی۔ برما میں ٹین کی کانیں تھیں، ملایا میں ربڑ کے جنگلات، چین میں افیم کی تجارت۔

ہندوستان ۱۸۵۷ء کے بعد اب باضابطہ طور پر وکٹوریہ کی ایمپائر میں شامل ہو چکا تھا، سارا مشرق اب مرحوم سر سرل ہاورڈ ایشلے کے بیٹے لارڈ سرل ڈیرک ایڈون ایشلے کا تھا۔

اختتام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حصہ اول

آگ کا دریا
جلد اول
قرۃ العین حیدر
KURF
جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم دانش
KURF: Karachi University Research Forum